

# ایک محبت اور سہی

”وہ نظام بدلنا چاہتے تھے، لیکن انہیں ہر قدم پر  
سماج کے اک نئے ”ان داتا“ کا سامنا تھا“

ہاشم ندیم

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور  
فون 7352332-7232336

**نوٹ:**

اس کتاب کے جملہ حقوق بحق مصنف (ہاشم ندیم) اور پبلشرز (علم و عرفان) محفوظ ہیں۔ ادارہ علم و عرفان نے اردو زبان اور ادب کی ترویج کیلئے اس کتاب کو [kitaabghar.com](http://kitaabghar.com) پر شائع کرنے کی خصوصی اجازت دی ہے، جس کے لئے ہم انکے بے حد منون ہیں۔

# کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

ایک محبت اور سکی

ہاشم ندیم

گل فراز احمد

علم و عرفان پبلشرز، لاہور

زاہدہ نوید پرنسپرزر، لاہور

منصور بٹ، شیر محمد طاہر

عاصم، انیس احمد

دسمبر 2010ء

= 500 روپے

<http://kitaabghar.com>

نام کتاب

مصنف

ناشر

طبع

پروف ریڈنگ

کپوزنگ

سن اشاعت

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

..... کے پڑے

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور

فون 7352332-7232336

ادارہ علم و عرفان پبلشرز کا مقصد اسی کتب کی اشاعت کرتا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کپوزنگ طباعت، صحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفات درست نہ ہوں تو از راہ کرم مطلع فرمادیں۔ انشاء اللہ الکلے ایئریشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (ناشر)

# باب 1 کتاب گھر کی پیشکش

کبھی بھی شام اس طرح ڈھلتی ہے جیسے وہ افق کے پانیں بلکہ قطرہ قطرہ کر کے ہمارے اندر آتی رہی ہو۔ سرمی جھارلوں سے ڈھکے گلابی بادل سورج ڈھلنے کے بہت دیر بعد بھی فلک پر دکتے رہتے ہیں۔ وہ بھی ایک ایسی ہی شام تھی۔ دلوں میں بھیگا سرمی اجالا بکھیرنے والی شام۔۔۔۔۔ فضا کو گلابی کر دینے والی شام۔۔۔۔۔

بارش کی بوندوں سے تازہ بھیگی ہوئی سڑک پر ”کیفے فراق“ کے اوہ جلے یا اوہ بھجے نیون سائیں کی زرد بیوں کا عکس و قلب و قلب سے ابھر رہا تھا۔ کبھی کبھی ”اصل“ سے ”عکس“ زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔ یا شاید انسان بھیش سے طے شدہ اجسام کی ترکیب و ترتیب بدلنے کا خواہش مندر ہا ہے۔ تبھی وہ حقیقت سے زیادہ سراپ کو نہارتا ہے۔ ”کیفے فراق“ جو بھی ”کیف فراق“ تھا، آج بھی ہمارے محلے کی بیرونی سڑک کے چورا ہے کے باہم کوئے پر اس لئے پئے عاشق کی طرح خاموش ایستادہ تھا جسے متوں پہلے سے اس حقیقت کا ادراک ہو چکا ہے کہ اب اس کا محبوب بھی واپس نہیں لوٹے گا۔۔۔۔۔ لیکن انتظار تو عاشق کی سرشت ہے، سمحبوب کی واپسی بھلا کب شرط عاشقی تھی۔۔۔۔۔

میں نے جب سے ہوش سنجالاتب سے کیفے فراق اور اس کے اکلوتے ”پروپرائز“ چھا فراق کو بعض اسی حالت میں پایا تھا، مہ و سال کی گردوں دونوں کی خشکی میں کچھ زیادہ بدلاو نہیں لاسکی تھی۔ کہتے ہیں جب چھا فراق نے اپنے آخری عشق میں ناکامی کے بعد شاعری اور عشق دونوں کو خیر آباد کہہ کر یہ ریشورنٹ کھولنے کی تھانی، تب اس کا نام انہوں نے اپنی طبعی حالت غیر اور اپنے شخص، دونوں کو کیجا کر کے ”کیف فراق“ رکھا تھا لیکن یہ ”لف جدائی“ زیادہ عرصہ ریستوران کے بورڈ کا ساتھ نہ دے سکا اور فترتہ رفتہ لوگ اسے ”کیفے فراق“ کے نام سے پکارنے لگے۔ ایک زمانے میں یہاں کی ہاف سیٹ چائے کا شہرہ دور تک تھا اور سر شام ہی کیفے کے باہر فٹ پاٹھ پر پڑی میزیں وفتری بابوؤں اور نچلے درمیانے طبقے کے سرکاری ملازمین سے بھر جاتی تھیں۔ ہماری کالوں جو خود بھی ایسے ہی نچلے درجے کے سرکاری ملازمین کی رہائش گاہ تھی اور بابو کالوں کے نام سے جانی جاتی تھی۔ دراصل اسی کیفے فراق کی شہرت کی مر ہوں ملت تھی، کیفے سے ذرا آگے چند قدم دور سڑک کے پار جو پرانا بس اسٹاپ تھا وہ بھی بابو کالوں شاپ یا فراق شاپ کہلاتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ نچپن میں ہم سب دوست اسکوں جاتے وقت صبح سوریے یا پھر شام کی چائے سے پہلے اپنی جیبوں میں سکے چھکاتے فراق چھا کے ہوٹل آدمکتے اور شیشے کے لمبے لمبے مرتبانوں میں شہر کی مشہور سبیئی بیکر کے بنے ہوئے کیک رس، بن شیر مال یا پھر ایرانی ”شیک“ بیل کی زرد اور سبز پیوں کو پھرولتے تو چھا سے خوب ڈانٹ پڑتی۔ کاؤنٹر کے ساتھ ہی پوکا آس کریم سے بھرا بڑا ساواڑ کو لمنا تھر ماں بھی رکھا رہتا تھا۔ جس دن ہمارے پاس سب دوستوں کے لئے علیحدہ پوکا آس کریم کی کون یا کپ خریدنے جتنے پیسے جمع ہو جاتے اس روز تو گویا ہماری عید ہو جاتی تھی، اور جب کبھی لکا سوڈا، سیون اپ یا اپیل سوڈا کی سختی بولیں ہماری دسترس میں آتیں تو ہم ان کے ڈھکن میں چھپے زم ریڈ کے گول اسٹکر نکال کر اپنی

جبیوں میں بھر لیتے۔ اس ڈھکن میں پیوست گول رہڑ کے اوپر ہمارے پسندیدہ کارٹونز مثلاً پوپ آئے، ڈو نلڈ ڈاک، اور دیگر کی تصاویر چھپی ہوتی تھیں۔ پھر سارا سال ان رہڑ کی گول مہروں کی میشی مہک سے ہمارے اسکول کی کتابوں اور کاپیوں میں خوبصورتی رہتی تھی۔ جانے ہماری زندگی سے ہمارے بچپن کے رنگ اور خوبصورت کے ساتھ ساتھ کیوں اڑ جاتے ہیں؟ جیون اتنا پھیکا کیوں پڑ جاتا ہے؟

ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی تک زندگی کی قوس و قزح سے کئی رنگ اڑ گئے۔ ہمارے والدین بوڑھے اور ان کی فکر اور پریشانیاں فزوں تر ہوتی چلی گئیں۔ شاید غربت بذات خود ایک ایسی آکاس نیل کی جڑ ہے جسے دھوں، غموں اور پریشانیوں کی ڈالیاں پھیلانے کے لیے مزید کسی آبیاری کی ضرورت نہیں پڑتی۔ غم کے کالے سائے سدا کے لیے اس کا مقدر اور فکر کی گھنی پر چھایاں ہمیشہ سے غربت کا نصیب ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ اگر خدا ہم سمجھی کو ایک جیسی تقدیر سے نواز دیتا تو اس کے خزانے میں کون سی کمی آ جاتی.....؟ لیکن یہ تب کی بات ہے کہ جب ہم آوارہ گردوں کو غربت نام کی دیمک چھوپنیں پائی تھیں۔ ہم سب اپنی ایک الگ دنیا میں مت تھے۔

جہاں فکر اور غم نام کا کوئی بھی گھنا سایہ ہمارے بلند قہقہوں کی دھوپ کے سامنے نکل نہیں پاتا تھا۔ ایک ایسی دنیا جہاں صبح زیادہ روشن اور دن کہیں زیادہ کھلے رہتے۔ جہاں شامیں گلابی اور راتیں سرمی خوابوں کی آماج گاہ بنی رہتی تھیں۔ میں آیاں احمد ایک ایسی ہی دنیا کا باسی تھا۔ ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تو قیر کا نالائق بیٹا..... رشتے سے پہلے کا سابقہ میرے ابا کے الفاظ میں میرے تعارف کا سدا بہار صیغہ تھا۔ ان کے بقول میرے ”آوارہ“ اور ”لوفر“ دوستوں کی صحبت نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا، حیرت کی بات یہ تھی کہ ہم چاروں کے والدین ایک جیسی رائے رکھتے تھے لہذا ہم سمجھی دوستوں کے لیے یہ بات ہمیشہ سے ہی ایک معہد بی رہی کہ آخر ہم میں سے اصل آوارہ اور لوفر ہے کون.....؟؟؟.....

آیاں احمد یعنی میں، اقبال (بالا)، راجہ اور جہاں گیر عرف مشی..... ہم سب ثاث کے پرائزی اسکول سے یونیورسٹی تک نہ صرف ہم پیالہ، ہم نوالہ بلکہ ”ہم محلہ“، بھی رہے تھے۔ ہماری دوستی ”غرض“ نام کی کسی بھی بیماری سے مبرأ تھی اور ہم سمجھی کو ایک دوسرے کے ماں باپ کی اپنے بارے میں تمام ”زریں“، آراء کا بچپن سے ہی بخوبی علم تھا لیکن ہم نے کبھی اپنے بارے میں ایسی کسی رائے کو بدلنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ ہم جو تھے، اس تھے اور زمانے سے ہمیں بس یہی درکار تھا کہ ”جہاں ہے جیسا ہے“ کی بنیاد پر ہمیں قبول کیا جائے۔

میرے ابا سرکاری اسکول کی ہیڈ ماسٹر سے ریٹائر ہونے کے بعد بس ایک ہی ارمان دل میں بسائے جی رہے تھے کہ ان کے دونوں بیٹے کمیشن پاس کر کے بڑے ماسٹر (اسٹرنٹ پروفیسر) بھرتی ہو جائیں تاکہ ان کی زندگی کی سب سے دیرینہ خواہش پوری ہو سکے۔ مجھ سے بڑا ریحان احمد تو پھر بھی کسی طور منت کر کے ۱۶ اجماعت پاس کر چکا تھا اور اب ابا کے حکم اور خواہش کی تعمیل میں دن بھر پلٹ سروں کمیشن کے دفتر کے چکر کا فتا رہتا تھا لیکن حق پوچھیں تو یہ پروفیسری میرے بس کاروگ نہ تھی۔ مجھے تو اپنی کلاس کے پروفیسروں کو دیکھتے ہی خلجان سا شروع ہو جاتا تھا اور پھر میرے ابا پر ہی کیا منحصر؟ اس کا لوئی میں ہم سمجھی نوجوانوں کے والدین اپنی اولاد سے اپنی ہی کسی حسرت ناتمام کی تعمیل چاہتے تھے۔ بالے کے ابا کسی سرکاری ورکشاپ میں مکینک تھے اور ان کی خواہش تھی کہ بالا اسی ورکشاپ میں ہیڈ مسٹر لگ جائے۔ راجہ کے ابا کلرک تھے اور وہ دن رات اسی فکر میں دبلے ہوئے جاتے تھے کہ جانے کب ان کا بیٹا اے کرنے کے بعد انہی کے محلے میں کم از کم سپرنٹ ننڈن بھرتی ہو گا۔

جہاں گیر (مشی) اور جاوید (مٹھو) کے ابا محلہ صحت میں ڈپنسر تھے اور دونوں میں ہی سارا سال اسی بات پر سمجھی رہتی تھی کہ پہلے کس کا

سپوت ہپتال میں انچارج ڈپنسر کی کرسی سنبھالے گا۔ جانے یہ والدین اپنی زندگیوں کی تمام ناکامیوں کے داغ اپنے بچوں کی خواہشات کے خون سے ہی کیوں وہونا چاہتے ہیں؟ حالانکہ ہم سمجھی کے والدین کی خواہشات معموم اور ہماری دسترس سے زیادہ دور بھی نہ تھیں لیکن ہماری بد نصیبی یہ تھی کہ ہمارا خیر بابو کا لوٹی کی مٹی سے کوسوں پرے گوندھا گیا تھا۔ اگر کوئی قصور و ارتقا تو وہ ہمارا نصیب تھا، اگر کچھ قبل تغذیر تھی تو وہ قسم تھی جس نے ہمیں ان معموم خوابوں کی بھٹی میں جھوکیں تو ڈالا مگر خود ہمارے اندر خواب گر بننے کی صفت پیدا کرنا بھول گئی۔

گھر میں میرے علاوہ مجھ سے بڑا ریحان اور مجھ سے چھوٹی رافعہ تھی جس کی صبح ہم دونوں بڑے بھائیوں کے نام کے ورد سے شروع ہوتی اور رات مجھے ابا کے غیض و غضب سے بچانے میں صرف ہو جاتی تھی۔ امی بالکل ولیسی ہی دھان پانی، آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگانے والی ہزاروں، لاکھوں امیوں جیسی تھیں جنہیں آخر وقت تک یقین ہوتا ہے کہ ان کا ہونہا ر سپوت دنیا کی تمام تر توقعات کے باوجود ایک دن سکندر عظیم کی طرح فاتح بن کر لوئے گا۔ ویسے اس معاملے میں ریحان کافی ہو شیار واقع ہوا تھا اور وہ اپنی روایتی مسکینی اور عاجزی کے بد لے رافعہ اور مجھ سے ہمیشہ کچھ زیادہ نمبر سمیت کر ای کالا ذله بنا رہتا تھا۔ ابا بھی ریحان سے ہی اپنی ہر آس جوڑے بیٹھے تھے کیونکہ اس نے خاصے اچھے نمبروں کے ساتھ ایم اے پاس کر لیا تھا اور امید بھی تھی کہ جلد یا بدیر وہ ابا کے خوابوں میں رنگ بھرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

باقی رہا میں..... تو میری زندگی تو کٹ ہی رہی تھی۔ بی اے کے پرچے ختم ہونے کو تھے اور ہم سب حسب معمولی کیفے فراق میں اپنی مخصوص میز کے گرد سرشار میں سر جوڑ کے بیٹھے تھے۔ باہر بارش تیز ہو چکی تھی اور بوندیں کیفے فراق کی میں کی چھت پر کسی بے ترتیب تال کی سرگم بکھیر رہی تھیں۔ پچا فراق کے کیفے کی ایک اور مخصوص نشانی..... یعنی ان کے ابا کے دور کا گراموفون بھی ہمیشہ کی بلیک اینڈ وائٹ دور کے نغموں کے سر بکھیر رہا تھا۔ ہم اکثر چچا کو چھیرا کرتے تھے کہ اب اس گراموفون سے ان گلوکاروں یا مغذیوں کے گیتوں کے بجائے ان کی چھتی رہوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں لہذا خدا کے لیے اسے بدل ڈالیں۔ مگر بد لے میں ہمیشہ ہمیں چند ناقابل اشاعت قسم کے کلمات سننے کو ملا کرتے تھے۔ اس بھیگی شام میں بھی گراموفون چرچا رہا تھا۔

”اے میرے دل کہیں اور چل.....

غم کی دنیا سے دل بھر گیا..... ڈھونڈ لے اب کوئی گھر نہیں.....“

راجہ نے کل رات کی بچائی ہوئی سگریٹ کے ٹوٹے سے آخری کش باقاعدہ کشید کیا اور سگریٹ فضا میں اچھال دی۔

”ہاں یا ر..... اب تو دل بھی کہتا ہے کہ کہیں اور چلا جائے..... بھیا ہمارا تو اب اس ”بایو کا لوٹی“ میں دل نہیں لگتا.....“

بالے نے اپنے ہاتھ کی پرانی کمپی Camy گڑی پر نظر دوڑا۔

”یار بڑی دیر کر دی اس کا لج کے ٹکر کنے..... اب تک تو پرچہ آوٹ ہو جانا چاہئے تھا۔ کہیں مر واہی نہ دے..... میں نے بارہ لڑکوں سے پیسے جمع کر کے خود اس کے حوالے کیے تھے۔ کہہ رہا تھا 12 بجے رات تک پرچہ پہنچا دے گا.....“

قریب سے گزرتے کیفے کے سدا بہار نشی مرزانے بالے کی بات سن لی۔ ”جنہی مخت اور وقت تم لوگ پرچہ آوٹ کر دانے پر صرف کرتے ہو۔ اس کا دس فیصد بھی اگر پڑھنے پر لگا دو تو تم سب کی فرشت ڈویژن آجائے گی۔“ ”مرزا آگے بڑھ گیا۔

مشی نے اپنی اداسی بھری لگا ہیں انھائیں.....

”یا رتم لوگوں کو اپنی پڑی ہے۔ کسی کو میرے اردو کے پرچے کی فکر نہیں ہے۔۔۔ یقین کرو اس بار میرے ابا کم نمبر آنے پر میری جان ہی لے لیں گے۔۔۔“

مشی کی پریشانی بالکل بجا تھی۔ اس کے ابا محلے کے جزو قت شاعر بھی رہ چکے تھے اور ان کا بیٹا پچھلی بار پرچے میں اقبال کا مشہور شعر پچھا اس طرح لکھا آیا تھا

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

نیل کے ساحل سے لے کرتا بخاک کا شغیر

ہم سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔ راجہ نے اس کی ہمت بندھائی

”فکر نہ کرو۔۔۔ مجھے پورا یقین ہے کہ نبرد یتے وقت متحن تمہارے ”شعری وزن“ کی واد ضرور دے گا۔۔۔ شاباش۔۔۔“ بالے نے ایک گھری سانس لی ”آخری وارنگ تو مجھے بھی گھر سے مل چکی ہے۔۔۔ مجھے بھجنہیں آتا کہ محمود غزنوی سترہ حملوں کی بجائے ایک ہی بار بھی کڑا کر کے سومنات کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا تو تاریخ پر کیا فرق پڑ جاتا۔۔۔؟ کم از کم میں تو ان سترہ تاریخوں کے جھنجٹ سے نکل پاتا۔۔۔ ہر بار کہیں نہ کہیں ان سن اور تاریخوں کے جھمیلے میں چوک جاتا ہوں۔۔۔“

”سنوفنگلو۔۔۔ کیا ضروری ہے کہ ہر رات تم لوگوں کو باقاعدہ اعلان کر کے گھروں کو بھیجا جائے۔۔۔ ابھی کچھ دری میں ہی تم لوگوں کے گھروں سے پیغامات کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔۔۔ پھر سب یہی کہیں گے فراق تم لوگوں کو بگاڑ رہا ہے۔۔۔“ راجہ نے دور سے ہی ہائک لگائی

”فکر نہ کرو پچھا۔۔۔ اب ہمیں مزید بگاڑنا ممکن نہیں۔۔۔“

ہم سب کیفے سے باہر نکلے تو بارش کچھ قسم سی گئی تھی، لیکن ہوا میں موجود نبی کے قطرے جھونکوں کے ساتھ ہمارے چہروں پر شبنم بکھیرنے لگے۔۔۔ میں نے بالے اور راجہ کو یاد لایا کہ صبح آخری پرچے ہے لہذا وہ مجھے وقت پر گھر سے لیتے چلیں۔۔۔ گلی کے نکڑ پر میں نے ان سب کو رخصت کرتے ہوئے ہاتھ ہلا کیا اور گلی میں داخل ہوتے وقت دل ہی دل میں گڑ گڑا کردعا کی کہ ابا سوچکے ہوں۔۔۔ زمین سے کچھ کنکر چن کر میں نے وقفہ و قفرے سے تین کنکر صحن میں آہستگی سے اچھال دیئے۔۔۔ یہ میرے اور مجھے سے چھوٹی رافعہ کے درمیان بہت پرانا اشارہ مقرر تھا۔۔۔ کنکر صحن میں گرنے کی آواز سن کروہ چکے سے صحن کے اندر دروازے کی چھٹی اندر سے کھول دیتی تھی کیونکہ ابا کے فرمان کے مطابق ٹھیک عشاء کی نماز کے بعد گھر کا دروازہ بند کر دیا جاتا تھا۔۔۔ رافعہ کو میری اسی ”غیبی امداد“ پر بچپن سے لے کر اب تک درجنوں مرتبہ ابا سے سخت ڈانٹ پڑ چکی تھی لیکن وہ بھلا اپنے ”انو بھیا“ کو رات کا کھانا کھلائے بغیر کب سکون کی نیند سو سکتی تھی۔۔۔ لہذا ہر بار اسی بے چاری کو ابا کے غمیض و غضب کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔۔۔

تیرے پتھر کے چند لمحوں بعد صحن میں قدموں کی دھیسی سی آواز ابھری اور پھر رافعہ نے دھیرے سے دروازہ کھول دیا۔۔۔

”آیاں بھیا۔۔۔ آپ آج بھی اتنی دیرے سے آئے ہیں۔۔۔؟۔۔۔ پتہ ہے ابا کتنے خسے میں تھے۔۔۔؟۔۔۔“ میں نے کندھے اچکائے ”یہ

کون اسی نئی بات ہے..... مغلِ اعظم کا پارہ ہمیشہ ہی بلند رہتا ہے..... ”رافعہ نے مجھے گھورا..... ”انو بھائی..... بری بات.....“

”ارے یار ہم مغل ہیں..... تو اب مغلِ اعظم ہوئے ناں اس گھر کے..... اچھا بہت بھوک گلی ہے..... کچھ کھانے کو بھی ملے گا یا پھر یونہی کھڑی میرا سر کھاتی رہو گی.....؟“

رافعہ جلدی سے باور چی خانے کی طرف پلٹی۔ ”تین مرتبہ گرم کر چکی ہوں“

”وہ پڑھا کو پرو فیسر کھاں ہے۔ سو گیا کیا.....؟“ میں نے باور چی خانے میں پڑی چوکی گھسیٹی اور وہیں بیٹھ گیا۔ رافعہ نے سالن گرم کرنے کے لیے چوہبہ کو آگ دکھائی۔ ”اس طرح پکارتے ہیں اپنے بڑے بھائی کو..... پورے ڈیڑھ سال بڑے ہیں ریحان بھیا آپ سے.....“

”سب تاریخ پیدائش کا چکر ہے..... ڈیڑھ سال پہلے میں پیدا ہوا ہوتا تو آج میں بڑا ہوتا.....“ میں نے پہلا نوالہ منہ میں رکھا ”بھائی..... کیوں ایسی باتیں کرتے ہیں آپ..... پتہ ہے ابا آپ کی تعلیم اور نوکری کے لیے کتنے پریشان رہتے ہیں..... اور امی تو آپ کی فکر میں پہلے سے بھی آدمی رہ گئی ہیں..... آخر آپ ان دونوں کی بات پر کان کیوں نہیں دھرتے.....“

میں نے چڑ کر ہاتھ جوڑے ”خدا کے لیے چھوٹی..... اب تم میری نافی اماں بننے کی مشق شروع نہ کرو..... یہ کام امی ابا کے لیے ہی چھوڑ دو..... اور پھر مجھ سے جو بھی بن پڑتا ہے کرتا تو ہوں..... لیکن اگر ابا یہ سمجھتے ہیں کہ بی اے کرتے ہی وزیر اعظم لگ جاؤں تو یہ میرے لیے ناممکن ہے..... آخر تم سب کو یہ بات سمجھے میں کیوں نہیں آتی کہ یہ سرکاری بابو گیری میرے بس کاروگ نہیں ہے..... مجھ سے نہیں ہوتی یہ سرکار کی چوبیں گھنٹے کی غلامی..... اس قربانی کے لیے ریحان موجود ہے..... بکرا بننے کے لیے..... مجھے تو تم لوگ بخش ہی دو.....“

میری آواز بلند ہوتے دیکھ کر رافعہ نے جلدی سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا لیکن شاید تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

اچاک میرے عقب میں ابا کی گرجتی ہوئی آواز سے ماحول کا نپ سا گیا۔

”مل گئی فرصت گھر آنے کی..... اب بھی آنے کی کیا ضرورت تھی صاحزادے..... ابھی تو آدمی رات باقی پڑی تھی آوارہ گردی اور لوفر گیری کرنے کے لیے..... میں پوچھتا ہوں یہ کون سا وقت ہے گھر واپس آنے کا..... یہ گھر ہے یا کوئی سرائے.....؟؟“

رافعہ جو پہلے سے ہی گھبرا کر کھڑی ہو چکی تھی اس نے مجھے نظروں ہی نظروں میں کھانا جلدی ختم کرنے کا اشارہ کیا۔ میں بادل نخواستہ پانی کا ایک لمبا سا گھونٹ لے کر کھانا ادھورا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چھوٹی جانتی تھی کہ ابا کے قہر و غصب سے بچنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ فی الوقت ان کی

آگ برساتی نظروں سے دور رہت جایا جائے۔ ابا کی آواز سن کر اندر سے امی اور ریحان بھی بوکھلائے ہوئے سے باہر نکل آئے۔ میں سر جھکا کر چھت کی سیڑھیوں کی جانب بڑھاتا کہ اوپر بننے جزوی گودام اور کل وقتی اس ”کرہ نما“ میں جا کر پڑ رہوں جو بچپن سے اب تک میری آخری پناہ گاہ تھا، لیکن میرا قدم اٹھتے ہی ابا ایک بار پھر زور سے چلائے۔

”کھاں چل دیے..... روکو..... آج ایک بات کا فیصلہ ہو کر رہے گا۔“

ریحان اور چھوٹی نے گھبرا کر امی کی طرف دیکھا۔ میرے سیڑھیوں کی طرف بڑھتے قدم رک گئے۔



## باب 2 کتاب گھر کی پیشکش

مجھے اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ راتوں کو دیر تک گھر سے غائب رہنے پڑا اس پڑچھی تھی لیکن آج مغل عظیم کا پارہ واقعی ساتوں آسمان کو چھوڑ رہا تھا۔ امی نے کمزوری مدافعت کرنے کی کوشش کی۔

”اب جانے بھی دیں..... رات بہت ہو گئی ہے..... صحیح بات کر لیں گے.....“

ابا پھر گرجے ”خبردار..... آج کوئی بیچ میں نہیں بولے گا۔..... اور رافعہ کی ماں..... تمہاری اسی طرف داری نے اس لوفر کو آج اس مقام پر پہنچا دیا ہے۔ لوگ میری پیٹھ پیچھے ہستے ہیں کہ سارے زمانے کو اصولوں کا سبق دینے والے ماسٹر تو قیر کی اپنی اولاد اس کے کہے میں نہیں ہے..... ہاں تو میاں..... آج صاف صاف بتاہی دو کہ کب تک یونہی ہمارے سینوں پر موںگ دلتے رہو گے..... تمہاری یہ آوارہ گردیاں کب ختم ہوں گی.....“

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھوٹا چاہا۔ امی نے ابا کے عقب سے مجھے گھور کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ریحان نے بھی غیر محسوس طور پر ہاتھ جوڑے۔ میں نے ہتھیار ڈال دیے۔

”بھی..... کوشش کروں گا کہ آئندہ دیر نہ ہو.....“

لیکن میرا یہ کہنا ہی غصب ہو گیا۔ آتش فشاں پھٹ پڑا۔.....

”کوشش..... بہت خوب..... سنتی ہو رافعہ کی ماں..... ابھی بھی یہ لوفصرف کوشش کرے گا۔ آج اس کی ہڈی پسلی ایک نکی تو میرا نام بھی تو قیر احمد نہیں ہے.....“

ابا اپنی چھڑی سنjal کر میری طرف لپکے۔ امی جلدی سے ان کی راہ میں مزاحم ہو گئیں اور چھوٹی نے فوراً اپکر ابا کی چھڑی پکڑ لی، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ابا صحن میں ٹھیک وہاں کھڑے تھے جہاں چھٹ پر جانے کے لیے سیر ہیوں کی ایک چھوٹی سی ڈیورٹمنٹ بنی ہوئی تھی لہذا میرے پاس اپنے کمرے کی طرف بڑھنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ امی اور رافعہ ابا کی منت سماجت میں مصروف تھیں لہذا میرے پاس گھر سے باہر نکل جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں صحن کا دروازہ کھول کر باہر گلی میں نکل گیا۔ پہلے تو سوچا کچھ دیر یہیں گلی میں کھڑے رہ کر اس لاوے کے سرد ہونے کا انتظار کروں لیکن پھر دوسرے ہی لمحے ابا کے چلانے کی آواز آئی ”ریحان..... دروازہ بند کر دو.....“ ایک رات باہر کی ہوا کھائے گا تو ہوش ٹھکانے آجائیں گے اس بدمعاش کے..... ”گھر کے اندر کچھ دباؤ بسا احتیاج ابھر لیکن پھر آخر کار اندر سے صحن کے دروازے کی چھٹی چڑھائے جانے کی آواز گلی میں گوئی..... میں جانتا تھا کہ مغل عظیم اپنے فیصلے واپس لینے کے عادی نہیں ہیں۔ لمحے بھر میں میرے مغل خون نے بھی جوش مارا ”ٹھیک ہے اگر مغل شہنشاہوں کو دیس نکالا دینے کی عادت ہے تو مغل شہزادے بھی اپنی سلطنت کو ٹھوکر مار کر خاک چھانے کا ہر جانتے ہیں۔“ سو میں بھی ابا کے اس دوکروں کے سرکاری کوارٹر کی ریاست کو ٹھکرا کر رات گزارنے کے لیے کسی جزیرے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ جزیرہ اس لیے کہ فی الحال تو

سارا شہر بارش کے بہتے پانی کی وجہ سے ایک چھوٹے دریا کا مظہر پیش کر رہا تھا۔ میں نے اپنی شرٹ کے کالر کھڑے کر لیے کیونکہ تیز بوندوں نے ایک بار پھر زمین کو جل تھل کرنے کے لیے سازش باندھ لی تھی۔ جانے بارش کا واسطہ ہمیشہ غریب کے کچے گھروندے سے ہی کیوں ہوتا ہے؟ یا پھر امراء کے محلوں پر برستے والی بارش شاید کوئی اور ہوتی ہوگی..... ۹۹۹.....

پہلے میں نے سوچا کہ کالونی سے نکل کر سڑک کے اگلے چوراہے سے متصل سڑک پر واقع بالے کے ابا کے گیرا ج چلا جاؤں، لیکن جانے کالونی سے نکلتے ہی میرے قدم خود بخود کیفے فراق کے باہر بچھے لکڑی کے نخ نما ناخنوں کی جانب کیوں بڑھتے گئے۔ کیفے کے لکڑی سے بنے چاروں دروازے تو بند تھے لیکن کھڑکیوں سے چھن کر سڑک پر گرتی روشنی کے مستطیل نکلوے اس بات کا پتہ دے رہے تھے کہ اندر صبح کے ناشتے کی تیاریاں شروع ہو چکی ہیں۔ کیفے فراق کی حلوہ پوری سارے شہر میں مشہور تھی اور صبح منہ اندر ہیرے ہی شہر سے باہر موجود سینٹ کی فیکٹری کو جانے والے پہلی شفت کے بہت سے مزدور بیٹیں سے ناشتہ کر کے صبح چھبجھے والی پہلی بس پکڑتے تھے۔

بارش تیز ہو چکی تھی۔ میں ٹین کی چھت والے برآمدے کے نبٹا خلک حصے میں پڑے ایک تختے کی جانب بڑھ گیا۔ اندر سے چائے کی سوندھی اور کچھ بے چین سی کردینے والی مہک باہر کیفے کے برآمدے تک آ رہی تھی۔

اگر صبح کا واحد تعارف روشنی اور سورج کے طلوع ہونے سے ہی تھا تو بھی صبح ہونے میں کافی دیر باقی تھی۔ میں کچھ دیر تک بیٹھ پر لیٹا سڑک پر گرتی بوندوں کے فنا ہونے کا کھیل دیکھتا رہا۔ پھر نہ جانے کب نیند کی روٹھی پری میری پلکوں کے مورچھل سے آ کر لپٹ گئی اور میں نے آنکھیں موندھ لیں شکر ہے ہم غریبوں کو امیروں کی طرح نیند خریدنی نہیں پڑتی۔ مجھے سوئے کچھ ہی دیر گزری ہو گئی کہ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے دھیرے سے میرا شانہ ہلا کیا ہو۔ چند لمحوں کے لیے میں بھول گیا کہ میں اپنے گھر میں نہیں سڑک کنارے سور ہا ہوں۔ مجھے لگا جیسے حسب معمول دیر تک سونے کی وجہ سے چھوٹی مجھے چھت پر جگانے آئی ہے۔ میں نے نیند میں اپنا غصہ نکالا ”کیا مصیبت ہے..... سونے دونا.....“

”معافی چاہتا ہوں برخوردار..... وہ دراصل..... میں.....“

ادھ کھلی پلکوں سے میں نے اپنے سامنے بارش میں شراب اور ایک بزرگ کو پریشان کھڑے دیکھا۔ میں ہڑ بڑا کر انھوں بیٹھا۔

”میں تمہاری نیند خراب نہیں کرنا چاہتا تھا..... لیکن مجبوری ہی کچھا یسی آن پڑی تھی..... گھروالی اور پچیاں میرے ساتھ ہیں اور بارش ہے کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہی.....“

سڑک کے کنارے ایک عورت اور دوڑ کیاں ہاتھ میں کپڑے کی چند گھڑیاں تھامے، ٹین کے ایک صندوق کے قریب کھڑی، خود کو بارش سے بچانے کی ناکام کوششیں کر رہی تھیں۔ ماں اور ایک لڑکی باقاعدہ بر قعے میں اور دوسری لڑکی نے بھی مناسب پرده کر رکھا تھا، لیکن تیز ہوا کے تپھیرے انہیں بار بار سر کا پلوٹھیک کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ سر کا پلو عورت کا سامبان ہوتا ہے لیکن طوفان کو بھی تو سدا ہی سامبانوں سے سروکار رہا ہے۔

میں نے سر جھلک کر اپنے حواس بحال کیے۔

”جی فرمائیے.....“

بزرگ نے اپنی بات کا سلسلہ جوڑا "در اصل ہم لوگ ابھی کچھ دیر پہلے ہی نور پور کی گاڑی سے اترے ہیں۔ ٹرین کو کل شام پانچ بجے اس شہر کے پلیٹ فارم سے لگنا تھا لیکن سیالابی پانی کی وجہ سے رات تین بجے پہنچی۔ جنہوں نے ہمیں اشیش لینے کے لیے آنا تھا وہ نہ جانے کب تک ہمارا انتظار کرنے کے بعد واپس جا چکے ہیں۔ میں اس شہر میں نووارد ہوں۔ تا لگے والے کو جو پتہ زبانی یا تھا وہی بتا دیا لیکن یہاں اترنے کے بعد اندازہ ہو رہا ہے کہ شاید تم کسی غلط جگہ اترے گئے ہیں۔ یہ سادات محلہ نہیں ہے....."

"سادات محلہ یہاں سے زیادہ دور تو نہیں لیکن آپ اس برستی بارش میں خواتین کو لے کر وہاں تک پہنچیں گے کیسے.....؟" میری بات سن کر بزرگ نے کچھ تامل کیا۔

"میاں..... اسی لیے تو تمہیں سوتے سے جگایا ہے۔ میں جانتا ہوں تم دن بھر کی محنت مشقت کے بعد ہی یوں بھی تان کر سوئے ہو گے..... لیکن اگر تم ہمیں سادات محلے کے اس مکان تک پہنچا دو تو میں معقول مزدوری دوں گا تمہیں....."

مجھے کیفے کے باہر یوں بیٹھ پر سوتا دیکھ کر شاید وہ مجھے کیفے کا ہی کوئی ملازم یا مزدور سمجھتے تھے۔ اس میں ان کا کچھ زیادہ قصور بھی نہیں تھا۔ اس وقت میرا حلیہ ہی کچھ ایسا تھا۔ یا شاید میں نے فٹ پاٹھ سے لگے جس بیٹھ کا اپنا بستر بنار کھا تھا۔ اس مقام نے انہیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا؟ اگر میں اسی حلیے میں کسی پیچ ستارہ ہوٹل کے کمرے میں سورہا ہوتا تو لوگ اسے میرا "بے تکلف برتا کا" Non-formal behaviour گردانتے، شاید ہمارے ظاہری حیلوں سے کہیں زیادہ ہمارے آس پاس کا ماحول ہمارے تعارف پر اثر انداز ہوتا ہے.....

میں نے کچھ کہے بغیر ان کے ہاتھ میں دبی کاغذ کی وہ پرچی پکڑ لی جس پر سادات محلے کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ "مکان نمبر 13، گلی نمبر 7، سادات محلہ" پرچی کے دوسری جانب کسی تنور یا کاتا نام لکھا ہوا تھا۔ میں نے کاغذ اپنی جیب میں ڈال لیا۔ "حلیے....." میں نے بڑے میاں کا جواب سے بغیر قدم بڑھا دیے۔ پیچھے سے ان کی کم زوری آواز ابھری۔

"میاں..... صندوق تو اٹھا لو....."

میں نے ایک لمبی سی سانس بھری اور دل ہی دل میں خود کو سما

"برے پھنسے آیاں میاں..... اور لوڑک کے کنارے کھلی فضائیں سونے کے مزے....." میں نے بادل نخواستہ سڑک پر پڑا ٹین کا صندوق اٹھایا۔ جانے کیا پتھر ڈال رکھے تھے بڑے میاں نے صندوق میں..... تو قع کے خلاف وزن کی زیادتی کی وجہ سے ایک لمحے کے لیے میرے قدم لڑکھڑا سے گئے، چہرے کو نقاب میں چھپائے ہوئے بنا بر قعے والی لڑکی کڑک کر بولی "ٹھیک سے اٹھاؤ..... بہت نازک اور قیمتی چیزیں ہیں اندر، کہیں گرانہ دینا سب کچھ....." غصے سے میرے خون کا بہاؤ تیزی سے میری کن پیسوں کی طرف دوڑا۔ جی میں آئی کہ صندوق وہیں سڑک پر پھینک کر ہاتھ جھاڑلوں کہ "لبی بی یہ لو..... سنجالا و اپنا قیمتی سامان..... آیاں احمد نے آج تک گھر میں اٹھ کر پانی کا گلاس تک نہیں پیا..... اور یہ محترمہ صندوق اٹھانے کا درس دے رہی ہیں؟" میں نے زور سے صندوق سڑک پر پٹھ دیا۔ سانٹے میں دور تک کچھ لیکی آواز گونجی جیسے کسی نے بہت اوپھی عمارت سے لمبے زمان میں پر پھینک دیا ہو۔ بر قعوں کے اندر کچھ ہچل سی مچی اور لڑکی چلائی۔ "ارے ارے..... دیکھ کر....."

لیکن تب تک بڑے میاں میرے برتاو کا کچھ نتیجہ اخذ کر چکے تھے۔ وہ جلدی سے آگے بڑھے۔

”میاں تم اس کی بات کا برانہ منانا..... نادان پچی ہے.....“

پھر وہ لڑکی کی طرف پلٹئے اور انہی کی غصیلی لیکن دسی آواز میں بھڑکے۔

”گہنا..... اب تم کچھ نہیں بولوگی..... سمجھ گئیں.....“ لڑکی نے دبی آواز میں خود سے کچھ بڑا ہٹ کی، لیکن جواباً کچھ نہ بولی۔ اچھا..... تو اس نادان پچی کا نام گہنا تھا۔ بڑے میاں نے صندوق کی دوسری جانب کا کندہ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ ”چلو صاحبزادے..... میں تمہارا وزن کچھ ہلاک کیے دیتا ہوں۔..... ہم دونوں اسے اٹھائیں گے.....“

میں نے آہستگی سے ان کا ہاتھ ایک جانب کر کے صندوق خود اٹھایا اور آگے چل پڑا۔ لڑکی نے بڑے میاں سے نظر اور زبان بچاتے ہوئے غصے میں طنزیہ جملہ پہینکا ”بڑے نخے ہیں اس قلی کے بھی.....“

میں نے سنی ان سنبھال کیونکہ بارش کی وجہ سے بزرگ اب ہلکے ہلکے کاپنے سے لگتے تھے۔ ہم سب بارش میں بھیگلی سڑک پر چھپ چھپ کرتے قریباً 20 منٹ میں سادات محلے پہنچ گئے۔ اینٹ سے چھپنے کے لیپ پوسٹ ابھی روشن تھے لہذا مطلوبہ مکان ڈھونڈنے میں زیادہ وقت پیش نہیں آئی۔ دوسری ہی دستک پر اندر سے لپکتے جمکپتے ایک چھبیس سالہ نوجوان آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگائے برآمد ہوا اور بزرگ کو دیکھتے ہی لپک کر ان کے گلے لگ گیا۔ پہنچ چلا کہ یہی تنویر علی صاحب ہیں اور بزرگ جن کا نام شیخ کیرو تھا نور پور کے حالیہ سیالاب میں اپنے اسپتہ کچھ ڈبو نے کے بعد اپنی مرحومہ بہن کے بیٹے کے پاس ہمارے شہر میں پھر سے ایک نئی زندگی کی ابتداء کے لیے اترے تھے۔ ماموں بھانجا کچھ دریتک دروازے پر ہی گلے شکوئے کرتے رہے اور بر قعے والی بڑی عمر کی عورت تنویر کی بلا میں لیتے نہ تھکی تو مجبوراً مجھے ہلکے سے کھکار کر انہیں احساس دلانا پڑا کہ ان قیمتی جذبات کا اظہار وہ گھر کے اندر جا کر بھی کر سکتے ہیں۔ میرے کھانے پر بڑے میاں چونکے اور جلدی سے اپنی واسکٹ کی جیب سے میں میں کے دونوں ٹکال کر میری طرف بڑھے ”معاف کرنا میاں..... موقع ہی کچھ ایسا تھا کہ من بہک گیا۔ میں تو بے وصایا میں تمہارا نام پوچھنا بھی بھول گیا تھا۔ لو یہ رکھلو..... تم نے اس برستی بارش میں بڑی ہمت دکھائی۔“ میں نے روپے ان کے ہاتھ سے لے کر ان کی واسکٹ کی اوپر والی جیب میں ڈال دیے۔

”میرا نام آیا ہے..... اور میں قلی نہیں ہوں.....“

میں نے واپس پلتے وقت کڑی نظروں سے خود کو قلی کے عہدے پر فائز کرنے والی ”نادان“ کو دیکھا اور چل پڑا۔ بڑے میاں چند لمحوں کے لیے توہا کا بکا سے ہی رہ گئے اور پھر میرے پیچے لپکے ”ارے میاں..... یہ کیسے..... میرا مطلب ہے..... دو گھنٹی ہماری بات تو سن لو.....“

لیکن میں رکے بنا اس گلی سے نکل آیا۔ قریبی مسجد سے فجر کے نمازی نکل رہے تھے۔ مطلب صبح ہونے کو تھی، لیکن گھنے بادلوں اور بارش کی وجہ سے ابھی تک دھنڈ لکا بہت گھرا تھا۔ مرکزی سڑک پر دو دھنڈ والے گوالے اور اخباری ہاکر اپنی اپنی سائیکلوں پر بھونپو بجاتے، سڑک پر بہتے پانی میں تیزی سے دوڑتے سانپ جیسی لکیریں بناتے، شہر میں نکل آئے تھے۔ میں بھی پوری طرح بھیگ چکا تھا۔ کچھ سائیکل سواروں نے سر پر کشتی نما پلاسٹک کی ٹوپیاں اور ہر کھلی تھیں جو ان کے لیے عارضی چھتری کا کام دے رہی تھیں، لیکن کچھ میری طرح سدا کے بے سائبان بھی تھے جنہیں مفلسوں کی وجہ

سے طوفانوں میں کچھ لٹ جانے کا خوف نہ تھا۔

میں جب "کیفے فراق" کے نکلتک پہنچا تو سیاہ گھاؤں کے پیچھے سے ابھرتی دو دھیا گلابی روشنی نے ماخول پر کسی کم طاقت والے زرد بلب کا جالا پھیلا دیا تھا۔ مجھے دور سے ہی ریحان اسی شیخ پر چھتری تانے بیٹھا نظر آگیا جہاں اب سے گھنٹہ بھر پہلے میں خود حواستراحت تھا۔ ریحان مجھے آتا دیکھ کر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

"کہاں تھے تم..... میں ریلوے اسٹیشن اور بالے کا گیراج بھی دیکھ آیا ہوں..... یہ کوئی وقت ہے مژگشتی کرنے کا؟" ریحان نے بھیگل چھتری کو ہوا میں جھاڑ کر اسے دوبارہ ہم دونوں کے سروں پر تان لیا۔ جانے کیوں مجھے اسٹیشن کا ذکر سن کر غصہ آگیا "کیوں..... تم مجھے ڈھونڈنے ریلوے اسٹیشن کیوں گئے تھے..... میرافی الحال وہاں قلی بھرتی ہونے کا کوئی ارادہ نہیں ہے....." ہمیشہ کی طرح ریحان نے فوراً تھیار ڈال دیے۔

"اچھا گھر چلو..... امی ساری رات تمہاری وجہ سے سوئی نہیں ہیں..... آج تمہارا پرچہ بھی تو ہے....." "کیوں.....؟..... مغل اعظم نے مفلر اتار کر اسے میری کمر کے گرد کس کر پکڑ لیا۔ "تمہارے تو اچھے بھی واپس جائیں گے..... چلو سیدھی طرح گھر....." یہ اس کا بہت پرانا اور آزمودہ طریقہ تھا۔ بچپن میں جب میں امی یا ابا سے کسی بات پر روٹھ کر کالونی سے باہر کھیل کے میدان میں شام تک چھپا بیٹھا رہتا تھا تو تب بھی ریحان مجھے ڈھونڈنے کے بعد اسی طرح مفلر، پتلوں کی بیٹی یا کسی رسی وغیرہ سے باندھ کر کھینچتے ہوئے گھر تک لے جاتا اور امی کے حضور پیش کر دیتا تھا۔ اس روز بھی یہی ہوا۔ آس پاس سے گزرتے اجنبی حیرت سے یہ ما جرا دیکھ رہے تھے کہ قریباً ایک ہی عمر کے دو لڑکوں میں سے ایک دوسرے کو مفلر سے باندھے کھینچنے لے جا رہا ہے اور دوسرا لڑتا جھکھڑتا پہلے کے پیچھے روانہ ہے۔ محلے کے چند بزرگ جو نماز سے فارغ ہو کر اپنے گھروں کو جا رہے تھے وہ ایک بار پھر وہی برسوں سے دھرا یا جانے والا کھیل دیکھ کر زیر لب مسکرائے۔ چند ایک نئے ہنس کر ریحان کو داد دی "شabaش ریحان بیٹا..... جانے نہ پائے یہ بدمعاش آیاں....." "ذرا کس کے پکڑنا اس شیطان کو....." تیرے بڑے میاں منناۓ "اب آیا تاں اونٹ پھاڑ کے نیچے..... بھی یہ ریحان ہی ہے جو اس آفت کو تابو کر سکتا ہے....."

کچھ ہی دیر میں ہم دونوں گھر کے صحن میں موجود تھے جہاں امی برآمدے میں پریشانی سے ٹھل رہی تھیں۔ میری حالت دیکھ کر انہوں نے بنا کچھ کہے تو یہ سے میرے بال خشک کرنا شروع کر دیے اور رافعہ جلدی سے دھلے ہوئے کپڑوں کا جوڑ اسٹری کر لائی۔ امی کی نان اسٹاپ نصیحتوں کا پٹاڑہ کھل چکا تھا۔

"انو..... کیوں ستاتا ہے اپنی ماں کو ہر وقت..... بات کیوں نہیں مان لیتا اپنے ابا کی.....؟..... وہ تیرے بھلے کے لیے ہی تو کہتے ہیں....." میں نے دل ہی دل میں ان کے آگے کہے جانے والے جملے اپنے دل میں دھرا نا شروع کر دیے۔ "کوئی باپ اپنی اولاد کا دشمن نہیں ہوتا۔" "تونہیں جانتا کہ انہوں نے کس مشکل سے تم تینوں کی پرورش کی ہے،" غیرہ وغیرہ۔ اور پھر آخر میں امی نے ایک بار پھر ابا کی ان "قربانیوں" کا ذکر کیا جو ہم تینوں بچوں سے ابھی تک پوشیدہ تھیں۔ میں حسب معمول ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالتا رہا۔ کچھ ہی دیر بعد گلی میں بالے کی

پھٹ پھٹیا کا سائلنر غرانے لگا۔ میرے ابا کے ڈر سے وہ صرف ایک بار ہارن دے کر پھر وقفہ و قفقے سے موڑ سائیکل کو صرف ریس دیتا رہتا تھا، لیکن آج ابا صحن میں کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ ویسے بھی جس رات دیرے سے ان کا مجھ پر قہر نازل ہوتا تھا اس کی اگلی صبح وہ میرا سامنا کرنے سے گریزی کرتے تھے۔ ای مچھے زبردستی ناشتہ کراتی رہ گئیں اور میں بھاگم بھاگ بالے کے ساتھ یونیورسٹی پہنچا۔ ”اردو“ میرے لیے ہمیشہ ہی سے بہت سہل تھی۔ شاید اردو میڈیم ہونے کا بس بھی ایک فائدہ ملا تھا مجھے۔ جبکہ بالے اور راجہ کا پرچہ کچھ خاص نہیں ہوا۔ حسب معمول گھرو اپسی پر راجہ اور بالے میں یہی بحث ہوتی رہی کہ جانے ممتحن کو ان سے آخرالیٰ کیا دشمنی تھی کہ جب وہ میرا اور سودا پڑھ کر جاتے تو پرچے میں غالب ہوتا اور جس دن غالب کا دیوان گھول کر پینے کے بعد پرچہ دینے بیٹھتے تو اقبال وہاں بر اجہان ملتے..... ان دونوں نے طے کر لیا کہ آئندہ وہ دماغ کے بجائے کوٹ اور واسکٹ کی جیبوں میں ان شاعروں کی سوانح عمریاں اور کلام بھر کر لے جائیں گے۔

بارش کچھ قسم چلی تھی لیکن گھٹا میں اب بھی آسمان پر ایک دھانی آنچل اوڑھے ہوئے تھیں۔ ایسا آنچل جس کے کناروں پر سرمی رنگ کی گوشہ کناری جڑی ہوئی ہو..... بالے نے راستے ہی میں اعلان کر دیا تھا کہ ایسے ”قاتلِ موسم“ میں کیفے فراق سے ادھار گرم سمو سے اور چائے پے بنا گزرنا گناہ کبیرہ ہوگا۔ لہذا ہم سب اپنے گناہ بخشوونے کیفے فراق جا پہنچے۔ مجھے دور سے دیکھتے ہی کیفے کافشی مرزا زور سے چلا یا ”ارے یہ رہا پنا آیاں..... بھی یہ صاحبان بہت دیرے سے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں“ میں نے مرزا کی نگاہوں کے تعاقب میں نظر دوڑا تی۔ سامنے والی میز سے دو فراہ اٹھ کر پلٹے۔ وہ گزشتہ رات والے شیخ صاحب اور تنویر تھے۔

## کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

## خدا اور محبت

## کتاب گھر کی پیشکش

**خدا اور محبت** بہت ہی خوبصورت اور رومانی ناول ہے جو مصنف ہاشم ندیم کی اپنی محبت کی پچی داستان پر مبنی ہے۔ یہ مصنف ہاشم ندیم کا پہلا ناول ہے اور اس کی کہانی کو کہ اور لندن شہر کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ یہ ناول ایک پرائیوٹ چیلن پر ڈرامائی شکل میں بھی پیش کیا جا رہا ہے۔ اس ناول کو نیشنل اور انٹرنیشنل دونوں سطح پر بہت سراہا گیا ہے اور بہت جلد علم و عرفان چلیکیشنز والے اس ناول کا انگریزی ایڈیشن لندن سے شائع کرنے والے ہیں۔

یہ ناول کتاب گھر پرستیاب ہے۔ جسے **ناول سیشن** میں دیکھا جاسکتا ہے۔

## باب 3 کتاب گھر کی پیشکش

میں ان دونوں کو وہاں اپنا انتظار کرتے دیکھ کر کچھ چونک سا گیا لیکن شیخ صاحب مجھے دیکھتے ہی کچھ اس وارثتی سے میری جانب لے کر جیسے ہماری برسوں کی شناسائی ہو۔ ”یہ کیا میاں..... تم تورات ناراض ہو کر یوں چل دیے کہ پھر دوبارہ پلٹ کر خبر بھی نہیں۔“ مجھ پوچھو تو مجھے شرمندگی کے مارے ساری رات نیند نہیں آئی اور صبح ہوتے ہی تو نویر میاں کو لے کر تمہاری تلاش میں نکل پڑا۔ بھلا ہوان مرزا صاحب کا جنہوں نے ہمیں یہیں روکے رکھا اور نہ ہم تو تمہارے گھر جانے والے تھے۔“ میرے دوستوں نے ہمیں اچکا کر مجھ سے بڑے میاں کا تعارف پوچھا اور پھر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی شیخ صاحب نے رات کا تمام ماجرا من و عن بیان کر دیا۔ میں نے درمیان میں بڑی کوشش کی کہ وہ ”قلی“ والا حصہ حذف کر جائیں مگر کہاں جناب.....؟ وہ بھی پوری کہانی سن کر ہی دم لینے کو رکے۔ درمیان میں راجہ، بالا اور مشی جان بوجھ کر میرا ریکارڈ لگانے کے لیے شہو کے دیتے رہے ”اچھا..... تو انو نے آپ کا بکس بھی گھر تک پہنچایا.....؟ کمال ہے..... بھی کچھ بھی کہو..... ہمارا آیاں ہے بڑا فرمان بردار اور سعادت مند پچھے..... قلی ہو تو ایسا..... مزہ آگیا.....“ آخر میں تینوں شیطان یک زبان ہو کر یوں ”جیتے رہو بیٹا آیاں..... ہم سب کو تم پر فخر ہے.....“ شیخ صاحب اپنی ہی دھن میں بولے جا رہے تھے۔ ”ہاں ہاں..... تم سب کو اپنے دوست پر فخر تو ہونا ہی چاہئے..... آج کل کون کسی کے لیے اتنا کرتا ہے۔“ میں نے خون کے گھونٹ پیتے ہوئے اپنے گروہ کی جانب دیکھا اور شیخ صاحب سے پوچھا ”آپ نے صرف میرا شکر یہ ادا کرنے کے لیے اتنی زحمت کیوں اٹھائی..... مجھے جو ٹھیک لگا وہ میں نے کیا،“ لیکن شیخ صاحب اپنی ہی بات پر اڑے رہے اور آخر کار بڑی مشکل سے یہ وعدہ لے کر واپس پلٹے کہ میں پہلی فرصت میں ان کی طرف حاضری دوں گا۔ میری طرف سے راجہ اور بالے نے بڑے خشوع و خضوع سے انہیں یقین دلایا کہ مجھے شیخ صاحب کی طرف لے کر آنا اب ان کی ذمہ داری ہے۔ لہذا وہ بے فکر ہو کر گھر جائیں اور ہماری آمد کا انتظار اور استقبال کی تیاری کریں۔ ان کے جانے کے بعد میں اپنے دوست نما شمنوں کی طرف پلاتا ”یہ سب کیا تھا.....؟..... تم لوگ کبھی نہیں سدھ سکتے..... کیا ضرورت تھی ان کے سامنے یہ ساری بکواس کرنے کی.....“ لیکن وہ تینوں میری کوئی بات سنتے تباہ نہ..... وہ بمشکل اپنے قبیلوں کو روک روک کر مجھے کریدتے رہے ”اچھا انو..... یہ تو بتایا ر..... وہ تھی کیسی..... جس نے تجھے قلی کا خطاب دے دیا.....“ ”ہاں بیٹا..... ہم سب سمجھتے ہیں تیری اس ”خدمت خلق“ کو..... بننے کا بیٹا کچھ دیکھ کر ہی گرتا ہے۔ ضرور..... کچھ نہ کچھ تو کالا ہے دال میں.....“ مجھ بتانا..... کیسی دھتی تھی وہ اور وہ بڑی والی کیسی تھی.....“ میرا پارہ اب آسمان کوچھونے لگا تھا۔ آخر کار میں پھٹ پڑا ”کیا بتاؤں کیسی دھتی تھیں وہ..... وہ نوں درجن گز بھر ٹینٹ نما بر قلعوں اور چادروں میں ملبوس تھیں..... آنکھ بھی بس ایک ہی اور بقدرے ضرورت باہر نکال رکھی تھی..... بس..... ہو گئی تسلی..... یا مزید کچھ بتاؤں.....“ میری بات سنتے ہی ان تینوں کے ارمانوں پر اوس پڑگئی ”کیا..... بر قعے میں..... دھت تیرے کی.....“ ہم سب جانتے تھے کہ ہماری زندگیوں میں ایسے کسی شیل کا ک بر قعے والی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

اگلے چند روز نتیجہ نکلنے تک ہماری چھٹیاں تھیں لہذا میں نے راجہ اور بالے کوختی سے منع کیا کہ خبردار جو کسی نے مجھے صحیح گیا رہ بجے سے پہلے جگانے کی کوشش کی، لیکن کچھ خواب ہمیشہ ادھورے رہ جاتے ہیں۔ میں بھی اگلی صحیح جانے کس خواب کی نیلگوں وادی میں بھٹک رہا تھا کہ اچانک میرے خوابوں کے ریزہ گر کی آواز گوئی ”آیاں کے پچے چلو انھوں..... ابا نیچے بلا رہے ہیں تمہیں.....“ میں نے چند ہیلائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ ریحان کسی منکر نکیر کی طرح میرے سر پر کھڑا میرا کامندھا ہلا کر مجھے جگا رہا تھا۔ ”کیا مصیبت ہے..... چھٹی کے دن بھی ٹھیک سے نیند پوری نہ کرنے دینا کبھی.....“

”تم نیچے چلو..... ابا ساری نیندیں پوری کروائیں گے تمہاری.....“

میں نیچے اترتا تو ابا صحن میں یوں بے چینی سے ٹھیل رہے تھے جیسے میرا بی اے کا نتیجہ اعلان ہونے سے پہلے ہی ظاہر ہو گیا ہو۔ مجھے دیکھ کر ان کی تیوری چڑھتی ”یہ وقت ہے تمہارے جانے کا۔ دوپھر ہونے کو ہے“ میں چپ رہا۔ ابا نے میرے جواب کا انتظار نہیں کیا ”تمہارے پچھے ختم ہو گئے ہیں۔ اب آگے کیا ارادہ ہے.....؟“

”بھی نتیجہ آجائے..... تو پھر کچھ سوچوں گا.....“ وہ تیزی سے میری جانب مڑے۔

”کیا مطلب..... کیا نتیجہ آنے تک اگلے تین ماہ یونہی سارا دن چار پانی توڑتے رہو گئے.....؟..... جانتے ہو جب میں تمہاری عمر کا تھا تو میں صحیح چار بجے اٹھ کر پہلے اخبار بانٹتا تھا اور پھر صحیح سے شام تک تین ٹوٹھنڑ پڑھانے جاتا تھا۔ چھٹیاں بھی کبھی ضائع نہیں کی تھیں میں نے.....“ میں نے بے زاری سے ایک لمبی سانس بھری اور برآمدے میں پریشان ہی تھیں اسی کی طرف مد و طلب نظر وں سے دیکھا کہ وہ مجھے اگلے دو گھنٹے کے بے زار کن پکھر سے بچائیں۔ لیکن آج وہ بھی بے بسی نظر آرہی تھیں۔ آخر پونے گھنٹے کے نیمیت آمیز ”خطاب“ کے بعد ابا نے حکم صادر کر دیا کہ چونکہ ریحان نوکری کی تلاش میں صحیح سے شام کرتا ہے لہذا گھر کے خرچے میں ہاتھ بٹانے کے لیے مجھے بھی کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا، لیکن مصیبت تو یہ تھی کہ میں نے آج تک کوئی کام کیا ہی نہیں تھا۔ بہر حال اسی اور رافعہ کے اشاروں پر میں خاموش کھڑا رہا۔ مغل اعظم فرمان سنانے کے بعد گھر سے نکل گئے لیکن مجھے ایک نئی آزمائش میں ڈال گئے۔

میری نینداڑ چکلی تھی اور مجھے فوری طور پر اپنی تین کی کابینہ سے مشورے کے لیے کیفے فراق پہنچنا پڑا، لیکن وہاں بھی ریستوران کا خالی ہاں میرا منتظر تھا۔ تب مجھے یاد آیا کہ میں نے خود ہی تو سب دوستوں کو اپنی نیند میں مداخلت نہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ مجھے سوچوں میں گم بیٹھا دیکھ کر چچا فراق میری میز کی جانب چلے آئے۔ ”آج وہ باقی تین لفٹنے نظر نہیں آرہے۔ اور میاں..... پورے پونے چار سو کا ادھار چڑھ چکا ہے کھاتے میں..... پیے کب دو گے.....؟“ میں نے دکھی نظر ووں سے چچا کو دیکھا ”ایک تو میں پہلے ہی ابا کی وجہ سے اتنا پریشان ہوں اور سے آپ بھی میرا جی جلا رہے ہیں۔“ میری رومنی شکل دیکھ کر چچا فراق حسب معمول اپنا سارا ادھار بھول گئے۔ ”کیا ہوا..... کیا پھر تو قیر احمد نے تمہیں ڈانٹا ہے..... بھی دنیا بدل گئی لیکن ان کی ہیئت ماسٹری نہ گئی۔ اچھا چلو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں..... گرم گرم چائے پیو..... اور میں تمہارے لیے فریش کریم روں بھجواتا ہوں.....“ ایسے ہی تھے ہمارے چچا فراق باہر سے پھر اور اندر سے ریشم..... بالکل کسی اخروٹ کی طرح۔ کچھ ہی دیر میں میں وہیں بیٹھا چائے اور

فریش روں کے ساتھ اپنا غم غلط کر رہا تھا کہ اچانک باہر..... کچھ ہنگامے کی آوازیں ابھریں۔ میں نے کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی تو کیفے کے فرشی مرزا کو تین ہٹے کٹھنڈے لڑکوں کے ساتھ انجھتے پایا۔ میں لپک کر باہر لکھا تو سب سے آگے والا لڑکا مرزا کے گریبان پر باتھ ڈال چکا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے مرزا کا گریبان چھڑایا اور مرزا سے پوچھا ”یہ کیا چاہتے ہیں مرزا.....؟“، لیکن مرزا بے چارے کی حالت ایسی تھی کہ اس وقت وہ صرف ہوں ہاں کر کے ہی رہ گیا، لیکن لڑکوں کا سرغندہ شاید ایسی مداعلت کا عادی نہیں تھا۔ وہ غصے سے لال پیلا ہو کر غرایا ”اپنے کام سے کام رکھو..... ورنہ تمہاری بھی ہڈی ایک کر دیں گے.....“ میں نے کچھ جواب دیے ہنا مرزا کو ایک ہاتھ سے دھکیل کر پیچھے کر دیا اور خود اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ”ٹھیک ہے..... تو پھر پہلے مجھ سے ہی نبٹ لو..... اس کے بعد وقت بچے تو مرزا کی ہڈیاں بھی گن لینا.....“ ان تینوں کے چہرے زخم کھائے سانڈ کی طرح تن گئے۔ سرغندہ نے میری جانب قدم بڑھایا لیکن تھیجی نہ جانے کس طرف سے چچا فراق ہانپتے کا پتے ہمارے درمیان آکھڑے ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں پانچ سو کے تین نوٹ تھے جو انہوں نے سرغندہ کی جیب میں ڈال دیے اور اڑکے سے بولے ”معاف کرنا شوکت بیٹا۔ ذرا دیر ہو گئی..... دراصل میں تمہارے ہی کام سے ساتھ دو اے دوکاندار کے پاس گیا تھا۔ چلواب غصہ تھوک دو۔“

آنندہ درنہیں ہو گی.....“ لیکن شوکت نامی سرغندہ کی آنکھوں سے اب بھی شعلے نکل رہے تھے۔ ”یہ خدائی خدمت گارکوں ہے چچا..... کیا تم نے اسے بتایا نہیں کہ یہاں کس کی حکومت چلتی ہے۔“ چچا فراق نے معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کی۔ ”جانے دو شوکت بیٹا..... یہ بھی اپنا ہی بچہ ہے..... اسے ان معاملات کی خبر نہیں ہے..... میں اسے سمجھا دوں گا“، شوکت کی قہر بر ساتی نظریں اب بھی مجھ پر ہی گڑی ہوئی تھیں ”تم ہی سمجھا دو تو اچھا ہے..... اور جتنی جلدی سمجھ جائے اتنا ہی بہتر ہے..... ورنہ میں نے سمجھا یا تو.....“ اتنے میں شوکت کے پیچھے کھڑے لڑکوں میں سے ایک بولا ”جلدی کر شوکی..... ابھی بڑی وصولی باقی پڑی ہے۔“ شوکت نے آخری بار نظر بھر کے مجھے دیکھا اور زیریں کچھ بڑھاتے ہوئے وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ اس تمام عرصے میں چچا فراق نے میرا دیاں بازوختی سے جذب کر کچھ رکھا تھا جیسے انہیں خدا ہو کہ میں جذبات میں کچھ کرنہ بیٹھوں۔ ان کے جانے کے بعد میں مرزا کی طرف پلٹا۔ ”یہ کیا ماجرا تھا.....؟..... اور یہ لوگ اس طرح دھماکا کیوں رہے تھے جیسے کوئی پرانا ادھار باقی ہوان لوگوں کا.....“

چچا نے بات ثالی ”آیاں بیٹا تم ان باتوں میں نہ پڑو۔ ہے کوئی پرانا حساب کتاب ان لوگوں کا..... ایسے لوگوں کے آڑے نہیں آیا کرتے۔“

ہاں بھی مرزا..... تم ذرا میرے ساتھ چلو..... کچھ ضروری حساب کرنا ہے۔ پچھلے ماہ کا.....“

صاف لگ رہا تھا کہ وہ مرزا کو بھی کسی بہانے وہاں سے لے جانا چاہتے ہیں تاکہ میں اسے نہ کرید سکوں۔ ان دونوں کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی راجہ پارٹی آپنچی۔ میں نے کچھ دیر پہلے کا سارا واقعہ انہیں تفصیل کے ساتھ بتایا تو وہ تینوں بھی سوچ میں پڑ گئے۔ ٹھیک اسی وقت سڑک پر وہی تین لڑکے پرانی سی ولیزیز جیپ میں تیزی سے سکریج لگاتے ہوئے گزر گئے۔ میں نے ان کی طرف اشارہ کیا ”یہی تین سورا تھے وہ.....“ بالا ایسے موقعوں پر زیادہ جذباتی ہو جاتا تھا۔ ”چلو انو..... ان کا پتہ لگاتے ہیں..... ان کی تو.....“ میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا دیا۔ ”ان کا بھی پتہ چل جائے گا۔ پہلے مرزا کو گھیرنا ہو گا اکیلے میں..... کیونکہ چچا فراق کے سامنے وہ کچھ نہیں بتائے گا.....“ اور پھر ٹھیک کیفے بند ہونے کے وقت پر ہم چاروں کاؤنٹر کے سامنے ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔ پیسے گنتے ہوئے مرزا نے ہم چاروں کو یوں ساکت کھڑے دیکھا تو وہ گھبرا سا گیا ”کیوں

بھی..... کیا ارادے ہیں.....؟.....؟ ”فشنی نے اپنی آواز گھمپیر بناتے ہوئے اسے دھکایا ”آج کی جتنی بھی کمائی ہے ..... نکال کر سامنے کا ونڈر پر رکھ دو..... ”مرزا گھنگھایا۔ ”کیوں مذاق کرتے ہو۔ میرا دل ویسے ہی بڑا کمزور ہے ..... ”راجہ بولا ”ٹھیک ہے تو پھر آج جن لڑکوں کو پچانے پیسے دیے تھے۔ ان کا سارا کچا چٹھا بتا دو ورنہ آج سے ہم بھی پیسے جمع کرنے کا وہی طریقہ آزمائیں گے ..... ”مرزا ان لڑکوں کا ذکر سن کر بدحواس سا ہو گیا اور اس نے جلدی میں واہیں باہمیں نظر دوڑا لی۔ میں نے اسے اطمینان دلایا۔ ”فکر نہ کرو ..... فراق پچا گھر جا چکے ہیں..... ”مرزا اب بھی خوف زدہ ساتھا۔ ”لیکن اگر مالک کو پتہ چلا کہ میں نے .....؟ ”

”فکر نہ کرو ..... انہیں کچھ پتہ نہیں چلے گا..... ”مرزانے جلدی بڑے چھوٹے نوٹ الگ کر کے ان پر بڑی بینڈ چڑھایا اور تجویز میں رکھ کر ہماری جانب پلٹا۔ اس کی آوازاب بھی سرگوشی نہ تھی۔

”وہ تینوں رنگا بھائی کے آدمی تھے۔ ہفتہ اکٹھا کرنے آئے تھے۔ ”راجہ نے حیرت سے اسے دیکھا ”رنگا بھائی ..... یہ رنگا کون ہے مرزا جی۔ ”مرزانے جلدی سے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ ”مشش ..... آہستہ بولو ..... دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ تم لوگ رنگا کو نہیں جانتے ..... سارنگا عرف رنگا بھائی۔ اس پورے علاقے کا ان داتا ہے وہ ..... اس کی مرضی کے بغیر چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی اس ایریا میں..... ”

”کیوں ..... وہ اس علاقے کا وزیر ہے کیا ..... اور پہلے تو کبھی اس کا نام نہیں سنائے ہم نے ..... ”

”ارے میاں وزیر خود رنگا بھائی کے گھر کا پانی بھرتے ہیں ..... اور پہلے وہ یہاں ہوتا ہی کب تھا جو تم اس کا نام سنتے ..... رنگا ایسے چھوٹے شہروں کی بادشاہت قبول نہیں کرتا۔ جانے کیا بات ہے جو اس مرتبہ وہ یہاں آ کر نکل گیا ہے۔ ”ہم سب حیرت سے مرزا کی طرف دیکھ رہے تھے جو سارنگا کا تعارف یوں کروارہاتھا جیسے وہ کوئی دیومالائی کردار ہو مجھ سے رہا نہیں گیا ”لیکن اگر وہ ایسا ہی کوئی لاث صاحب ہے تو اس کے کارندے گلی گلی دوکان دوکان یہ چندہ کیوں اکٹھا کرتے پھرتے ہیں .....؟ ”مرزانے اپنا سر کھجایا ”اب یہ تو اللہ ہی بہتر جانے ..... اور پھر کے پتہ کہ یہ ہفتہ وصولی سارنگا کے ہی حکم سے ہوتی ہو یا پھر یہ لوٹنے لپڑے اس کے نام پر یہ بدمعاشی کرتے ہوں بہر حال ..... ایک بات تو طے ہے کہ جو بھی یہ ہفتہ دیتا ہے پھر علاقے کے باقی تمام غنڈوں، چوراچکوں بشمول پولیس ..... کوئی بھی ہفتہ دینے والے دوکاندار پر بری نظر نہیں ڈال سکتا ..... پھر وہ بندہ سارنگا کی ذمہ داری بن جاتا ہے ..... ”راجہ جو بہت دیرے سے یہ ساری کہانی برداشت کر رہا تھا بے زار ہو کر بولا ”مجھے تو یہ سب کسی انتہائی پٹی ہوئی اور بوگس فلم کا پاٹ لگتا ہے۔ یہ رابن Robin Hood تاپ کروار آج کل کہیں نہیں پائے جاتے اور مرزا جی ..... تم یہ ہفتہ اگر ہم چاروں کو باقاعدگی سے ادا کرو تو آج سے کیفے فراق اور تمہاری جان کی ذمہ داری ہماری ..... کسی کی کیا مجال جو اس کیفے کی طرف آنکھ بھی اٹھا کر دیکھ سکے ..... ”

مرزانے کا نوں کو ہاتھ لگائے۔ ”تم لوگوں کو مذاق سو جھر رہا ہے اور میں نے خود اپنی آنکھوں سے یہ بھتہ نہ دینے والوں کے گھر اور کاروبار

تاباہ ہوتے دیکھے ہیں۔ خدا کے لیے اس ساری بات کا ذکر مالک سے ہرگز نہ کرنا۔ ورنہ میری خیر نہیں ..... ”

مرزا ہمیں گھری سوچ میں گم چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ شہر کی بیان بجھ چلی تھیں اور صرف سرکوں کے کنارے گلی زرد بیوں کی روشنی آس پاس پھیلی ہوئی تھی۔ اس وقت ہم چاروں کے ذہن میں ایک ہی بات گردش کر رہی تھی لیکن ہم چاروں میں سے کوئی بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ یہی ایک بات

ہماری زندگیوں کا رخ پلٹنے والی تھی۔

اگلی صبح راجہ میرے جانے سے پہلے ہی گلی میں موجود تھا۔ میں نے اسے چھت سے وہیں اوپر آنے کا اشارہ کیا۔ راجہ ساری معلومات لے کر آیا تھا۔ بختہ یعنے والے لڑکے ہر جمعرات کو ہمارے محلے کے اطراف اسی پرانے ماذل کی ولیز جیپ میں آتے تھے۔

ہم فیصلہ کر چکے تھے کہ اگلے ہفتے ہمیں کیا کرنا ہے۔ میں اور راجہ سر جوڑے اپنی منصوبہ بندی میں اس قدر کھوئے ہوئے تھے کہ ہمیں ریحان

کے چھت پر آنے کی خبر ہی نہیں ہوئی۔ اس نے ہمیں یوں سرگوشیاں کرتے دیکھا تو مغلکوں سا ہو گیا۔ ”یہم دونوں کون سے منصوبے کی کڑیاں جوڑ رہے ہو۔ آیاں خدا کے لیے اب مزید کوئی کارنامہ نہ کر بیٹھنا۔ ابا پہلے ہی تم سے بہت ناراض ہیں۔۔۔ اس بارہہ تمہاری کوئی غلطی معاف نہیں کریں

گے۔۔۔“ میں نے ریحان کی بات حسب معمول ہوا میں اڑا دی۔۔۔ ”اچھا اچھا۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ اب تم میرے اباٹانی بننے کی کوشش نہ کرو۔ مجھے پڑتے ہے کہ کیا ٹھیک ہے اور کیا غلط۔۔۔“ اتنے میں نیچے گلی میں بالے کی چھت پھٹی کا سائلسز گنجائی اور میں اور راجہ ریحان کے منع کرنے کے باوجود چھت سے ملخت گلی میں اترتے پاسپ سے لٹکتے ہوئے گلی میں کو دیکھے۔۔۔ یہ ہمارا خاص شارٹ کٹ تھا۔ بالے اور مشی نے بھی اپنا کام نپانا لیا تھا۔ بالے نے خبر دی

”سب پتہ چل گیا ہے۔۔۔ وہ ہفتہ یعنی کی ابتداء سادات محلے کی چوڑی گلی سے کرتے ہیں۔۔۔ کل سترہ دو کانڈا رجھتہ دیتے ہیں انہیں وہاں۔۔۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ تو پھر ہمیں ایک مرتبہ سادات محلے کی چوڑی گلی کے آس پاس کے علاقے کا جائزہ بغور لینا ہو گا تاکہ ہم یہ فیصلہ کر سکیں کہ ان سورماوں کو کہاں روکنا ہے۔“ میری بات پر سمجھی نے سر ہلائے اور کچھ دیر بعد ہی ہم سادات محلے کی چوڑی گلی سے مسلک گلیوں کے چکر کاٹ رہے تھے۔

تیری گلی جہاں بختہ دینے والا صرف ایک دو کانڈا رجھتہ، نبٹتا کچھ سنسان تھی۔ ہم نے سارنگا کے غندوں کو روکنے کے لیے یہی گلی منتخب کر لی۔ ابھی ہم دیگر جزئیات طے کر ہی رہے تھے کہ اچانک میرے کانڈے پر کسی کے ہاتھ کا نرم دباؤ محسوس ہوا۔ ”واہ آیاں صاحب۔۔۔ بڑی راہ دکھائی آپ نے۔۔۔ گلتا ہے وعدہ کر کے بھول گئے۔۔۔“ میں چونک کر پلٹا۔ میرے سامنے تنوری کا مسکرا تا چہرہ تھا۔ ”ماموں روزانہ آپ کا انتظار کرتے ہیں۔۔۔ گلتا ہے آپ نے ہماری خطا بھی تک معاف نہیں کی۔۔۔“

”نہیں نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ بس امتحانات کی مصروفیت میں الجھے رہے ہم سب۔۔۔“

”ٹھیک ہے اگر ایسی بات ہے تو آپ ابھی اسی وقت میرے ساتھ گھر چلیں ماموں کو پتہ چلا کہ آپ سادات محلے تک آ کر واپس لوٹ گئے ہیں تو وہ مجھ سے بہت ناراض ہوں گے۔۔۔“ میں نے تنوری کوٹانے کی بہت کوشش کی لیکن لگتا تھا وہ مجھے ساتھ لے جائے بنا نہیں جائے گا۔ میں نے اپنے دوستوں کو اشارتاً اپنا کام جاری رکھنے کا کہا اور خود تنوری کے ساتھ چل پڑا۔ تنوری مجھے چند لمحوں کے لیے دروازے کے باہر انتظار کرنے کا کہہ کر گھر کے اندر گیا اور دوسرے ہی لمحے شیخ صاحب لپکتے جھکتے دروازے سے برآمد ہوئے اور گلے ٹکوئے کرتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ کر گھر کے اندر لے گئے۔

کچھ محن والا چھوٹا سا صاف ستھرا کوارٹر تھا۔ جس میں چاروں جانب پھلوں کی کیاریاں بنی ہوئی تھیں جن میں سرخ، پیلی اور سفید گلاب خوبصورتی سے ترشی ہوئی باڑھ میں بٹنگے ہوئے تھے۔ برآمدے کو بزرگ کی جافری سے بند کیا گیا تھا۔ شیخ صاحب مجھے نفاست سے بھی ایک چھوٹی سے بیٹھ کیا میں

لے آئے۔ ”کیا میاں۔۔۔ گلتا ہے تم بھول گئے شیخ کیر کو۔۔۔“ شیخ صاحب کافی دیر اپنے دکھڑے ناتے رہے۔ انہی کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ وہ

کتاب گھر کی پیشکش

کچھ محن والا چھوٹا سا صاف ستھرا کوارٹر تھا۔ جس میں چاروں جانب پھلوں کی کیاریاں بنی ہوئی تھیں جن میں سرخ، پیلی اور سفید گلاب خوبصورتی سے ترشی ہوئی باڑھ میں بٹنگے ہوئے تھے۔ برآمدے کو بزرگ کی جافری سے بند کیا گیا تھا۔ شیخ صاحب مجھے نفاست سے بھی ایک چھوٹی سے بیٹھ کیا میں

لے آئے۔ ”کیا میاں۔۔۔ گلتا ہے تم بھول گئے شیخ کیر کو۔۔۔“ شیخ صاحب کافی دیر اپنے دکھڑے ناتے رہے۔ انہی کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ وہ

اپنے اکلوتے بیٹے حمید کو نور پورا پنی بچی کچھی متاع کے حساب کتاب کے لیے چھوڑ آئے تھے۔ یہاں وہ اپنی گھروالی اور دنوں بیٹیوں کے ساتھ آئے تھے۔ چھوٹی بیٹی گہنا کا نام تو میں سن چکا تھا۔ البتہ بڑی کا ذکر کرتے ہوئے شیخ صاحب کی آواز کچھ بھرا سی گئی ”بڑی کا نام ستارہ ہے میاں..... لیکن فسیب کے معاملے میں اس کا تارہ بہت سیاہ لکلا۔ شادی کے تیرے میں چل بسا، اور گزشتہ ڈیڑھ سال سے وہ ایک بیوہ کی زندگی گزار رہی ہے۔ خدا کسی کی بیٹی کو بھی بیوہ نہ کرے۔“ ما جوں سو گوار سا ہو گیا۔ شیخ صاحب مجھ سے مذہرات کر کے کمرے سے باہر نکل گئے۔ تنویر شاید پہلے ہی چائے کے لوازمات وغیرہ کے سلسلے میں زنانے میں ہاتھ بثارہ تھا۔ مجھے وہاں سے نکلنے کی جلدی تھی کیونکہ باہر میرے دوست میری راہ تک رہے تھے۔ اچانک درمیانی دروازے کی جانب سے کچھ آہٹ بلند ہوئی، اور کسی کی شرارۃ بھری ہفتگتی آواز گنجی۔

”اوہ..... تو وہ والے آیاں صاحب تشریف لائے ہیں..... جو قلی نہیں ہیں.....“  
میں چونک کر پلٹا۔

## کتاب گھر کی پیشکش کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفوں کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور لوچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ کتاب گھر کی پیشکش

۱۔ کتاب گھر کی پیشکش کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچائیے۔

۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/ کتاب کی کپوزنگ (ان چیز فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجئے۔

۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو ووڈ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک ووڈ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

## باب 4 کتاب گھر کی پیشکش

دروازے پر پڑے پر دے کی آڑ میں ضرور چھوٹی والی گہنا ہی تھی۔ کیونکہ بڑی والی کی تو میں نے کبھی آواز تک نکلتے نہ سن تھی۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا ”جی۔۔۔ فرمائی۔۔۔ مزید کچھ سامان ڈھونا ہو تو میں حاضر ہوں۔۔۔“ دوسری جانب سے بے اختیار دبی دبی ٹھی کی آواز ابھری۔

”نہیں۔۔۔ فی الحال تو ایسی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔ البتہ جب کبھی مزدوری کا کچھ کام آن پڑا تو آپ کو زحمت ضرور دیں گے۔۔۔“

پر دے کے پیچھے مزید کچھ چھر ہوئی جیسے کوئی اور بھی وہاں موجود ہو اور وہ گہنا کو دبی آواز میں سرزنش کر رہا ہو۔ پھر گہنا کی ہی آواز آئی۔

”آپ آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔۔۔“

گویا گہنا سے بڑی ستارہ بھی وہیں موجود تھی۔ چند لمحے سکوت کے گزرے اور پھر قدرے گھبرائی سی آواز سنائی دی۔

”ہم سب آپ سے اس روز کے رویے کی مغدرت چاہتے ہیں۔۔۔ گہنا کی زبان کو لگانہ نہیں ہے۔ ابا کے لاڈ پیارے اسے بگاڑ دیا ہے، لیکن امی گہنا کی اس رات کی حرکت پر بہت نادم ہیں۔۔۔“

”آپ لوگ خواہ مخواہ ہی پریشان ہو رہے ہیں۔۔۔ وہ بات تو اسی رات ختم ہو گئی تھی۔۔۔ رہی بات گہنا کی تو میں ایسی ”نادان بچیوں“ کی بات کا برائیں منایا کرتا۔ اپنی امی سے کہیں دل پر بوجھنے لیں۔“

میری ”نادان بچی“ والی اصطلاح پر اندر شاید گہنا پر کچھ چوٹ ہو گئی، تبھی وہ ایک دم بولی ”میں نادان بچی نہیں ہوں۔۔۔ تھرڈ ائیر میں پڑھتی ہوں۔۔۔ سمجھے آپ۔۔۔ اور مجھے بالکل پسند نہیں کہ ابایا کوئی اور مجھے نادان بچی کہے۔۔۔“ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ تیرنٹانے پر لگا تھا۔ اتنے میں بیرونی دروازے پر برتوں کی آہٹ ہوئی اور شیخ صاحب تنیر کے ساتھ چائے کی ٹرے اور کیک، بسکٹ وغیرہ لیے اندر داخل ہوئے۔ درمیانی کر دے کے پر دے کے پیچھے خاموشی چھا گئی۔ چائے کے دوران شیخ صاحب کے دل میں چھپا سوال زبان پر آئی گیا۔

”آیاں بیٹا۔۔۔ ایک بات کی سمجھنہیں آئی۔۔۔ تمہارا اپنا گھر خدا کے فضل سے قائم وسلامت ہے۔۔۔ تو پھر اس رات تم وہاں اس ہوٹ کے باہر برستی بارش میں فٹ پاٹھ پر کیوں سور ہے تھے؟“

”اس لیے کہ میرے ابا نے اس رات مجھے گھر برد ہونے کا حکم دے دیا تھا۔۔۔“ شیخ صاحب شاید ایسے کسی جواب کی توقع نہیں کر رہے تھے لہذا اچھل ہی پڑے ”کیا مطلب۔۔۔ یعنی کہ۔۔۔ لیکن کیوں۔۔۔ یعنی تم تو بڑے فرمانبردار بچے ہو۔۔۔“

”شکریہ۔۔۔ لیکن میرے ابا کے خیالات آپ سے کافی مختلف ہیں۔۔۔“ میں نے بنا کچھ چھپائے تفصیل سے شیخ صاحب کو اس رات کی تمام رواداد بتا دی۔ تنوری اور شیخ کبیر حیرت سے سنتے رہے۔ پھر شیخ صاحب نے ہی بات جوڑی۔ ”مجھے تمہاری صاف گوئی بہت اچھی گئی۔ ماں باپ کا اپنی اولاد کے لیے فکر مند ہونا بھی ایک معمول کی بات ہے۔ مجھے امید ہے کہ جب تم کسی مقام پر پہنچ کر دکھاؤ گئے تو تمہارے یہی ابا خبر سے لوگوں کو

تمہارے بارے میں بتایا کریں گے۔ ”تویر نے مجھے بتایا کہ وہ مقامی ہائی سکول میں تاریخ اور جغرافیہ پڑھاتا ہے اور شام کو بچوں کو ٹیوشن بھی دیتا ہے۔ اس نے مجھے بھی پیش کش کی کہ اگر میں کچھ پیسے کمانا چاہوں تو وہ میرے لیے کوئی ٹیوشن ڈھونڈ سکتا ہے۔ بلکہ اسے ان دنوں بھی اپنے کسی جانے والے کی خواہش پر کوئی استاد درکار تھا۔ میں نے تویر کو بتایا کہ میری پڑھائی لکھائی سے کچھ خاص بھی نہیں ہاں البتہ اگر اردو کے لیے کوئی ٹیوشن درکار ہوتا شاید میں پڑھا سکوں۔

میری بات سن کر تویر کا چہرہ کھل اٹھا۔ ”بہت خوب..... پھر تو سمجھو کام بن گیا۔ بارہویں جماعت کی ایک طالبہ کے لیے اردو کا استاد درکار ہے۔ مینے کے دور ہزار ملیں گے۔ شاید کچھ زیادہ بھی طے ہو جائیں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کو اس طالبہ کے گھر جانا ہوگا۔ سواری کا انتظام بھی وہ لوگ خود ہی کریں گے..... ”مجھے اپنے ابا کی آخری وارنگ یاد آئی اور میں نے ہائی بھرلی۔ تویر نے وعدہ کیا کہ وہ اگلے روز ہی میری ٹیوشن پکی کروادے گا۔ مجھے اپنے چوبیں گھنٹوں میں سے ایک گھنٹے کی قربانی دینا تھی، لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے عرقید کی سزا سنائی جا رہی ہو۔ پابندی بھی تو ایک قید ہی ہوتی ہے بلکہ شاید خود کو پابند کرنا قید سے بھی بڑی قید ہوتی ہے۔ ہماری تمام زندگی کا فلسفہ اور سزا جزا کا تمام تصور ایک اسی ”پابندی“ کے حمور کے گرد ہی تو گھومتا ہے۔

کافی دیر بعد مجھے شیخ صاحب نے صرف اس شرط پر جانے کی اجازت دی کہ میں اب ان کے ہاں آتا جاتا رہوں گا۔ میں رخصت ہونے کے لیے کھڑا ہوا تو درمیانی کرے کے پردے کے پیچھے سے کسی خاتون کے کھانے کی آواز سنائی دی۔ شیخ صاحب بے تکلفی سے بولے ”آ جائیں شیخانی جی..... آیاں بھی تویر کی طرح اپنا ہی بچہ ہے۔“ پردے کے پیچھے سے شیخ صاحب کی گھروالی برآمد ہوئیں۔ آج وہ صرف ایک بڑی سی چادر سے خود کو ڈھانپے ہوئے تھیں۔ انہوں نے میرے سلام کے جواب میں آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا کیں دیں اور چلتے وقت خواہش ظاہر کی کہ وہ اور ان کی بچیاں اس نئے ماحول میں کسی اپنے اور شناساچھرے کی رفاقت کے بغیر اداں سے ہو گئے ہیں لہذا میں اپنے گھر کی خواتین کو لے کر ضرور ان کے ہاں آؤں۔ میں نے انہیں امی اور چھوٹی رافعہ کے بارے میں بتایا اور انہیں بھی اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔

جب میں شیخ صاحب کے گھر سے باہر نکلا تو وہ تینوں اسی گلی کی ٹکڑ پر میرا منتظر کر رہے تھے۔ رجھ سے رہانے گیا ”خیر تو تھی..... بڑی دیر لگا دی ہم تو سمجھے تھے کہ شیخ صاحب نے تمہیں گھر داما دی ہی سونپ دی ہے.....“

”بکومت..... یہ بتاؤ سارا آگا چیچھا دیکھ لیا ہے.....؟.....“

”ہاں..... چاروں اطراف کا جائزہ لے لیا ہے ہم نے..... لیکن یار انو..... ہم سب نے فیصلہ کیا ہے کہ تم ان کے سامنے نہیں آؤ گے۔ کیونکہ وہ تمہیں پہلے دیکھے ہیں اور ہم اپنے محلے سے اتنی دور انہیں اسی لیے روک رہے ہیں کہ وہ اس معاملے کا کوئی بھی سرا کیفے فراق سے نہ جوڑ سکیں۔ بلکہ ہم تینوں بھی چہرے چھپا کر ان کا راستہ روکیں گے.....“

مشی لاٹائی جھگڑے سے ذرہ کتراتا تھا۔ اس کے چہرے پر اب بھی پریشانی کے آثار تھے، لیکن یار کیا انہیں بختہ لینے سے روکنے کے لیے یہ سب کرنا ضروری ہے..... ہم لوگ ویسے ہی ان سے جا کر بات کیوں نہیں کر لیتے.....“

”وہت تیرے کی.....“ راجہ نے اس کے سر پر ایک چپت رسید کی۔

”اور تم کیا سمجھتے ہو کہ ہماری اس درخواست پر کہ جناب عالیٰ برہ مہربانی آپ ہمارے علاقے سے آئندہ اگر بحثہ اکٹھانہ کریں تو بڑی مہربانی ہو گی..... وہ مسکرا کر کہیں گے کہ عالیٰ حضور..... آپ لوگوں نے تو ہماری آنکھیں کھول دیں..... آج کے بعد اگر ہم آپ کے علاقے میں قدم دھریں تو جو چور کی سزا وہ ہماری.....“ مجھے راجہ کے انداز پر بھی آگئی۔ بالے نے بڑے بزرگوں کی طرح مشی کو سمجھایا۔

”مشی بیٹا..... وہ چھٹے ہوئے غندے ہیں..... بات بے بات چاقو چلا دینے والے..... ان سے ہمیں ان کی زبان میں ہی بات کرنا ہو گی..... اگر تمہیں ڈر لگ رہا ہے تو اس روز تم آرام سے گھر میں بیٹھ کر اپنی امی کے ہاتھ کی بنائی بریانی کھانا اور ہمیں یاد کرنا.....“ مشی کی امی بریانی بہت اچھی بناتی تھیں لیکن مشی کی سبھی کمزوری اس کی چڑبھی تھی۔ وہ بھتنا کر بولا ”ڈرتی ہے میری جوتی..... جو ہو گا دیکھا جائے گا.....“ بالے اور راجہ نے نظر بچا کر مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو آنکھ ماری۔ ان کا مقصد حل ہو چکا تھا۔

میں گھر پہنچا تو امی اور رافعہ، ریحان سمیت صحن میں ہی بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ امی نے مجھے ڈانتا۔ ”انو..... تو یہ سارا دن گھر سے باہر کھاں بھکلتا پھرتا ہے..... کبھی دو گھنی ماں کے ساتھ بھی بیٹھ جایا کر..... جارافعہ..... بھائی کے لیے گرم چائے لے آ.....“ میں نے ریحان سے پرانا بدله چکایا ”امی..... آپ کے پاس آپ کی یہ بڑی بیٹی ریحانہ جو ہر وقت موجود رہتی ہے..... ایسے میں بھلا آپ کو آیاں کی کیا ضرورت.....“ امی مسکرائیں۔ ریحان کو غصہ آ گیا۔ ”ہاں ہاں بیٹا..... ازاں اونماق..... کم از کم گھر میں رہ کرaba کا گھر کے کسی کام میں ہاتھ تو بٹاتا ہوں ناں..... تمہاری طرح تو نہیں ہوں..... گھر کانہ گھاث کا.....“

”فکر نہ کرو ریحان میاں..... اب تمہارے اس طعنے کا بھی توڑ کر لیا ہے ہم نے..... آیاں احمد کو ایک ٹیوشن مل گئی ہے..... مبلغ دو ہزار روپے کی..... کبھی کتاب و تاب خریدنے کے لیے پیسے ویسے چاہئے ہوں تو مانگ لینا..... آیاں ملکتوں کو منع نہیں کیا کرتا..... اب بولو..... کون ہوا گھر کانہ گھاث کا..... ہاں.....“ امی خوشی کے مارے کھڑی ہو گئی۔ ”سچ..... انوچ بتا..... کہیں تو بڑے بھائی کے ساتھ دل گئی تو نہیں کر رہا.....“ رافعہ کے ہاتھ میں بھی گرم چائے کا کپ چھلک سا گیا۔

”سچ بھائی..... آپ ٹیوشن پڑھانے جایا کریں گے..... وہ..... کتنا اچھا لگے گا ابا کو یہ سن کر.....“ ریحان کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔ ”ٹیوشن..... لیکن کھاں..... اور مضمون کیا ہو گا ٹیوشن کا.....“ میں نے گول مول لفظوں میں بتایا کہ میرے کوئی جاننے والے ہیں جنہوں نے اردو ٹیوشن کا بندوبست کروایا ہے، اور ایک آدھ دن میں باقی تفصیلات بھی طے ہو جائیں گی۔ پل بھر میں گھر کے اندر عید کا سماں ہو گیا۔ ان سب کے لیے یہ خبر کسی عید کے چاند کی نوید سے کم نہیں تھی کہ بقول ابادیا جہاں کے ناکارہ آیاں نے بھی آخر کار کوئی کام کرنے کی ہامی بھرہی لم تھی۔ امی کو فوراً فکر لگ گئی کہ ان کا ہونہا سپوت کل کون سے کپڑے پہن کر ٹیوشن پڑھانے جائے گا۔ انہوں نے فوراً چھوٹی کو میرے سمجھی کرتے استری کرنے کا حکم دے دیا۔ ریحان میری بڑی ہوئی شیودیکھ کر چلایا ”خداء کے لیے اب تو اپنی یہ حالت سدھارلو۔ چھوٹی جلدی سے بھاگ کر میری دراز سے نیاریز را اور شیوگ کریم لے آؤ۔ آج ہم سب مل کر اس کی شیوکریں گے..... ایسے تو یہ مانے گا نہیں.....“ وہ آفت کی

پر کالہ بھی جیسے ریحان کی طرف سے اشارے کی منتظر تھی۔ اگلے ہی لمحے ریحان مجھے جکڑ پکا تھا اور رافعہ اندر سے شیو کا سامان لیے بھاگی چلی آ رہی تھی۔ امی ارے ارے ہی کرتی رہ گئیں اور ان دونوں نے میرا چہرہ جھاگ سے بھروسیا۔ میں چلاتا رہا کہ ہلکی بڑی ہوئی شیو میں میں کچھ زیادہ سنجیدہ استاد لوگوں کا پروہاں کوئی میری مستاتب نا۔۔۔ ایک لمحے کے لیے ریحان کی گرفت مجھ پر کم زور ہوئی تو میں زور لگا کر اس کی گرفت سے نکل گیا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ چھوٹی ہاتھ میں شیونگ مگ اور برش اور ریحان ریز رتھے میرے پیچھے پیچھے گول دارے میں بھاگ رہے تھے اور میں امی کو درمیان میں آڑ بنا کر پورے صحن میں ان سے بچتے کے لیے چکر کاٹ رہا تھا۔ ہم سب چیخ رہے تھے۔ چلا رہے تھے نہ رہے تھے اور امی اپنی بُنی چھپا کر ہم سب کو ڈانٹ رہی تھیں۔ اچاک صحن کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور دروازے کے پیچوں بیچ کھڑے ابا کی دھاڑ گئی۔ یہ سب کیا ہڑبوگ مچار کی ہے تم لوگوں نے.....؟“

ہم سب ابا کی آواز کریوں جامد ہو گئے جیسے کسی نے ریموٹ کنٹرول سے ساکت کا بٹن دبادیا ہو۔ اپنے اپنی چھڑی بوكھلائی سی امی کے حوالے کی اور پھر گرجے ”گھر کو چڑیا گھر بنار کھا ہے..... ریحان..... کم از کم تم سے مجھے اسی امید نہیں تھی.....“ گویا مجھ سے تو اپا نے کبھی کوئی اچھی امید باندھی ہی نہیں تھی۔ چھوٹی نے جلدی سے ابا کی شیر و انی سن جھالی ”ابا پتہ ہے آیاں بھیا کو دو ہزار روپے کی ٹیوشن مل گئی ہے.....“ ابا کو شاید زندگی میں پہلی بار میری جانب سے کوئی خوشی کا جھنکا لگا ”کیا.....؟؟؟“ امی نے آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا ”میرا انواب ذمہ دار ہوتا جا رہا ہے.....“ شاید یہ میرا وہم تھی ہو، پر جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ ابا کی آنکھوں میں کچھ نبھی سی جھملائی ہو، اور پھر وہ ہوا جو بچپن کے بعد آج تک کبھی میرے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ اپا نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی ”جیتے رہو.....“ پھر وہ صحن میں رکے بنا اندر چلے گئے۔ اچھا ہی ہوا ورنہ شاید کچھ ہی دیر میں سب ہی وہاں رو پڑتے اور پھر دوسرے لمحے ہی ان کی اندر کمرے سے جھلائی ہوئی تیز آواز آئی۔۔۔ ارے بھئی۔۔۔ یہ میرے سلیپر پھر کون پہن گیا۔۔۔ کتنی بار منع کیا ہے اس نالائق آیاں کو کہ میرے چپل نہ پہنا کرے۔۔۔“ امی، ریحان اور چھوٹی تینوں کی نظر بیک وقت میرے پیروں کی جانب اٹھی اور میں ابا کے چپل وہیں صحن میں اتار کر ننگے پاؤں چھت کی سیڑھیوں کی طرف دوڑا۔ وہ سب زور سے نہ پڑے۔ کاش اس وقت خبر ہوئی کہ ان مسکراہٹوں کی عمر اتنی مختصر ہوتی ہے تو میں وقت کو روک دیتا۔۔۔ لیکن وقت بھلاکی کے روکے سے کب رکا ہے۔۔۔

اگلے روز تنویر سے طے کردہ وقت پر میں کیفے فراق پہنچا تو میری چند اال چوکڑی بھی وہیں موجود تھی۔ راجہ نے مجھے دیکھ کر سیئی بجائی۔۔۔ باں نے اٹھ کر چاروں طرف طواف کر کے مجھے غور سے دیکھا اور مشی نے شکوہ کیا ”یار انو۔۔۔ تو نے شادی کر لی اور ہمیں بتایا بھئی نہیں۔۔۔“ میں نے اسے گھوارا ”ہوش میں تو ہو۔۔۔ میں نے کب شادی کی۔۔۔؟“ راجہ نے ہونٹ سکیڑے ”یہ چھپاتی شیو۔۔۔ یہ شکارے مارتانیا کرتے۔۔۔ یہ ریحان کی وا سک۔۔۔ ہم تمہیں دولہا نہ کہیں تو کیا کہیں۔۔۔“

”بکومت۔۔۔ مجھے آج ٹیوشن پڑھانے جانا ہے دعا کرو سب ٹھیک رہے۔۔۔ زندگی میں پہلی مرتبہ آج ابا مجھے ریحان کی طرح رخصت کرنے صحن تک آئے تھے۔۔۔“ ان تینوں نے باقاعدہ دعا کے لیے ہاتھ فضا میں بلند کر دیے۔ ٹھیک اسی لمحے ان تینوں کے اٹھے ہوئے ہاتھوں کے پس مظفر میں مجھے تنویر کیفے فراق کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوتا کھائی دیا۔ سلام دعا کے بعد اس نے بتایا کہ جس گھر میں مجھے ٹیوشن پڑھانے

جانا ہے وہاں کا ڈرائیور مجھے لینے آچکا ہے اور اب روزانہ وہ یہیں کیفے فرماق سے ٹھیک چار بجے شام مجھے لینے پہنچ جائے گا اور دو گھنٹے کی ٹیوشن کے بعد یہیں چھوڑ جایا کرے گا۔ تنویر کو خود کسی کام سے کہیں جانا تھا الہanza مجھے اکیلے ہی یہ سفر طے کرنا تھا۔ میرے تینوں دوستوں نے مجھے یوں رخصت کیا جیسے کسی مجاز پر جا رہا ہوں، اور پچھی بات یہ ہے کہ خود میرے لیے یہ سب کچھ کسی مجاز جیسا ہی تھا۔ کیونکہ ہم چاروں میں سے کسی نے آج تک کوئی بھی کام تہبا شروع نہیں کیا تھا۔

درمیانے ماڈل کی بڑی سی کار کی چاروں کھڑکیوں پر سفید پردے کچھ ہوئے تھے۔ مطلب اس گھر کی خواتین پر دہ کرتی تھیں۔ ڈرائیور کپی عمر لیکن مضبوط جسامت کا مالک تھا۔ پوچھنے پر نام اسماعیل بتایا۔ کچھ خاموش ساتھایا پھر اجنبیوں سے زیادہ بے تکلفی پر پابندی تھی۔ میرے بہت سے سوالوں کے جواب میں اس نے بس اتنا ہی بتایا کہ شہر کے کوئی بہت بڑے یا پاری ہیں سیٹھ داؤ د..... انہی کی صاحبزادی کو پڑھاتا ہے۔ دو ہزار روپے تنویر کا رہا میں بیٹھنے سے پہلے ہی میری جیب میں ڈال چکا تھا۔ گاڑی شہر کی بھیڑ سے نکل کر مضافاتی سڑک پر مرٹگی اور قریباً میں منٹ کی سواری کے بعد ہم ایک کوئی نہایتگلے میں داخل ہو گئے۔ نہ جانے مجھے ایسا کیوں محسوس ہوا کہ اس عمارت کے گردان دیکھی، لیکن کڑی نگرانی کا حصار ہے۔

در بارہن بھی نہایت چاک و چوبند اور عام تو کربھی غیر معمولی طور پر نظریں کھلی رکھنے والے دکھائی دیے۔ مجھے ایک کشادہ ڈرائیور میں پہنچا دیا گیا جس کی چار اطراف کی کھلی کھڑکیوں سے آخر ستمبر کی شام کی نرم دھوپ اور خوشنگوار ہوا کے جھونکے، ملامِ ریشمی پردوں سے چھن کر میرے چہرے سے ٹکرائے تھے۔ کچھ ہی دیر میں ایک اماں بی اپنے پاندوان اور ایک کہی ہوئی سی لڑکی کے ساتھ نبودار ہو گئیں۔ میں نے اٹھ کر سلام کیا تو انہوں نے کڑی نظر سے گھورتے ہوئے مجھے دعا دی، اور یو لیں ”نام کیا ہے تمہارا.....“

”آیاں.....“

”پہلے بھی کہیں ٹیوشن پڑھائی ہے.....“ ”نہیں..... پہلا تجربہ ہے۔“ انہوں نے لمبی ہوں کی ”ہونہے..... کتنا پڑھا ہے تم نے.....“ ”جی ابھی چند دن پہلے بی اے کا آخری پرچہ دیا ہے..... نتیجہ نہیں آیا ابھی تک.....“ وہ چونکیں ”مطلب ابھی چودھویں پاس بھی نہیں ہو.....؟.....“ میں نے ایک لمبی سانس بھری ”جی نہیں..... فی الحال تو نہیں.....“

”اور اگر فیل ہو گئے تو.....“

”تو پھر دوبارہ امتحان میں بیٹھوں گا..... یونیورسٹی تین موقع دیتی ہے..... پھر بھی کامیاب نہ ہو سکا تو صرف بارھویں پاس ہی کھلاوں گا۔“ میری اکتا ہٹ پرو ڈچھسٹ پٹا سی گئیں ”لیکن اس طرح تو.....“ مگر اس بارڑکی نے ان کی بات مکمل نہیں ہونے دی۔

”اوہو..... بوا..... آپ بھی کمال کرتی ہیں..... انہیں دم تو لینے دیں..... آپ نے تو آتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ سر آپ بیٹھ جائیں آرام سے..... میرا نام ناہید ہے..... میں ہی آپ کی شاگرد ہوں..... کافونٹ سے بارھویں کا امتحان دوں گی دو ماہ بعد.....“ میں نے شکردا کیا کہ بڑی بی کے انڑو یو سے جان چھوٹی، لیکن وہ دو گھنٹے مسلسل وہیں ڈرائیور روم میں موجود رہیں اور چھالیہ کتر کتر کے پان بناتی رہیں۔ پہنچ میں دوبار پر تکلف اوازات کے ساتھ چائے کی ٹھالی بھی آئی۔ پہلے دن میں نے ناہید کو صرف ابتدائی باتیں بتائیں اور اپنی بمحض کے مطابق اسے ایک

شیدول بھی بنا کر دے دیا کہ ہم اگلے دو ماہ امتحان شروع ہونے تک اس ترتیب سے چلیں گے۔ میں نے ناہید کو یہ بھی صاف صاف بتا دیا کہ چونکہ مجھے ٹیوشن پڑھانے کا ذرا بھی تجربہ نہیں ہے اس لیے اگر وہ درمیان میں کہیں بھی محسوس کرے کہ میں اسے ٹھیک طرح سے مضمون سمجھا نہیں پا رہا ہوں تو وہ بلا تکلف مجھے بتا دے اور اپنے لیے کسی نئے استاد کا انتظام کر لے۔ میں نے وہ دو ہزار روپے بھی بوائی ہی تھی پر رکھ دیے کہ مہینہ ختم ہونے پر اگر وہ مطمئن ہوں تب ہی یہ رقم وہ میرے حوالے کریں۔ بوانہ نہیں کرتی رہ گئیں اور میں پہلے دن کی ٹیوشن ختم کر کے وہاں سے نکل آیا۔ اب یہ میرا روز کا معمول بن گیا تھا۔ چار بجے اسماں عیل گاڑی لے کر کیفے فرaco آ جاتا اور ساڑھے چھ بجے مجھے چھوڑ جاتا۔ ناہید کافی ذہین طالبہ ثابت ہو رہی تھی۔ ایک دفعہ کوئی بات بتانے کے بعد اسے دوبارہ کبھی وہ سبق دہرانے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بچپن سے ہی انگریزی میڈیم یورڈنگز میں پڑھتی رہی ہے اس لیے اس کی بنیادی اردو کچھ کم زور رہ گئی تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مجھے کبھی ناہید کے خاندان میں سے کوئی دوسرا فرد اس گھر میں دکھائی نہیں دیا۔ نہ ہی میں نے پوچھنا مناسب سمجھا۔ میرے لیے اردو پڑھانا بذات خود ایک خوش گوار تجربہ ثابت ہو رہا تھا۔ اور میں ناہید کو پڑھاتے پڑھاتے خود بھی کافی کچھ سیکھ رہا تھا۔

یوں ہی چھ دن گزرے اور آخر اگلی جمعرات بھی آگئی۔ ہم چاروں صبح سوریے سادات محلے کی چوڑی گلی کے علاقے میں پہنچ گئے۔ منصوبے کے مطابق راجہ، بالے اور مشی کو بختہ لینے والے لاکوں کو کسی سنسان مقام پر روک کر للاکرنا تھا اور بات بڑھنے کی صورت میں مجھے پیچھے سے ان کی مدد کو آنا تھا۔ وہ تینوں گلی کے نکڑ پر اور میں گلی کی دوسری جانب ایک چوڑی والے کے ٹھیلے کے عقب میں موجود تھا۔ وقت مرکر کے گزر رہا تھا، اور پھر اچانک میں نے چوڑی گلی میں وہی پرانے ماذل کی ولیز جیپ داخل ہوتے ہوئے دیکھی۔ آج جیب کوئی نیا لڑکا چلا رہا تھا..... لیکن اس کے پیچے بیٹھے ہوئے لاکوں میں شوکی اور تیسرا لڑکا اسی دن والے تھے۔ شوکی نے جیپ سے اتر کر ادھر ادھر دیکھا۔ میری ریڈھ کی ہڈی میں سفنسی کی ایک لہری دوڑی۔ مجھے لگا جیسے شوکی کی نظر مجھ سے نکل رہی ہے۔

## کتاب گھر کی پیشکش

### عشق کا عین

**عشق کا عین**..... علیم الحق حقیقی کے حاس قلم سے، عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کے سفر کی داستان، ع..... ش..... ق کے حروف کی آگاہی کا درجہ بہ درجہ احوال۔ دور حاضر کا مقبول ترین ناول..... ایک ایسا ناول جو آپ کے سوچنے کا انداز بدل کر آپ کی زندگی میں ثابت تبدیلی لے آئے گا۔ **کتاب گھر کے معاشرتی اصلاحی ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔**

## باب 5 کتاب گھر کی پیشکش

لیکن وہ میرا وہم تھا۔ شوکی نہ جانے کس خیال میں گھورتا رہا اور پھر اپنے ہی دھیان میں پلت گیا۔ باقی دوڑکے جیپ سے اترے اور اندر دوکان کی جانب بڑھ گئے۔ راجہ پارٹی یہاں سے کچھ دورگلی کے نکڑ پر جیپ کی روائی کا انتظار کر رہی تھی اور میں یہاں سے انہیں دیکھنے میں سکتا تھا۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، جانے ان دوڑکوں نے دوکان سے نکلنے میں اتنی دیر کیوں لگادی تھی، اور پھر اچانک ہی ایک ہنگامہ سا برپا ہوا اور وہ دونوں لڑکے شور مچاتے، گالیاں بکتے کسی شخص کو دھکے دیتے اور مارتے پیٹتے دوکان سے باہر نکل آئے۔ کچھ جھوٹ کے لیے تو مجھے سمجھی نہیں آیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور پھر جب اچانک میری نظر زیر عتاب شخص پر پڑی تو میرے پیروں میں سے جیسے زمین ہی نکل گئی۔ وہ شیخ صاحب تھے لیکن ان کا مکان تو چوڑی گلی کے عقبِ واپسی میں تھا، تو پھر وہ یہاں.....؟ کیسے؟..... لیکن یہ سب کچھ سوچنے کا وقت ہی کہاں تھا میرے پاس..... میں تیزی سے ان لڑکوں کی طرف دوڑا جو شیخ صاحب کو گھستتے ہوئے شوکی کی جانب لے جا رہے تھے۔ میری زور دار نکر سے شیخ صاحب کا گریبان ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور ایک لڑکا دور جا گرا۔ یہ ان تینوں کے لیے ضرور کوئی نیا تجربہ رہا ہو گا کیونکہ آج تک وہ دوسروں کو ہی گراتے آئے تھے۔ شوکی کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ زور سے چلا یا ”یہ تو ہی ہے..... کیف فراق والا..... آج اس کا دماغ بھی درست کیے دیتے ہیں۔“ گرنے والا لڑکا بھی اب تک سنبھل چکا تھا شوکی کے اشارے پر ان دونوں نے میرے دونوں بازوں جکڑ کر چیچھے موڑ دیے اور شوکی مغلہات بتا میری جانب لپکا، لیکن وہ یہ بھول گیا کہ میرے ہاتھ بند ہے ہیں پاؤں نہیں..... دوسرے ہی لمحے شوکی میری ضرب سے چلاتا ہوا چیچھے جا گرا۔ اس عرصے میں ہمارے آس پاس کافی بھیز اکٹھی ہو چکی تھی لیکن کسی نے آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کی۔ شیخ صاحب ہی ادھر ادھر بھاگ کر لوگوں کی اور ان تینوں کی منت سماجت کرتے رہے..... اب تک شوکی کو یہ بات سمجھی میں آچکی تھی کہ میں اس کے لیے کوئی سیدھی کھیر ثابت ہونے والا نہیں ہوں۔ بچپن سے لے کر اب تک میں نے اور میرے دوستوں نے ایسی لڑائیوں میں درجنوں بار سر پھوڑے تھے تو خود اپنے ماتھے بھی کھلوائے تھے اور بعد میں گھر جا کر ابا کی لامھیاں الگ کھائی تھیں۔ چند یادگاری نشان تو اب تک میری پیٹھ پر جگدار ہے تھے۔ شوکی نے اس بار کوئی جلد بازی نہیں کی اور اپنے نیفے سے چاقو نکال کر خاص فلمی انداز میں یکے بعد دیگرے اس کی گرایاں کھولیں شاید شکار کو مارنے سے پہلے دہشت زدہ کرنے کا اس کا کوئی خاص انداز تھا۔ لڑکوں نے مجھے مزید جکڑ کر پکڑ لیا اور شوکی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں مہارت سے چاقو منتقل کرتے ہوئے میری جانب بڑھنے لگا۔ شیخ صاحب حواس باختہ ہو کر ہجوم سے مدد طلب کرنے لگے لیکن وہاں ایسا کون تھا جو ہمارے پیٹھ پڑتا..... دفعۂ بھیز میں مل چل سی ہوئی اور راجہ، بالا اور مشی چھتے چلاتے اندر گھس آئے۔ شاید انہیں نکڑ پر کسی نے اطلاع دی تھی کہ کوئی لڑکا بختہ لینے والوں سے بھڑک گیا ہے۔ شوکی اس صورتحال کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ راجہ اور بالے نے آتے ہی شوکی کو گردیا اور اس پر چڑھ بیٹھے۔ مشی نے میرا ایک بازو چھڑوا یا تو باقی دو بھی ہمارے نشانے پر آگئے۔ اب ہم چارتے اور وہ تین، اور ہم نے دو ہفتتوں سے جوف بال پیٹھ کی پریکش چھوڑ کر کھی تھی، وہ ساری کی ساری ان تینوں پر پوری کر لی۔ پھر شیخ صاحب نے ہی درمیان

میں پڑ کر بیٹھ چکا وہ روایا۔ بالے نے زمین پر نہ ہال پڑے شوکی کو ایک جھکلے سے اٹھایا اور اسے آخری تسبیہ کی کہ وہ دوبارہ اس علاقے میں نظر نہ ہی آئے تو بہتر ہو گا۔ شوکی کی آنکھوں سے اس کے اندر کی حالت عیاں تھی لیکن وہ خون کے گھونٹ پی کر صرف اتنا ہی بولا ”ابھی ایک ملاقات باقی ہے پیارے“ ہمارے لباس مٹی میں لٹ پت اور کچھ جگہوں سے باقاعدہ پھٹ پکھے تھے۔ کچھ ایسا ہی حال شیخ صاحب کا بھی تھا۔ وہ کچھ لڑکھڑا بھی رہے تھے۔ میں نے انہیں سہارے کے ذریعے گھر کے دروازے تک پہنچا کر واپس پلٹنیا چاہا تو انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا ”اس حال میں گھر کیسے جاؤ گے میاں .....؟ ..... دو گھنٹی رک کر ہاتھ منہ دھولوا اور چاہو تو تنوری کا کوئی لباس بدلو .....“ میرے جواب دینے سے پہلے ہی ہماری دی ہوئی دستک کے جواب میں شیخ صاحب کی آواز سن کر اندر سے کسی نے دروازہ کھول دیا اور پھر شیخ صاحب کے ماتھے سے بہتی خون کی ایک پتلی لکیر دیکھتے ہی اندر گھر میں جیسے طوفان سا آگیا۔ شاید وہ بڑی والی ستارہ تھی جس کی چین سن کر پہلے اندر کرے سے شیخانی اور پھر چھوٹی والی گہنا بھی باہر صحن میں نکل آئی، میں شیخ صاحب کو سہارا دے کر اندر لے آیا، دروازہ کھولنے والی باقاعدہ رورہی تھی اور شیخ صاحب ان سب کو تسلی دینے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ وہ تینوں ماں بیٹیاں اس قدر حواس باختہ ہو گئی تھیں کہ انہیں یہ بھی ہوش نہیں رہا کہ وہ میری موجودگی میں پرداہ کر لیں۔ تنوری شاید گھر میں نہیں تھا۔ میں نے ستارہ اور گہنا کی آواز سے ہتھی ان کے بارے میں اندازہ لگایا تھا ورنہ دیکھنے میں دونوں بہنیں ایک دوسرے کا آئینہ دکھائی دیتی تھیں۔ ستارہ کے سادہ لباس اور چہرے پر پچھلی سرسوں اور ملائی سے ہی اس کے بڑے ہونے کا اشارہ ملتا تھا ورنہ کون کہہ سکتا تھا کہ اس چھوٹی عمر میں یہ نازکی ماتھے پر بیوگی کا داغ سجائے بیٹھی ہو گئی اور گہنا ..... وہ تو سرتاپا ”گہنا“ تھی۔ ہلکے فیروزی رنگ کے کرتا پا جائے میں وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق دکھائی دے رہی تھی۔ میں ان کے گھر کے صحن میں ایک عجیب و غریب صورت حال میں گرفتار کھڑا تھا۔ نظر اٹھاتا تو وہ دونوں سامنے تھیں اور نظر جھکاتا تو ان کی مٹولتی نظریں میرے بو سیدہ لباس اور الجھے ہوئے جیے میں گڑھ کر مجھے بے چین کر دیتیں۔ آخر شیخ صاحب کو ہی سب سے پہلے خیال آیا اور انہوں نے لڑکیوں کو دو پڑھے اور میرے لیے کوئی مناسب لباس بھی لانے کو کہا۔ میں نہ نہ کرتا رہ گیا لیکن انہوں نے ہاتھ سے پکڑ کر مجھے صحن میں ایک جانب لگنے والش میں تک پہنچا دیا۔ میں نے چہرے پر دوچار چھینٹے مارے اور ہاتھوں پر گلی خراشوں میں جما ہوا خون پانی کے ساتھ بہہ گیا، لیکن میری آنکھیں جلنے لگیں۔ میں وہاں سے جلد از جلد جانا چاہتا تھا لیکن شیخ صاحب نے میرا راستہ روکے رکھا، اور بے حد اصرار کر کے میرا کرتے بھی تبدیل کر دیا۔ تنوری کا کرتہ مجھ پر ذرا ساتھ تھا۔ کچھ ہی دیر میں شیخانی جی بیٹھک میں چائے کی ٹرے اٹھالا میں اور شیخ صاحب بھی نہاد ہو کر نئے لباس میں میرے ساتھ آ کر بیٹھ گئے ”آپ لوگوں نے یہ سب تکلف کیوں کیا .....؟ میرے دوست میرے لیے پریشان ہوتے ہوں گے ..... مجھے اب جانا چاہئے .....“ شیخانی جی منونیت سے بولیں ”بیٹا ایک کپ چائے پی کر چلے جانا ..... شیخ صاحب نے ہمیں سب کچھ بتا دیا ہے ..... شاید قدرت نے تمہیں ہی اس گھر پر احسانات کرنے کے لیے چن رکھا ہے ..... ہم سب تمہارے بہت منون ہیں .....“ میں شرم مندہ سا ہو گیا۔ ”آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں ..... میری جگہ اور کوئی بھی ہوتا تو وہ ان کا ہاتھ ضرور رکتا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ موقع پر میں اور میرے دوست وہاں موجود تھے .....“ شیخ صاحب نے لمبی سانس لی ”اسی بات کا تو دکھ ہے میاں ..... کہ اس مردہ معاشرے میں اب ظالم کا ہاتھ روکنے والا بھی کوئی نہیں رہا ..... یہ صرف تم ہی تھے جو تھا ان سے بھڑ گئے ..... تمہارے دوست تو ذرا دیر میں پہنچ ..... اور بیچ تو یہ ہے کہ اگر انہیں ذرا سی مزید دیر ہو جاتی تو وہ بھیڑ یا تمہاری جان

لینے سے بھی نہ چوکتا۔ تم مانو یا نہ مانو۔۔۔ میری یہ زندگی اب تمہارا قرض ہے۔۔۔ شیخ صاحب نے بتایا کہ وہ اس وقت اسی دوکان میں گھنا کے لیے کوئی لیس وغیرہ لینے کے لیے چند لمحے رکے تھے جب وہ دوڑ کے مالک دوکان سے ہفتہ لینے کے لیے اندر داخل ہوئے۔ دوکان دار کے پاس اس وقت پوری رقم نہیں تھی لیکن لڑکے اس کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ مجبوراً شیخ صاحب کو ہی دخل اندازی کرنا پڑی کہ ”یہ کیا طریقہ ہے کسی شریف آدمی سے بات کرنے گا؟۔۔۔ اور یہ کہ وہ دونوں ہٹے کشے ہیں تو بجائے محنت مزدوری کے وہ دوکانداروں سے یوں زبردستی پیے جمع کرتے اچھے نہیں لگتے۔۔۔“ بس اتنا سنا تھا کہ انہوں نے شیخ صاحب کو دھر لیا۔ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ وہ کن پیشہ دروں کے تھے چڑھے گئے تھے۔ میں نے دانتہ ان کے سامنے سارنگا کا نام نہیں لیا۔ وہ دوسرے شہر سے آئے تھے۔ انہیں ان جھمیلوں سے دور ہی رہنا چاہئے تھا۔ چائے ختم کر کے میں نے ان سے اجازت طلب کی اور بڑی مشکل سے انہیں دروازے تک آنے سے روکا کیونکہ انہیں آرام کی ضرورت تھی۔ میں سمجھنے کے دروازہ تک پہنچا ہی تھا کہ میرے عقب سے ایک آواز بھری ”سینے“ میں چونک کر پڑا۔ برآمدے کی جافری کے پیچھے ستارہ اور گھنا کمٹی سمنائی سی کھڑی تھیں ”جی؟“ کچھ دیر دونوں بہنوں میں بات شروع کرنے کے لیے اچکچا ہٹ آمیز اشارے ہوئے پھر گھنا نے ہی ہمت کی ”وہ دراصل ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ بات زیادہ بڑھ تو نہیں جائے گی؟ دراصل بڑے بھی ابا کے سہارے کے لیے یہاں موجود نہیں ہیں اور تنور بھائی پہلے ہی ہماری وجہ سے کافی پریشانیوں کا شکار ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہماری وجہ سے انہیں کوئی تکلیف ہو۔۔۔“ بات کے دوران ایک پتلی سی شریروں کی گھنا کو مستقل ستائی رہی۔ یہ لڑکیاں اپنے والدین اور خاص طور پر اپنے بامل کے لیے اتنی ڈھیر ساری پریشانی جانے کہاں سے اکٹھی کر لاتی ہیں۔ شاید آسمان پر جب روحوں کو کوئی فیض باشنا جاتا ہوگا تو ان کے حصے میں یہی انعام آتا ہوگا۔ میں نے ان پریشان روحوں کو تسلی دی۔

”آپ مطمئن رہیں۔۔۔ شیخ صاحب کو مزید کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم دوستوں میں سے کوئی ایک مستقل آپ کے گھر کے باہر پھرہ بھی دے سکتا ہے۔ بس آپ لوگ انہیں ایک آدھ دن گھر سے باہر نہ جانے دیجئے گا۔“ ستارہ نے مونیت بھری آواز میں شکریہ کہا اور اندر پلٹ گئی لیکن گھنا کو مرتبہ مرتے پھر کوئی بات یاد آگئی۔ ”وہ دراصل۔۔۔“ میں چلتے چلتے پھر رک گیا۔ ”دراصل میں آپ سے اپنے گزشتہ رویے کی معافی بھی مانگنا چاہتی ہوں۔۔۔ میرا مقصد آپ کی ول آزاری نہیں تھا۔۔۔“ میرے ہونٹوں پر مسکرا ہٹ ابھری۔۔۔ ”آپ کے ابا آپ کو ٹھیک ہی نادان پچی کہتے ہیں، کیا یاد کریں گی۔۔۔ جائیں معاف کیا۔۔۔“ گھنا مسکرا دی۔ یہی میرا مقصد بھی تھا کہ وہ نازک اندام شیخ صاحب کی پریشانی سے باہر نکل آئے۔ اس کے ماتھے پر پڑی ٹکنیں دور ہوئیں تو جیسے دنیا کی ہر سلوٹ دور ہو گئی۔ وہ دھیرے سے شکریہ کہ کر پلٹ گئی اور میں وہیں جما کھڑا رہ گیا۔ یہ مجھے کیا ہو رہا تھا؟ پہلے تو کبھی میرے اندر اسی پرواںیاں نہیں چلی تھیں کہ باہر چمکتی دھوپ بھی مجھے سایہ لگنے لگی تھی۔ میں جانے کس عالم میں کیفے فراق تک پہنچا۔ راجہ پارٹی وہیں میرا انتظار کر رہی تھی لیکن مجھے ان کی باتیں بالکل سمجھنہیں آرہی تھیں۔ میں بس خوانخواہ ہوں ہاں کرتا رہا۔ جانے آس پاس کون کیا کر رہا تھا۔ سب لوگ خاموش تھے یہ بھی کچھ بول رہے تھے۔۔۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔ جانے کب دو پھر ڈھلی اور کب اسماں میل گاڑی لیے مجھے لینے کے لیے آبھی گیا۔ اس دن ٹیوشن کے دوران ناہید نے بھی میری ڈھنی غیر موجودگی کو محسوس کر لیا۔

”سر۔۔۔ کیا بات ہے۔۔۔ آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں سب ٹھیک تو ہے۔۔۔“

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ گویا مجھے جو ہور ہاتھا وہ صرف میرے اندر تک محدود نہیں تھا۔ وہ تو میرے پوروں اور میرے مساموں سے جھلک کر باقی دنیا کو بھی بھگوڑا تھا۔ میں نے سر جھلک کر ایک بار پھر دھیان کتاب کی طرف منتقل کرنے کی کوشش کی۔ ناہید غور سے میری جانب دیکھتی رہی۔ پھر جھوہجھکئے ہوئے بولی۔

<http://kitaabghar.com> "سر ایک بات کہوں..... اگر آپ برانہ نہیں تو....؟"

"نہیں نہیں..... تم ضرور کہو....." دور بیٹھی بوائے بھی ناہید کی بات سن کر سراخھا یا۔

"سر اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو آیاں بھائی کہہ لیا کروں..... میرا کوئی بھائی نہیں ہے..... جو تھا اسے خدا نے چھین لیا..... آپ کو جب میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ آپ مجھے بالکل اپنے بھیجا جیسے ہی لگے تھے..... میں نے کبھی آپ کو دل سے اپنا استاد تسلیم نہیں کیا۔ ہمیشہ ایسا ہی محسوس ہوا جیسے میرے بھیجا مجھے پڑھا رہے ہیں....." بوا کی آنکھیں بھرا کیں جنہیں چھپانے کے لیے وہ تیزی سے چھالیا کرتے لگیں۔ مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ ناہید کا کوئی بھائی بھی تھا جو اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ خود ناہید بھی بولتے بولتے اپنی آواز کھو بیٹھی۔ "ٹھیک ہے..... لیکن تمہارا بھیا بننے کے لیے میری بھی ایک شرط ہے....."

"جیتا یے..... میں ہر شرط پوری کروں گی....."

"سوق لو..... کہیں بعد میں مکرہ جانا۔ میری شرط یہ ہے کہ اب یہ ادا کی بھی ناہید کے قریب بھی نہ پھٹکنے پائے۔ ورنہ میں بھائی سے ایک سخت گیر ٹیوڑ بننے میں ذرا سی بھی درنہیں کروں گا۔" بواہنس پڑیں۔ ناہید کی آنکھوں کے ستارے بھی جھلما اٹھے۔ میں نے اسے چھوٹی رافعہ کے بارے میں بتایا کہ اسی کی طرح کی ایک شرارتی بلی، خود ہمارے گھر میں بھی موجود ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب دو بیلیاں میرا سر کھایا کریں گی۔ اس روز ٹیوشن ختم کر کے میں گھر واپس جانے لگا تو بوانے پہلی مرتبہ اٹھ کر میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ "جیتے رہو....." میں مسکرا کر باہر نکل آیا۔

لیکن میری یہ مسکراہٹ اتنی عارضی ثابت ہو گی یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ جیسے ہی میں کیفے فراق کے پاس پہنچا تو لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ اساعیل بھی معاملہ جاننے کے لیے وہیں رک گیا۔ مجھے گاڑی سے اترتے دیکھ کر مرزہ امیری جانب پکا "غضب ہو گیا انویار..... پولیس راجہ، بالے اور مشی کو پکڑ کر تھانے لے گئی ہے۔ فراق چچا بھی انہی کو چھڑانے تھانے گئے ہیں۔" میں نے پریشانی سے پوچھا۔

"تھانے لے گئے ہیں..... لیکن کیوں.....؟"

"پتہ نہیں..... کہہ رہے تھے کہ آج دن میں تم لوگوں نے کچھ لڑکوں کو حملہ کر کے جان سے مارنے کی کوشش کی ہے۔ پولیس تمہارا بھی پتہ پوچھ رہی تھی۔" میں تو کہتا ہوں کہ تم فوراً یہاں سے نو دو گیارہ ہو جاؤ۔ ورنہ وہ تمہیں بھی دھر لیں گے....." میں نے اساعیل کی طرف دیکھا۔

"میرا ایک کام کرو گے....." اساعیل مسکرا یا "ضرور..... کہاں جا کر چھپنا چاہتے ہو....." میں پہنچا آتا ہوں....."

"مجھے علاقے کے تھانے تک جانا ہے..... لیکن بہت جلدی....." اساعیل زور سے چونکا "پولیس تمہاری تلاش میں چھاپے مار رہی ہے

اور تم خود تھا نے جا کر ان کا نوالہ بننا چاہتے ہو.....” مرزا بھی چلایا

”آیاں..... یہ کیا بے وقوفی ہے..... تمہارے جانے سے وہ لوگ باقی تین کو چھوڑ تو نہیں دیں گے.....“ میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے جواب دیا ”ہاں..... مگر مجھے یہ اطمینان تو رہے گا کہ میں ان کے ساتھ ہوں.....“ اسما عیل نے گاڑی آگے بڑھا دی اور ہم پچھے ہی دیر میں تھانے کی بیرونی سڑک پر جا رکے اسما عیل نے مجھ سے کہا ”اگر میری کسی مدد کی ضرورت ہے تو میں رک جاؤں۔“

”نہیں..... تم نے مجھے یہاں تک پہنچا دیا۔ یہی بڑی مدد ہے.....“ اسما عیل نے گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا ”آج تک میں تمہیں صرف ناہید بیٹا کا استاد سمجھتا تھا..... لیکن آج پتہ چلا کہ تم ایک بہت اچھے دوست بھی ہو..... اور اسما عیل کے دل میں یاروں کی بڑی قدر ہے بابو..... کبھی وقت پڑے تو یاد کر لیتا.....“ اسما عیل نے گاڑی گیر میں ڈال دی۔ میں تھانے میں داخل ہوا۔ تو سب سے پہلے ایس ایچ او کے کمرے سے نکلتے اے ایس آئی کی مجھ پر نظر پڑی۔ شاید وہ مجھے جانتا تھا تبھی ائے پیروں والپاں اندر پکا۔ میں نے ایس ایچ او کے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر اجازت طلب کی۔

”کیا میں اندر آ سکتا ہوں.....؟“

تب تک اے ایس آئی تھانیدار کے کان میں میرا تعارف پھونک چکا تھا۔

تھانیدار نے غور سے میری جانب دیکھا۔

”اوہ..... میں تو سمجھ رہا تھا کہ تمہیں پکڑ کر لانے کے لیے ہمیں اپنی آج کی رات بر باد کرنی پڑے گی..... لیکن شabaش ہے تمہاری جرأت کو..... تم تو خود ہی چلے آئے.....“ وہ اے ایس آئی کی جانب مڑا ”ڈال دو سے بھی لاک اپ میں، باقی کارروائی بڑے صاحب کے آنے کے بعد ہو گی۔“

”لیکن ہمارا جرم کیا ہے؟“

”خوب..... جرم بھی بھی سے پوچھ رہے ہو..... تم لوگوں کے خلاف پر چکٹوایا گیا ہے آج صحیح سائز ہے گیارہ بجے کے قریب تم لوگوں نے شوکی ولد عنایت اور دیگر دو پر جان لیا وہ حملہ کیا اور انہیں شدید زخمی حالت میں چھوڑ کر وہاں سے فرار ہو گئے.....“

”یہ غلط ہے..... وہ سارنگا کے آدمی تھے جو بختہ لینے آئے تھے اور ایک بزرگ کو زد کوب کر رہے تھے ہم نے صرف اس بزرگ کی مدد کی تھی..... اور بس.....“

”شabaش..... بھی جوانا..... کون کہتا ہے کہ اس ملک میں ہیروز کی کمی ہے..... اچھا تو اب یہ بھی بتا دو کہ وہ بزرگوار اس وقت کہاں ہیں..... اور تمہارے ساتھ کیوں نہیں آئے۔ تمہارے ساتھیوں کو چھڑانے کے لیے؟“ میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ ستارہ اور گھنٹا سے کیا وعدہ یاد آ گیا کہ اب ان کے ابا کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔

کچھ ہی دیر میں مجھے بھی حوالات میں پہنچا دیا گیا جہاں پہلے ہی تین نوا آموز قیدی پڑے ہوئے تھے۔ راجہ لہک کر گارہ رہا تھا ”کون کسی کو..... باندھ سکا..... صیاد تو اک دیوانہ ہے.....“ مجھے دیکھتے ہی تیتوں نے زور دار نعرہ لگایا ”آ گیا وہ شاہ کار..... تھا جس کا انتظار..... بچ یار

انو..... تیرے بغیر بڑا سونا پن تھا اس حوالات میں ..... اب تم آگئے ہو تو شاید کچھ دل لگ جائے..... ”

میں نے راجہ کے سر پر ایک چپت رسید کی ”احمقو ..... پولیس کے بھتے چڑھنے کی کیا ضرورت تھی ..... کہیں چھپ نہیں سکتے تھے ..... ؟ اب پولیس ہمارے ساتھ جو دل لگی کرے گی اس سے تم سب کا دل خوب لگ جائے گا یہاں ..... ”، مشی رو بانا ہو گیا ”یار چھپنے کی مهلت ہی کہاں ملی ..... آنا فنا و ہر لیا ہم سب کو ہاں ..... یار آیاں ..... بچ بتاؤ ..... اب کیا ہو گا۔ کاشیبل بتا رہا تھا کہ جب ان کے بڑے صاحب آئیں گے تو ہمیں بہت مار پڑے گی ..... ؟ ..... یہ لوگ ہمیں ماریں گے کیا ..... ؟

”پولیس کا گزشتہ ریکارڈ دیکھتے ہوئے تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس کاشیبل کی پیشین گوئی سو فیصد درست ثابت ہو گی، لیکن تم فکر نہ کرو ..... مجرمات بھی تو اسی دنیا میں ہی رونما ہوتے ہیں ناں ..... ”، مشی کا اتر اہوا چہرہ مزید اتر گیا، پچھہ ہی دیر میں حوالات میں شام کا اندر ہیرا اتر آیا، اور پھر اچانک ہی باہر کچھ مل چل گئی۔ ایک ستری نے آ کر ہمیں زور سے جھاڑا ”چلو اٹھوائے ..... بڑے صاحب تم لوگوں کو بلار ہے ہیں۔“



## جو چلے تو جاں سے گزار گئے

ماہمک کا یہ خوبصورت ناول ہمارے اپنے ہی معاشرے کی کہانی ہے۔ اسکے کردار ماورائی یا تصوراتی نہیں ہیں۔ یہ جیتنے جا گئے کردار اسی معاشرے کا حصہ ہیں۔ زندگی کی راہوں میں ہم سے قدم قدم پر ٹکراتے ہیں۔ یہ کردار محبت کے قرینوں سے بھی واقف ہیں اور رقابت اور لفڑت کے آداب نبھانا بھی جانتے ہیں۔ انہیں جینے کا ہنر بھی آتا ہے اور مرنے کا سلیقہ بھی۔ خیر و شر، ہر آدمی کی فطرت کے بنیادی عناصر ہیں۔ ہر شخص کا خیر انبی دو عناصر سے گندھا ہوا ہے۔ ان کی تکمیل غالب ایسے شاعر سے کہلواتی ہے۔ آدمی کو بھی میر نہیں انساں ہوتا۔ آدمی سے انسان ہونے کا سفر بڑا کٹھن اور صبر آزمہ ہوتا ہے۔ لیکن ”انسان“ ور حقیقت وہی ہے جس کا ”شر“ اس کے ”خیر“ کو نکلتے نہیں دے پایا، جس کے اندر ”خیر“ کا الاؤ روش رہتا ہے۔ بھی احساس اس ناول کی اساس ہے۔ **جو چلے تو جاں سے گزار گئے**

## باب 6 کتاب گھر کی پیشکش

ہم چاروں نے ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھا جیسے ہم آخری بار ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں۔ سفتری نے حوالات کا دروازہ کھولا اور ہمیں ہائک کر ایک بڑے ہال نما کمرے کی طرف لے گیا۔ مشی نے آہستہ سے مجھ سے پوچھا ”انو..... کیا یہ لوگ ہمیں ثارچریل کی طرف لے جا رہے ہیں.....؟“ سفتری نے زور سے ”شش.....“ کی آواز نکال کر ہمیں خاموش رہنے کی تعبیر کی۔ ہال میں تین کاشیبل، تھانے دار اور ایک جوان آفیسر موجود تھا۔ ریحان سے سال دو سال ہی بڑا ہو گا عمر میں..... ہمیں ایک قطار میں موڈب سا بنا کر کھڑا کر دیا گیا۔ نوجوان افسر کوئی براہ راست بھرتی شدہ اے ایس پی تھا۔ اس نے غور سے ہماری جانب دیکھا۔ ”چھا تو یہی چاروں ہیں..... پرچہ کاٹ دیا ہے تم لوگوں نے.....؟“ تھانے دار نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”نہیں سر..... آپ کی اجازت کے بغیر کیسے کاٹ سکتے تھے..... ویسے چاروں نے بہت ادھم مچار کھا تھا علاقے میں.....“ ہم نے نظریں اٹھا کر حیرت سے تھانیدار کی طرف دیکھا۔ ہم علاقے میں ادھم مچائے ہوئے تھے اور خود ہمی کو پتہ نہیں تھا۔ اے ایس پی نے لمبی سی ہوں کی اور ہم چاروں کو غور سے دیکھا اور پھر اس کی نظر میشی پر رک کر نکل سی گئی۔ پھر وہ حیرت سے بولا ”یعنی کوئی بھی ان بد معاشوں کے ساتھ ہے۔ چہرے سے تو یہ کوئی پڑھا کو قسم کا لڑکا لگتا ہے۔“ مشی نے گھنگھیا کر کہا ”ہم بد معاشوں نہیں ہیں جناب..... وہ لڑکے وہاں بجھتے لینے کے لیے آئے تھے۔“

اتنے میں باہر سے کچھ شور اور بحث کی آوازیں ابھریں اور پھر ایک سفتری نے اندر آ کر اطلاع دی ”جناب ان لڑکوں کے گھروالے آپ سے ملتا چاہتے ہیں۔“ اے ایس پی نے سفتری کو جھاڑ دیا ”کہہ دوان سے میں فی الحال کسی سے نہیں مل سکتا اور سب سے پہلے ان چاروں کے کوائف نوٹ کر کے میرے دفتر پہنچاؤ۔“ اے ایس پی تھانیدار کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا اور ایک سپاہی نے ہمارے نام بمعدہ ولدیت اور پتے وغیرہ لکھنا شروع کر دیے۔ میرا نام تیرا تھا ”آیان احمد ولد تو قیر احمد، پیشہ ریٹائرہیڈ ماسٹر، گورنمنٹ اسکول“ اے ایس پی نے چونکہ کریمی طرف دیکھا ”اپنے والد کا نام پھر سے دھراو۔“ میں نے پھر سے ابا کا نام اور پیشہ دھرا یا ”تم تو قیر احمد صاحب کے بیٹے ہو..... آئی کائنٹ بلیوٹ..... وہ آج کل کہاں ہوتے ہیں.....؟“ پھر میرا جواب نے بغیر اس نے ملاقاتیوں کے آنے کی اطلاع کرنے والے سفتری سے ان کی فہرست لانے کو کہا۔ سفتری بھاگ کر گیا اور کچھ ہی دیر میں سب نام لکھ کر لے آیا۔ اے ایس پی نے فہرست پر نظر ڈالی اور سفتری سے کہا ”ان سب کو میرے دفتر میں بٹھاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں،“ سفتری سیلوٹ کر کے واپس پکا۔ اے ایس پی ہمیں وہیں کھڑا رکھنے کا حکم دے کر اپنی ٹوپی سیدھی کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ پتہ نہیں اے ایس پی ابا کا نام سن کر ایسے چونکا کیوں تھا۔ مگر میرا دل تو یہی سوچ کر بیٹھا جا رہا تھا کہ اگر ابا بھی باہر موجود ہوئے تو میرا کیا ہو گا۔ کچھ ہی دیر میں ایک سپاہی نے آ کر اطلاع دی کہ ”ہم چاروں کو بڑے صاحب نے دفتر بلا یا ہے۔“

اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ جیسے ہی ہم اے ایس پی کے کمرے میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے میری نظر بالے کے ابا کے ساتھ بیٹھے ہوئے اپنے ابا پر پڑی۔ پس منظر میں ریحان بھی باقی اباوں کے ساتھ بیٹھا نظر آیا لیکن اس کے چہرے پر بھی ہوا یاں سی اڑ رہی تھیں۔ ہمیں

دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا رہنے کا حکم دے کر سپاہی باہر نکل گیا۔ اے ایس پی نے اپنی بات جاری رکھی ”سر میں تو آپ کا نام سن کر ہی چونک گیا تھا۔ آپ کو شاید یاد نہ ہو..... میں نے چھٹی اور ساتویں جماعت آپ کے ہی سکول سے پاس کی تھی۔ پھر بورڈنگ میں داخل ہو گیا اور میں دوسرے شہر چلا گیا تھا..... ابھی دوسال پہلے ہی میں نے سی ایس ایس کلیئر کیا ہے..... میں تو آج بھی مانتا ہوں کہ میری تعلیم کی بنیاد رکھنے میں آپ کا بہت بڑا اتحہ ہے۔“ ابا سر جھکائے بیٹھے تھے ”ہاں میاں ..... یہ تو تمہاری اعلیٰ طرفی ہے کہ تم نے میری محنت کی لاج رکھ لی۔ ورنہ یہاں تو خود میرا اپنا خون میری بنیادیں کھو کھلی کر رہا ہے۔ مجھے تو اسے اپنا بیٹا کہنے میں بھی شرم آتی ہے۔ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا مجھے .....“

”بہر حال سر..... میرا مشورہ یہی ہے کہ یہ ان لڑکوں سے تھانے کے باہر راضی نامہ کر لیں تو ان کے لیے بہتر ہو گا۔ وہ اوپنی چینچ والے لوگ ہیں، اور قانون گواہ اور ثبوت کی بنیاد پر فیصلے کرتا ہے، لیکن اس معاملے میں آپ کے بیٹے اور اس کے دوستوں کے حق میں نہ تو کوئی گواہ ہے..... اور نہ ہی ثبوت..... اگر ایک بار تھانے کچھری کی مہر لگ گئی اور انہوں نے ملزم سے مجرم تک کا سفر طے کر لیا تو ان چاروں کا تعلیمی کیریئر ہمیشہ کے لیے برپا ہو جائے گا..... میں آج انہیں صرف آپ کی وجہ سے جانے دیتا ہوں، لیکن یہ جھگڑا جس قدر جلد ختم ہو جائے اتنا ہی ان سب کے لیے بہتر ہو گا۔ آپ لوگ اپنے بیٹوں کو لے جاسکتے ہیں۔“

ابا نے زہر میں نظروں سے ہم سب کی طرف دیکھا ”چلواب .....“

ہم لوگ تھانے سے باہر نکلے تو سبھی خاموش تھے۔ پھر سب سے پہلے مشی کے ابا نے اس کے کان کھینچے ”کہا تھا میں نے ..... چھوڑ دے ان لوفروں کی دوستی..... کھلا دی نہ آج جیل کی ہوا تھے..... اور نہ مان اپنے باپ کی بات.....“ دوسری جانب سے بالے کے ابا نے اسے لتاڑا ”سن لے..... آج تیری وجہ سے کیا کیا سننے کو مل رہا ہے..... بروں کی صحبت میں بیٹھے گا تو یہی سب کچھ ہو گا۔“ پھر بھلاراجہ کے ابا کہاں چپ رہنے والے تھے ”ہاں ہاں..... لوفروں کی صحبت میں لوفرنہ بننے گا تو کیا حاجی بننے گا، خبردار جو تو نے آئندہ ان تینوں کی شکل بھی دیکھی تو..... کام کے نہ کاچ کے ..... دُشمن اتنا ج کے .....“ اور پھر سب سے آخر میں مغل اعظم گرجے۔

”بس..... بہت ہو گیا..... گھر چلو..... انتہا ہو گئی بے غیرتی کی.....“ ہم چاروں کو ہمارے بڑوں نے چار مختلف سمتوں میں کھینچا اور ہم ایک دوسرے کو حضرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے یوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے جیسے پلیٹ فارم سے چھوٹی گاڑی میں بیٹھ کر جاتے پیاروں سے اٹیشن پر کھڑے اپنوں کے ہاتھ چھوٹتے ہیں۔ بچپن سے آج تک کئی بار محلے میں مختلف شرارتون کی سزا کے طور پر ہمیں اسی طرح کھینچ کر علیحدہ کر دیا جاتا تھا، کئی دن ملنے نہیں دیا جاتا تھا۔ ہم اپنی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو لیے کھٹے بازو کے باوجود پلٹ پلٹ کر ایک دوسرے کو اسی طرح دیکھا کرتے تھے اور پھر چند دن بعد ہی سب سے نظر بچا کر پھر سے اکٹھے ہو جاتے تھے، لیکن جانے کیوں اس بار جدا ہوتے ہوئے میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

ہم گھر میں داخل ہوئے تو ای برا آمدے میں جائے نماز بچھائے گز گز اکر دعا مانگتی نظر آئیں۔ چھوٹی بھی ان کے ساتھ بیٹھی تسبیح پھیر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی دونوں جلدی سے میری جانب لپکیں۔ ”آگیا تو انو..... ان لوگوں نے تجھے مارا پیٹا تو نہیں.....؟“ امی نے جلدی جلدی میرا جسم ٹوٹ کر یوں دیکھا جیسے وہ بچپن میں تب دیکھتی تھیں جب میں باہر سے کوئی چوت کھا کر گھر آتا تھا۔ دنیا بدل جائے تو بدل جائے پر یہ ماں میں کبھی نہیں بدلتیں۔ ابا

دھاڑے ”وہ اس کی ہڈی پسلی ایک کر دیتے تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔ آوارہ اور لوفر تو پہلے ہی سے تھا۔۔۔ اب غنڈہ گردی بھی شروع کر دی ہے تمہارے سپت نے۔۔۔ میری برسوں کی کمالی عزت ایک دن میں خاک کر کے رکھ دی۔۔۔ پوچھا سے کہاب کون ساتھے سینے پر سجا کر آیا ہے تھا نے سے۔۔۔“ میں سر جھکائے کھڑا رہا ”میں نے صرف ایک بزرگ کی مدد کی تھی۔ وہ لڑکے انہیں پیٹھ رہے تھے۔۔۔“ ابازور سے چلائے ”کیا ضرورت تھی اس خدائی خدمت گاری کی۔۔۔ وہاں پر موجود باتی لوگ مر گئے تھے کیا۔۔۔؟“

”نبیس۔۔۔ لیکن کوئی ان کی مدد کو آگئے نہیں بڑھا۔۔۔ میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔۔۔ ابا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور انہوں نے غصے میں اپنی چھڑی اٹھا لی ”زبان چلاتا ہے باپ کے سامنے۔۔۔“ پھر وہی ہوا جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔۔۔ ابا کی چھڑی اور میری پیٹھ۔۔۔ میں چپ چپ مار کھاتا رہا اور بے چاری اگی اور رافعہ اپنے ہاتھوں پر میرے حصے کے وار ہتھی گئی۔۔۔ جانے ہمارے والدین ہمیں بچپن میں جن باتوں کا درس دیتے ہیں جوان ہونے پر ہمیں انہی باتوں پر مار کیوں پڑتی ہے؟ دوسروں کی مدد ظلم کے خلاف بغاوت اور برابری کے خلاف ڈٹ جانا، ایسے جانے کتنے سبق میں نے اپنی کتابوں میں اپنے انہی باتا سے پڑھے تھے جو آج مجھے کسی دوسرے کی مدد کے لیے کو دپڑنے پر مار رہے تھے۔ کاش وہ سارے سبق پڑھاتے وقت ابا مجھے یہ بھی بتا دیتے کہ بیٹا یہ کتابیں صرف امتحان پاس کرنے کے لیے ہیں۔۔۔ ان پر کبھی عمل نہ کرنا۔۔۔ کیونکہ ہم عزت دار لوگ پولیس یا کچھری کا سامنا نہیں کر سکتے۔۔۔ سو اگر کہیں کچھ غلط ہوتے دیکھو تو چپ کر کے آگے بڑھ جانا مگر خود کو کسی جھمیلے میں نہ ڈالنا۔۔۔ کیونکہ یہ اچھائی اور بھلائی کی جذباتی باقی کتابوں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔۔۔

ہمیشہ کی طرح ابا کی اس مشق کا اختتام بھی چھڑی کے ٹوٹ جانے پر ہی ہوا۔ حسب معمول امی نے روتے ہوئے اپنے کمرے میں جا کر بام کی شیشی چھوٹی کے حوالے کی کہ وہ بھائی کے نیلوں پر مل دے، اور پھر ہمیشہ کی طرح ریحان اور چھوٹی بہت دیر تک چھٹ پر میرے کمرے میں بیٹھے میرے زخموں پر مر ہم رکھتے اور میرا دماغ کھاتے رہے کہ آخر میں کب سدھروں گا؟ آخر کار میں نے ہی ان کے سامنے ہاتھ جوڑے کے اب وہ دونوں اپنی ”اقوال زریں“ نما فیضتوں کے ساتھ یہاں سے رواگی اختیار کریں کیونکہ مجھے نیندا آرہی ہے۔۔۔ مگر میں ان دونوں کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔۔۔ جب بھی میں آنکھیں بند کرنے کی کوشش کرتا میری پلکوں کے پیچھے ایک من موہنی صورت چھم سے ابھر آتی ”گھنا۔۔۔“ آخر کار میں اٹھ بیٹھا اور دو چار مرتبہ زور سے اپنے سر کو جھکتا، لیکن کاش سر جھکنے سے من میں بھی مورتوں کی شیپہ بھی ذہن سے اتر جاتی۔۔۔ میں جتنا اپنا دھیان کسی اور جانب لگانے کی کوشش کرتا اتنا ہی وہ میرے ذہن اور دل کی تھوں میں اترتی جاتی تھی۔۔۔ یہ مجھے کیا ہو رہا تھا۔۔۔ آج تک پہلے کبھی تو یہ میٹھی سی کسک میرے اندر نہیں جا گئی تھی کیوں مجھے آس پاس کی ہر چیز خواہ تھا ہی اچھی لگ رہی تھی؟ کیوں رات کا ایک ایک پھر پوری پوری رات کی طرح ڈھل کر مجھ پر بیت رہا تھا۔۔۔ کیا یہ وہی جذبہ تھا جسے ساری دنیا محبت کے نام سے پکارتی ہے۔۔۔ لیکن ”محبت“ اور آیاں احمد کو۔۔۔؟ نہیں۔۔۔ میں بھلا ان خرافات پر کب یقین کرنے والا تھا۔۔۔ ضرور ابا کی چھڑی مجھ پر برستے وقت میرے دماغ کی کسی ایسی رگ کو چھوٹی ہو گی جو من درمیں ایسی روشنی بھر جاتی ہو گی۔۔۔ صبح تک میں ضرور اس سحر سے نکل آؤں گا، لیکن تب میں شاید یہ نہیں جانتا تھا کہ محبت سخن نہیں۔۔۔ وہ کالا جادو ہے جس کا توڑ دنیا کے کسی ساحر کے پاس نہیں۔۔۔ یا شاید موت کی طرح محبت بھی ایک واپس نہ پلٹنے والے عمل کے طور پر اس دنیا میں وار ہوتی ہے، اور ہم مخصوص انسان

ساری عرب بے خبری میں اس جادو ٹونے کا توڑ تلاش کرتے رہتے ہیں۔

صحیح میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ درد گھٹنے کے بجائے بڑھتا گیا۔ بے چینی کم سے فزوں تر ہوتی گئی۔ دل ویرانہ تلاش کرنے لگا اور باتیں اضافی لکھنے لگیں۔ مجھے یوں گم سدم دیکھ کر ای میری چپ کا مطلب میری ابا سے ناراضگی بھیں۔ میرا جی خوش کرنے کے لیے انہوں نے دبے الفاظ میں ابا کے خلاف ایک آدھ بات بھی کہہ دی کہ ”بھلا کون اپنی جوان اولاد کو یوں چھڑی سے پیٹتا ہے“ اور یہ کہ ”اگر میرا دل ابا کی جانب سے خراب ہے تو ہونا بھی چاہئے.....“ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اب میں اپنی بھولی ماں کو یہ کیسے سمجھاتا کہ میرا دل تو نہ جانے میرے ساتھ کتنی بڑی سازش کر بیٹھا ہے اور سادات محلے جانے کے کتنے ہی بہانے تراش کر خود ہی انہیں رد کر رہا ہے۔ آج میرے دوستوں میں سے بھی کوئی دن چڑھتے تک گلی یا چھٹ پنہیں آیا۔ میں جانتا تھا کہ میری طرح آج ان تینوں کی بھی ”خصوصی غفرانی“ کی جا رہی ہو گی۔ میری طرح بھی کے والدین انہیں گھر کے صحن میں بٹھا کر یہ تبلیغ کر رہے ہوں گے کہ انہیں اس حال تک پہنچانے والے اور کوئی نہیں..... بس وہ آوارہ دوست ہیں۔ عام حالات میں ایسے موقعوں پر میں بمشکل ابا کے گھر سے نکلنے کا انتظار کیا کرتا تھا اور ان کا قدم گھر سے باہر پڑتے ہی میں امی اور چھوٹی کی ہزار منٹ سماجت کے باوجود گھر سے باہر نکل جاتا تھا لیکن اس روز جب بارہ بجے کے قریب ابا حسب معمول کپڑے کا تھیلا اپنی سائیکل سے لٹکائے باہر سو دا سلف لینے کے لیے چلے بھی گئے اور میں پھر بھی صحن میں لگی انگور کی نیل کے نیچے بیٹھا خشک پتوں کو اپنے ہاتھ سے ملتا رہا تو امی کو میری فکر لاحق ہو گئی۔ انہوں نے جلدی سے آگے بڑھ کر میرے ماتھے کو چھو کر دیکھا ”اوو..... تیری طبیعت تو نمیک ہے نا.....“ میں چپ چاپ انھوں کو چھت پر چلا آیا، اور بیجان اور چھوٹی کے درجنوں بار بلانے پر بھی دن کے کھانے کے لیے نیچے نہیں اتر۔ چار بجے کے قریب جب میرے گھروالوں نے باقاعدہ چھت کی ڈیوڑھی سے مجھے جھانک کر تکنا شروع کر دیا تو میں چھنجلا کر گھر سے باہر نکل آیا۔ کیفے فراق کے باہر اسماعیل میرا انتظار کرتے کرتے اب واپس جانے کو تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر تازگی اسی چھا گئی۔

”تم یہاں ہو بابو..... میں تو تمہیں دیکھنے کے لیے تھانے جانے والا تھا“ میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ”نہیں..... رات کو ابا مجھے وہاں سے چھڑا لائے تھے..... اب میں ان کی قید میں ہوں.....“ میری بات سن کر اسماعیل زور سے ہنسا۔ ”فکر نہ کرو..... میرے مالک دوہی گئے ہوئے ہیں..... آج کل میں ان کی واپسی ہے..... ان کے آتے ہی تمہارا یہ بھگڑا ہمیشہ کے لیے ختم کروادوں گا.....“ اسماعیل نہ جانے اور کیا کچھ کہتا رہا لیکن میرا دھیان تو کہیں اور ہی تھا۔ ٹیوشن میں بھی ناہید کو گزشتہ روز کے باب کی دہرائی کا کہہ کر میں خود کو اپنے اندر کھو جتا رہا۔ میری حالت کے پیش نظر ناہید نے بھی مجھ سے غیر ضروری سوال وجواب سے گریز کیا۔ واپسی پر بوانے بے حد اصرار کے ساتھ دو ہزار میری جیب میں ڈال دیے اور جاتے جاتے جانے مجھ سے یہ کیوں کہا کہ ”اپنا خیال رکھا کر لڑ کے.....“

محبت کی بے خودی بھی عجب بے خودی ہے۔ پہلے پہل اس میں صرف گھائل ہونے والے کو اپنے درد کا پتہ چلتا ہے اور باقی ساری دنیا بے خبر ہوتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ وہ مقام بھی آ جاتا ہے جب ساری دنیا کو اس جنوں کا پتہ چل جاتا ہے مگر جو خود اس دور جنوں سے گزر رہا ہوتا ہے صرف اسی کو خبر نہیں ہوتی کہ وہ ایک چلتا پھرتا اشتہار بن چکا ہے اور جہاں سے وہ گزرتا ہے فسانہ بن جاتا ہے۔

میرا فسانہ بننے میں بھی بس کچھ دیر ہی باقی تھی۔ مجھے واپسی پر اسماعیل نے کیف فراق اتنا رات شام ڈھل چکی تھی۔ فراق پچا حصہ معمول کا وائز

پر کسی گھرے مراتبے میں ڈوبے ہوئے تھے اور ان کا گراموفون چل رہا تھا۔ ”یہ میرا دیوانہ پن ہے..... یا محبت کا سرور..... تو نہ پہچانے تو ہے یہ..... تیری نظروں کا قصور.....“ مجھے لگا کسی نے میرے اندر کے چور کو پکڑنے کے لیے یہ گناہ کرن کر لگایا ہے۔ اتنے میں اندر کسی گاہک سے بحث کرتے مرزا کی مجھ پر نظر پڑی تو وہ تیزی سے میری جانب لپکا۔ ”کہاں تھے تم دن بھر..... سادات محلے سے شیخ صاحب کے ہاں سے تین بار تمہارے لیے پیغام آچکا ہے کہ آیاں میاں آئیں تو ان سے کہوں کہ وہ دو گھنٹی شیخ صاحب کے ہاں سے ہوتے جائیں.....“ مرزا کی سرگوشیاں آواز سے لگ رہا تھا کہ اسے ہماری اور شوکی کی لڑائی کی اصل وجہ بھی پتہ چل چکی ہے۔ پھر اس نے خود ہی بات کھولی ”رجب آیا تھا دو پہر کو..... پھر اس کے جانے کے بعد بالا بھی چکر لگا گیا ہے.....“ مجھ کی اصل وجہ بھی پتہ چل چکی ہے۔ پھر اس کی خالی میز کا نہ کو دوڑ رہی تھی۔ میں نے پیروں سے کہہ کر اس کی جگہ ہی بدلوادی ہے..... جب تم چاروں اکٹھے آؤ گے..... تجھی وہ کہوں تو مجھے تو تم لوگوں کی خالی میز کا نہ کو دوڑ رہی تھی۔ میں نے پیروں سے کہہ کر اس کی جگہ ہی بدلوادی ہے..... جب تم چاروں اکٹھے آؤ گے..... میزوہاں لگے گی.....“ مرزا بولتے بولتے روہاں سا ہو گیا۔ ہمارا اور مرزا کا بھی ایک عجیب تعلق تھا۔ اس رشتے کا شاید کوئی نام بھی دنیا کی کسی لفظ میں موجود نہیں ہو گا۔ ہم نے جب سے ہوش سن جالا۔..... مرزا کو اسی حلیے اور اسی عمر میں کیفے فراق کی مشی گیری کرتے پایا تھا۔ شاید اس کی اصل عمر ہمارے چھا، تباہ جتنی ہو گی لیکن بچپن سے وہ ہمارے لیے صرف ”مرزا“ ہی رہا۔ ہم نے بھی اس کے نام کے ساتھ کوئی سابقہ یا لاحقہ احتراماً تکلفاً بھی لگانے کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔“ دل کے رشتے کسی بھی سابقے یا لاحقے سے کہیں زیادہ بالا ہوتے ہیں۔ مرزا ہم چاروں کی شیم کا غیر اعلان شدہ پانچواں رکن تھا وہ کون ہی شرارت تھی جس میں اس نے آج تک ہمارا ساتھ نہ دیا ہو؟ ہمارا کون سا ایسا منصوبہ تھا جس میں وہ براہ راست نہیں تو پس منظر میں شامل نہ رہا ہو؟ اسی لیے آج اس کا دل ہم چاروں کی اس مسلط کردہ جدائی پر کٹ رہا تھا۔ میں مرزا سے کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ مجھے دور سے ریحان آتا دکھائی دیا۔ وہ ضرور میری تلاش میں آیا ہو گا۔ میں نے جلدی سے مرزا سے کہا کہ وہ کسی بھی طرح شیخ صاحب کے گھر پیغام بھجوادے کے میں موقع ملتے ہی وہاں آؤں گا۔ ریحان نے دور سے ہی مجھے گھر چلنے کا اشارہ کیا۔ مرزا نے مجھے نظروں نظروں میں اشارہ کیا کہ ”کام ہو جائے گا“ میں ریحان کے ساتھ گھر کے صحن میں داخل ہوا تو ابا صحن میں ہی کری ڈالے بیٹھے تھے۔ میں چپ چاپ اوپر چھٹ پر جانے کے لیے ڈیوڑھی کی سیر ہیوں کی جانب بڑھا تو انہوں نے مجھے آواز دی۔

”مُهْرُو..... بات سنتے جاؤ.....“

میں رک گیا۔ اب انے چند لمحے توقف کیا۔ پھر حتمی لمحے میں بولے

”ریحان نے ان لڑکوں کا پتہ لگایا ہے..... تم کل اس کے ساتھ جا کر ان لڑکوں سے معافی مانگو گے..... یہ میرا حکم ہے.....“  
میرے سیر ہیوں پر چڑھتے قدم رک گئے۔

”میں کسی سے معافی نہیں مانگوں گا۔“ میری بات سن کر امی کے ہاتھ میں پکڑا سلوک کا گاس ز میں پر گر گیا۔ ریحان نے نظروں نظروں میں مجھے کچھ ایسا اشارہ کیا جیسے اسے میری ذہنی حالت پر کوئی شک ہو۔ ابا کے ہاتھ کی گرفت ان کی چھڑی کے دستے پر شدید ہو گئی اور وہ غصے میں ایک جھٹکے سے کھڑے ہو گئے۔

## باب 7 کتاب گھر کی پیشکش

ابا غھے میں کھڑے ہو گئے ”دیکھ لیا رافعہ کی ماں..... اب اپنے باپ کو جواب بھی دینا آگیا ہے اسے..... بس اس کی کسریا تی تھی.....“ امی نے جلدی سے صورتحال کو سنبھالنے کی کوشش کی اور اپنی سدا بہار نصیحت اور ہزار بار کا کہا اپنا پسندیدہ جملہ دھرا یا ”انو..... تیرے ابا تیرے بھلے کے لیے ہی یہ سب کہتے ہیں.....“ ابا نے اپنا حتمی فیصلہ نہادیا..... ”اے ایس پی صاحب نے صرف تین دن کی مهلت دی ہے راضی نامے کے لیے یہ بھی ان کی بڑی مہربانی ہے، ورنہ ان پر دوسرا پارٹی کی وجہ سے بہت دباؤ ہے..... صرف شاگردی کا حق ادا کر رہے ہیں وہ..... تم کل ریحان کے ساتھ جا کر ان لڑکوں سے معافی مانگو گے کہ جو بھی ہوا وہ انجانے میں ہوا..... ایک باروہ لوگ اپنی شکایت واپس لے لیں تو باقی بات اے ایس پی بلال سنبھال لیں گے.....“ میرا ضبط جواب دے گیا ”لیکن ابا..... پولیس کیا صرف ایک جانب کی بات سننے کے لیے ہی اپنا دفتر کھو لیجھی ہے..... شکایت تو ہم بھی درج کر سکتے ہیں۔ پھر بات برا بر کی ہو جائے گی اور فیصلہ عدالت کرے گی..... آپ میرا یقین کیوں نہیں کرتے کہ میں بے قصور ہوں،“ ابا زور سے چلا یے ”میں یقین کر بھی لوں تو دوسرا کوئی اور نہیں کرے گا۔ ہمارے خاندان میں آج تک کوئی کورٹ کچھری کے چکر میں نہیں پڑا..... یہ میں زیب نہیں دیتا..... اور پھر تم کیا سمجھتے ہو کہ کچھری بنا ثبوت اور گواہ تمہیں بے گناہ مان لے گی۔ دوسروں نے تمہارے لیے پھنڈا تیار کر رکھا ہے..... میری بوڑھی بڑیوں پر رحم کھاؤ اور اس عمر میں مجھے مزید رسانہ کرو..... ہم ان لوگوں کے سامنے بہت چھوٹے..... بہت کم زور ہیں.....“ ابا مزید کوئی بات نے بغیر اٹھ کر اندر چلے گئے۔ میرا بھی چاہا کہ ان سے چلا چلا کر پوچھوں کہ کیا یہ قانون اور عدالتیں صرف بڑے اور منہ زور لوگوں کی حفاظت کے لیے بنی ہیں؟ اور کیا اگر کوئی ثبوت اور گواہ پیش نہ کر سکے تو اسے بے گناہ کھلانے کا کوئی حق نہیں رہتا؟ لیکن وہ میری کوئی صفائی نے بنا ہی اپنا ترپ کا آخری پتہ چھینک چکے تھے۔ والدین کا آخری ہتھیار کیا ہوتا ہے۔ رشتتوں کا جذبائی دباؤ..... ایک موٹل بلیک میلنگ..... تب مجھ جیسی مجبور اور لا چار اولاد کے پاس اور کون سارا ستہ باقی رہ جاتا ہے؟ صرف یہی کہ اپنے اندر کو مار کر اپنی شخصیت کو منخ کر کے خود کو والدین کی ہر اس خواہش اور حکم کی بھینٹ چڑھا دیا جائے جسے وہ جائز اور ہمارے لیے بہتر سمجھتے ہیں۔ میں نے اپنے ابا کے علاوہ اور کسی کے سامنے آج تک ہاتھ نہیں جوڑے تھے اور آج وہی ابا مجھے ایک غنڈے سے معافی مانگنے کا حکم دے رہے تھے وہ رات مجھ پر بہت بھاری گزری اور صبح میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب ریحان پھٹ پر آ گیا ”میں جانتا ہوں یہ سب تمہارے لیے بے حد مشکل ہے..... لیکن ہم ان لوگوں سے نکلنے سکتے۔ چلو تم تیار ہو کر شیخ آ جاؤ۔ ہمیں ابھی بازار جانا ہے.....“

نیچے گھن میں ابا بظاہر اخبار پڑھ رہے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ ان کا سارا دھیان اس وقت میری طرف ہے۔ میں چپ چاپ ریحان کے ساتھ گھر سے باہر نکل آیا۔ ریحان نے چوڑی گلی کے اسی دو کاندار کی مدد سے شوکی گروہ کو پیغام بھجوایا تھا جہاں سے یہ سارا جھگڑا شروع ہوا تھا۔ ہم سادات محلے میں پہنچ تو ماحول پر کچھ عجیب قسم کا ساناٹا طاری تھا۔ میں دل میں دعا کر رہا تھا کہ اس موقع پر کہیں شیخ صاحب یا تور نظر نہ آئیں۔

گلی میں مرتے ہی دور سے مجھے شوکی کی جیپ نظر آگئی۔ آج وہ احتیاطاً اپنے ساتھ چار لڑکوں کو لے کر آیا تھا جن میں دو وہی تھے جو اس روز ہم سے پٹ کر گئے تھے۔ مجھے قریب آتا دیکھ کر شوکی جیپ کے بونٹ سے نیچے اتر آیا۔ اس کی آنکھوں میں غصے اور نفرت کی لپیٹیں نکل رہی تھیں۔ مجھے سامنے پا کر اس نے گلی والوں کو دکھانے کے لیے زور سے زمین پر تھوکا اور چلا کر بولا ”دیکھ سینڈو۔۔۔ آج یہ کون سوراہم سے معافی مانگنے آیا ہے۔ ارے یہ تو 48 گھنٹے بھی تک نہیں پایا اپنی بہادری پر۔۔۔ لیکن یہ اکیلا کیوں آیا ہے، باقی تین جو کرکہاں ہیں؟“ ریحان جلدی سے بولا ”باقی تین بھی تم سے معافی مانگنا چاہتے ہیں لیکن ان کے والدین نے خوف کی وجہ سے انہیں گھروں میں نظر بند کر رکھا ہے۔ آیا ان سب کی طرف سے تم سے معافی مانگنے کو تیار ہے۔۔۔“ شوکی نے ریحان کی بات سن کر اپنے ساتھیوں سمیت ایک زور دار تھہہ لگایا ”کیا کہا۔۔۔ ان کے گھروں والوں نے چھپا رکھا ہے۔۔۔ چوڑے کہیں کے۔۔۔ کب تک شوکی سے بچیں گے۔۔۔؟“ پھر شوکی نے آس پاس کے دو کانداروں اور راہ گیروں کو بھیڑ اکٹھی کرنے کی غرض سے آوازیں دے کر بلا یا اور کچھ ہی دیر میں ہمارے ارد گرد کافی بڑا مجمع لگ چکا تھا۔ شوکی کو اس روز ہمارے ہاتھوں جو ہریت اٹھانا پڑی تھی اس کے تدارک کے لیے یہ سب بہت ضروری تھا کہ لوگ اپنی آنکھوں سے شوکی کے خلاف دخل اندازی کرنے والوں کا انجام دیکھ لیں۔ اب شوکی اور اس کے ساتھی صورتحال کا باقاعدہ لطف لے رہے تھے۔

”ہاں تو کیا کہہ رہے تھے تم۔۔۔ تمہارا یہ چھوٹا سوراہم بھائی۔ مجھ سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنا چاہتا ہے؟۔۔۔ کیونکہ اس کی عقل شکنانے آگئی ہے اور یہ اس دن کا تمام ہرجانہ بھی بھر نے کو تیار ہے۔۔۔ بھی واہ۔۔۔ لیکن میں یہ سب اس کی زبان سے سنبھالا چاہتا ہوں وہ کیا ہے کہ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ کل تک ہمارے سامنے اکڑنے والا تمہارا یہ بہادر بھائی آج کسی خوف زدہ چوہے کی طرح ہمارے تکوے چانٹے کے لیے تیار ہے۔۔۔“

میں چپ کیے کھڑا رہا۔ جب خود میرے اپنے گھروں والوں کو میری عزت نفس کا کچھ خیال نہیں تھا تو پھر یہ غنڈے اس کا پاس کیوں کرتے۔ ریحان میرے اندر کی حالت سے واقف تھا اور خود اس کی بے چینی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے مجھے کہنی ماری تاکہ میں اپنی زبان سے معافی کا لفظ ادا کروں۔

”مجھے معاف کر دو۔۔۔“ مجھ سے بڑی بھول ہوئی کہ میں تمہارے راستے میں آیا۔۔۔ میری زبان سے یہ جملہ سن کر شوکی نے نچلے درجے کے ادا کاروں جیسی نقل کی اور بولا ”میں نے کچھ سنائیں۔۔۔ کیوں بھائیو۔۔۔ تم لوگوں نے کچھ سننا۔۔۔ نہیں نا۔۔۔ تو بیٹا ذرا زور سے بولو۔۔۔ آج صحیح امی نے ناشتہ کروا کر نہیں بھیجا کیا۔۔۔؟“ شوکی کے مذاق پر اس کے دوستوں نے فرمائشی تھہہ لگائے۔ بھیڑ میں موجود کچھ بزرگوں کے چہرے پر

تاسف کے آثار ابھرے۔ ریحان نے بے چارگی سے میری جانب دیکھا۔ میں نے اس بار بآواز بلند معافی مانگی۔۔۔ ”مجھے معاف کر دو۔۔۔“ شوکی نے خوش ہو کر تالی بجائی۔۔۔ ”ہاں۔۔۔ یہ بات۔۔۔ لیکن کیا تمہیں تمہارے بڑوں نے معافی مانگنے کا طریقہ بھی نہیں سکھایا۔۔۔ بیٹا۔۔۔ معافی ہاتھ جوڑ کر مانگی جاتی ہے۔۔۔ آگے بڑھو اور ہاتھ جوڑ کر مجھ سے معافی مانگو۔۔۔“ مجمعے میں تیز سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔۔۔ شاید وہ سب میرے صبر کی انتہا کے منتظر تھے۔ ریحان نے آگے بڑھ کر خود شوکی کے سامنے ہاتھ جوڑنے کی نیت سے قدم اٹھایا، لیکن میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا اور خود شوکی کے سامنے جا کھڑا ہوا کچھ دیر تک ہم ایک دوسرے کی آنکھیں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔۔۔ شوکی کی آنکھوں میں بے چینی کی ایک اہری ابھری۔۔۔ خوف کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ خوف کو خوف کی حد میں رکھ کر دوسرے کو مجبور کیا جائے۔ اگر اس موقع پر میں شوکی کی بات ماننے سے انکار کر دیتا تو چاہے

مجھے بعد میں جو بھی نتائج بھگتنا پڑتے۔ لیکن شوکی کا علاقے کے لوگوں پر پھیلایا ہوا خوف کا یہ جال نٹ جاتا۔ اور اس وقت وہ اس کا ہرگز متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ پہلے ہی ہمارے ہاتھوں اپنے ڈر اور دہشت کے بت کو پاش پاش ہوتے دیکھ چکا تھا۔ اسے یہ بھی خبر تھی کہ میں یہاں اس کے خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے کھڑا تھا، لیکن شوکی نے پورے مجھے کوئی باور کرا رکھا تھا کہ میں اس کے خوف کی وجہ سے یہاں آیا ہوں۔ میں کچھ دیر مزید شوکی کی آنکھوں میں اس بے یقینی اور بے چینی کی لہر سے لطف اندوں ہونا چاہتا تھا لیکن ریحان کی بھرا تی ہوئی آواز نے مجھے ایسا نہیں کرنے دیا۔

”آیاں..... میری خاطریاں.....“ میں نے ریحان کی آنکھوں میں آنسو اور لبؤں پر انتباھ تھی۔ میرا بھائی مجھے اس وقت دنیا کا سب سے مجبور انسان نظر آیا۔ میں نے ایک قدم بڑھا کر شوکی کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔ شوکی کے دوستوں نے تالیاں پیشیں اور سیٹیاں بجا کیں۔ بھیڑ میں بہت سے لوگوں نے سر جھکا دیے۔ یہ صرف میری نہیں شاید ان کے اندر کے آدمی کی بھی شکست تھی۔ شوکی چند لمحے مجھے انہی سفاک نظروں سے گھوڑتار ہا اور پھر چلا کر سب کو سنانے کے لیے بولا ”آج تو معاف کیے دیتا ہوں..... لیکن آئندہ اگر شوکی کے راستے میں آیا تو میرے جو توں پر اپنا تھا بھی رگڑے گا تو نہیں معاف کروں گا.....“ میں پلٹ کر واپس جانے لگا تو شوکی نے ریحان کو آواز دی ”ستے ہو بڑے بھیا، اپنے چھوٹے بھائی کی غلطی کا جرم انہوں تو بھرتے جاؤ.....“

شوکی شاید بھیڑ کو یہ پیغام بھی دلوانا چاہتا تھا کہ ان لڑکوں نے اسے اس علاقے میں بھتہ لینے سے روکا تھا آج ان کا لیڈر خودا سے بھتہ دینے پر تیار ہے۔ یہ سارے نفیاتی حریبے شوکی جیسے غنڈوں کو بخوبی پڑتے تھے، اور شاید یہ ان کا کاروبار دہشت کے لیے ضروری بھی تھے۔ ریحان نے ٹوٹی ہوئی نظروں سے میری جانب دیکھا اور اپنی جیب سے دو ہزار روپے کے نوٹ نکال کر شوکی کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ یہ وہی دو ہزار روپے تھے جو میں نے گزشتہ رات ریحان کو امی کو دینے کے لیے حوالے کیے تھے۔ میری زندگی کی پہلی کمائی جسے دیکھ کر میری ماں کی آنکھوں میں چند لمحے کے لیے وہی اسے دے رکھا ہوگا۔ شوکی کے لیے ان دو ہزار روپوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ایسے جانے کتنے نوٹ وہ روزانہ آس پاس کی دوکانوں سے اوث کر لے جاتا ہو گا مگر میرے لیے وہ دو ہزار کیا تھے، یہ میں ہی جانتا تھا۔ اب اکی پوری پیشش، امی کے لیے مینے بھر کا سو دا سلف، چھوٹی کے لیے مہینوں سے کیا ہوا گرم شال کا وعدہ، ریحان کی پسند کی کوئی کتاب..... جانے کون کون سے خواب چھپے تھے ان دو ہزار کے نوٹوں میں..... چاہے ان میں سے کوئی ایک خواب ہی پورا ہوتا پر ہوتا جاتا..... ریحان نے میرا وہ پہلا معمصوم خواب شوکی کی ہتھیلی پر رکھ دیا تھا۔ شوکی نے چند لمحے ہقارت سے ان نوٹوں کو دیکھا ”ہونہہ..... بس..... اتنے کے تو شوکی روزانہ پان کھا جاتا ہے.....“ شوکی نے بے پرواہی سے وہ نوٹ اپنے سر سے وار کر چھپے کھڑے اپنے ساتھیوں پر پنچاہوں کر دیے۔ ریحان نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے بھیڑ کے اندر سے راستہ بناتے ہوئے واپسی کی راہ لی۔ لوگ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے ”جی ہے بھی..... ان غنڈوں سے کون نپٹ سکتا ہے۔“ ”لڑکے نے اچھا ہی کیا..... ورنہ ساری عمر کا نقصان اٹھاتا ہے.....“

”ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ سارنگا سے پنگا ان کو مہنگا پڑے گا.....“ ریحان سنی کرتے ہوئے تیزی سے میرا ہاتھ تھامے آگے بڑھتا

رہا..... میں تو پہلے ہی اپنی ساری ساعتیں کھو چکا تھا۔ میرے لیے اب کوئی لفظ معنی نہیں رکھتا تھا۔ شاید میں وہیں شوکی کے سامنے کھڑے کھڑے ہی مر گیا تھا۔

ریحان مجھے گھر لے جانا چاہتا تھا لیکن کیفے فراق کے سامنے میں نے اس سے اپنا بازو چھڑالیا۔

”تم لوگ جو چاہتے تھے وہ ہو گیا..... اب مجھے کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دو.....“ ریحان سٹ پشا سا گیا ”لیکن وہاں گھر میں سب لوگ ہمارا انتظار کرتے ہوں گے.....“

”تم تنہا واپس جا کر انہیں یہ شرم ناک داستان سن سکتے ہو.....“ میں ریحان کی مزید کوئی بات سنے بغیر وہاں سے پلٹ گیا۔ ریحان جانتا تھا کہ اس وقت میں اس کی کوئی بات نہیں مانوں گا۔ وہ پیچھے سے چلا کر بولا ”اچھا تھیک ہے لیکن جلدی گھرو اپس اوت آتا..... امی تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں گی.....“

میرا دل اس وقت زور زور سے رو نے کوچاہ رہا تھا۔ میں اتنی زور سے چینخنا چاہتا تھا کہ میری آواز سے آسان پھٹ جائے..... جانے میں کہاں جا رہا تھا؟ شاید کسی ایسے ہم درد کی تلاش میں جس کے سامنے میں اپنی روح پر لگے ان زخموں کی ٹیکیوں کو کچھ دیر کے لیے بھلا سکتا، اور پھر مجھے تب ہوش آیا جب میرا ہاتھ شیخ صاحب کے دروازے پر دستک دے چکا تھا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور تنوری میرے سامنے کھڑا تھا ”ارے..... بڑی لمبی عمر پائی ہے تم نے..... ما مولوں ابھی تمہارا ذکر ہی کر رہے تھے۔“ تنوری اپنا سیت میں آپ سے تم پر آ گیا تھا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر بیٹھ کی جانب لے گیا۔ صحن کے برآمدے میں ایک جانب بنے باور پی خانے سے دوپہر کے کھانے کی خوبیوں سے سارا آنکھ مکر رہا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میری بے وقت آمد آداب کے خلاف ہے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ مجھے وقت کا احساس ہی کب تھا بھلا؟ اور پھر جب کچھ ہی دیر بعد بیٹھ کی میں خوان آنے لگے تو میرے خدشات حقیقت میں بدل گئے۔ شیخ صاحب اور ان کے گھروالے میری آمد کے وقت دوپہر کے کھانے کے لیے بیٹھ چکے تھے اور میری وجہ سے انہیں انھنہا پڑا تھا۔ میں تنوری اور شیخ صاحب سے مذدرت ہی کرتا رہ گیا کہ مجھے بالکل بھوک نہیں ہے اور میں یوں اچانک آنے پر بہت شرمند ہوں مگر میز بان بھلا کب مہماںوں کے عذر سنتے ہیں؟ مجبورأ مجھے شیخ صاحب اور تنوری کا ساتھ دینے کے لیے نہ چاہتے ہوئے بھی چند نواں لٹکنا پڑے۔ بے وقت اور بنا بھوک کھانا بھی کیسی سزا ہے؟ اس کا اندازہ مجھے اسی روز ہوا۔ شاید انسان سدا ہی سے بس اپنی منشا کا غلام ہے۔

ای لیے یہ بڑے تیاگی اور جوگی اپنی مرضی کو ترک کر دینے میں ہی اپنی زندگی کا حاصل پوشیدہ سمجھتے ہیں۔

کھانے کے بعد درمیانی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور قہوہ تھما دیا گیا۔ جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ دروازے کی دوسری جانب گھنا تھی۔ شیخ صاحب نے باتوں کے دوران میری ڈنی غیر موجودگی کو محسوس کر لیا تھا اور پھر آخر مجھے انہیں آج کا تمام واقعہ تفصیل سے سنانا ہی پڑا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس تمام عرصے میں درمیانی دروازے کے پیچھے ہماری گفتگو کو مستقل سنا جا رہا ہو۔ لہذا بار بار یہ بھول جاتا کہ میں شیخ صاحب سے مخاطب ہوں یا پھر اس میجا سے کہ جس کے سامنے اپنے دل کا درد بیان کرتے ہوئے مجھے راحت محسوس ہو رہی تھی۔

میری بات ختم ہونے پر شیخ صاحب نے لمبی ہی سانس لی۔ ”چلو جو ہوا بہتر ہو امیاں..... دراصل میں خود بھی تمہیں یہی کہنے کے لیے کل سے بلا رہا تھا کہ اس فساد کو ختم ہی کر دو تو بہتر ہے۔ تم نے آج بڑی بہادری کا کام کیا۔ بہادری صرف دشمن کو زیر کر لینے کا ہی نام نہیں۔ اصل بہادر وہ ہوتا ہے جو اپنے

غصے اور خواہش پر قابو پالے۔ جو تم نے کر کے دکھا دیا....."

میں خاموش رہا۔ شیخ صاحب کچھ دیر کے لیے نماز ادا کرنے کے لیے معدودت کر کے اندر چلے گئے۔ پردے کے پیچھے سے تنویر کو برتوں کی واپسی اور مزید چائے کے لیے پوچھا گیا۔ تنویر نے برتن لونا دیے۔ میں نے جانے کے لیے اجازت طلب کی۔ شیخ صاحب بھی لوٹ آئے۔ جانے کیوں اس وقت میرا دل بہت عجیب انداز میں دھڑکا۔ شاید دل کی فریادیں کبھی کبھی براہ راست ساتوں آسمان سے بھی پرے قبولیت کے کسی ستون سے جا کر گلرا تی ہیں۔ تھیک اسی وقت جب میں شیخ صاحب سے رخصت طلب کر کے پلنے والا تھا۔ درمیانی پر دہ ہٹا اور شیخانی جی بیٹھک میں آگئیں۔

ان کے پس منظر میں ستارہ اور گہنا کی جھلک بھی دکھائی دے گئی وہ دونوں دروازے کے پرے رکی رہیں۔ شیخانی جی نے مجھ سے کہا کہ وہ اور دونوں بچیاں بھیتیں ہیں کہ مجھے کچھ دنوں کے لیے اس شہر سے کہیں باہر چلے جانا چاہئے تاکہ وہ غندے مزید کوئی شرارت نہ کر سکیں۔ میرا دل کچھ عجیب سے انداز میں دھڑکا۔ گویا وہ میرے بارے میں سوچتی ہے۔ ابھی اس کی ماں نے یہی تو کہا کہ وہ دونوں بھی ایسا سوچتی ہیں۔ ستارہ اور گہنا..... میری نظر اٹھی اور شیخانی جی کے پس منظر میں فلر مندی کھڑی گہنا پر پڑی۔ مجھے لگا جیسے دنیا میں سب کچھ برائیں ہے۔ کوئی ماہ رو ہے جو میرے لیے پریشان ہے۔ شیخانی جی نے مسکرا کر پوچھا "اب تو تمہارے ابا تم سے ناراض نہیں رہیں گے؟" اور ان کی بات ختم ہوتے ہی گہنا کی کھلتی آواز نے ماحول متبسم کر دیا "اور ہاں..... اگر اس بار آپ کے ابا آپ کو گھر بدر کریں تو فٹ پاتھ پر رات گزارنے کے بجائے یہاں آجائیے گا۔ یہ بھی آپ ہی کا گھر ہے۔" شیخ صاحب نے تنبیہ کی کہا..... ایسا نہیں کہتے..... میں بھی مسکرا یا۔" گھر بدر کیا تو آپ کی پیش کش پر ضرور غور کروں گا، لیکن اگر شہر بدر کرنے کے احکامات آگئے تو پھر کیا ہو گا....." سب زور سے نہ پڑے۔ وہ مسکرا کی اور میرا زندگی میں کھویا اعتماد بحال ہونے گا۔ دروازے پر رخصت کرتے وقت تنویر نے مجھے بتایا کہ وہ آج کل شام میں سی الیس ایس کی تیاری کر رہا ہے۔ اگر میں اس کے ساتھ جڑنا چاہوں تو اسے خوشی ہو گی۔ "نہیں تنویر..... یہ مقابلے کا امتحان وغیرہ میرے بس کی بات نہیں..... مجھے تو اس مستقل غلامی سے دور ہی رکھو..... ویسے تمہیں یہ خیال کیسے آیا.....؟"۔

"بس..... سوچا کہ یہ معز کہ بھی سر کر لیا جائے..... افرین کر دیکھا جائے....." میں نے مسکرا کر تنویر کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ "افرین کر ہمیں نہ بھول جانا جہاں پناہ....."

وہ بھر آوارہ گردی کے بعد میں شام ڈھلے کا لوٹی میں داخل ہوا تو محلے میں مشی کے گھر کے باہر غیر معمولی چہل پہل اور چند پولیس والوں کو کھڑا دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ اچانک بھیڑ میں سے راجہ دوڑتے ہوئے آ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ زار و قطار رورہا تھا۔

"کہاں تھا تو انو..... یار شوکی اور اس کے غندوں نے مشی کو بہت مارا ہے..... ابھی کچھ دیر پہلے اسے ایبو لینس میں ہسپتال لے کر گئے

یہ..... **کتاب گھر کی پیشکش**

## باب 8

## کتاب گھر کی پیشکش

میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ راجہ نے مجھے بتایا کہ شام کو جب مشی فٹ بال گراڈ سے واپس آ رہا تھا تو محلے کے باہر سے شوکی گروہ نے گھیر لیا اور اسے مجبور کرنے لگے کہ وہ ان سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگے ورنہ وہ اس کی بڑی پسلی ایک کر دیں گے۔ مشی کے انکار پر بات بڑھ گئی اور انہوں نے مشی کو بے رحمانہ تشدید کا نشانہ بنا کر وہیں سڑک کنارے پھینک ڈالا۔ بالا ایسوبولنس میں مشی کے ابا کے ساتھ ہسپتال جا چکا تھا اور راجہ میری تلاش میں نکلنے والا تھا۔ راجہ زار و قطار رورہا تھا۔ خود میرا دل ایسا ڈوب کر میرے لفظ ہی گم ہو گئے تھے۔ ہم ہسپتال پہنچ تو کالونی کے بزرگ مختلف ٹولیاں بنائے یہاں وہاں کھڑے سرگوشیوں میں مشغول تھے۔ انہی میں مجھے ابا بھی ایک ٹولی میں کھڑے دکھائی دیے۔ ریحان نے ہسپتال کی راہداری میں مجھے دیکھا تو تیزی سے میری جانب لپکا۔ ”کہاں تھے تم..... کب سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں.....“ میں نے ریحان کی سنی ان سی کرتے ہوئے اس سے پوچھا ”مشی اب کیا ہے.... کس وارڈ میں رکھا ہے اسے.....؟“ ریحان نے مجھے نظریں چڑائیں۔ وہ اسے آئی سی یومیں لے گئے ہیں..... ”میرے ذہن میں دھماکے سے ہونے لگے۔ مشی کو انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں لے جایا گیا تھا۔ مطلب اس کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے۔ میں ان سب کے ساتھ لرزتے قدموں سے آئی سی یوم کے باہر والی راہداری میں پہنچا تو وہاں ایک عجیب سی خاموشی طاری تھی۔ صرف بالا مشی کے ابا کے ساتھ راہداری میں دیوار کے ساتھ جڑی کرسیوں کی قطار میں خاموش سا بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ یوں تیزی سے اٹھ کر میری جانب بڑھا جیسے کوئی ناراض پچھا پنی ماں کو دیکھ کر اپنے ٹوٹے کھلونے کی شکایت کرنے کے لیے اس کی جانب دوڑتا ہے لیکن وہ میرے قریب آ کر بھی کچھ کہہ نہیں پایا۔ لیکن وہ میرے کاندھے پر سر کر کر روپڑا۔ اس کے ہاتھ میں مشی کی ٹوٹی ہوئی عینک کا فریم تھا۔ مشی کو پچپن میں ہی نظر کی عینک لگ گئی تھی اور ہم جب اسے چشم مش کہتے تھے تو وہ بہت چڑتا تھا۔ دراصل اس کا یہ بگڑا ہوا نام لیعنی مشی بھی اسی چڑیعنی چشم مش کی اگلی اختراع تھا۔ وہ جہانگیر سے چشم اور پھر مشی کب بنایا تو ہمیں یاد نہیں تھا لیکن اتنا ہم سب جانتے تھے کہ ہم چاروں میں وہ سب سے زیادہ نازک اور نفاست پسند تھا۔ گھر کا اکلوتا پچھے ہونے کی وجہ سے اپنی ماں کا شدید لاؤ لاؤ اور باب کی آنکھوں کا تارا تھا۔ اسے شروع سے ہی ان لڑائی جھگڑوں سے سخت کوافت ہوتی تھی اور ہمارے ہر پھٹے کی شروعات سے ہی اس کی یہ کوشش رہتی تھی کہ معاملہ صلح صفائی سے ہی مل جائے تو بہتر ہے، لیکن اگر معاملہ آخر کار اس کے بر عکس بھی ہوتا تو اس نے کبھی پیچھے نہیں دکھائی تھی۔ مشی کی درجنوں عینکیں ان جھگڑوں کے دوران ٹوٹی تھیں لیکن آج بالے کے ہاتھ میں وہ شکستہ شیشوں والا فریم دیکھ کر میرا دل مکڑے مکڑے ہوا جا رہا تھا۔ کیونکہ آج ہمارا دوست تنہادمن کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اگر ہم میں سے کوئی ایک بھی مشی کے ساتھ ہوتا تو ان کی اتنی ہمت نہ ہوتی کہ وہ تنہامشی کو لا کارتے۔ ہمیں جدا کرنے والے بھی اس جرم میں برابر کے شریک تھے۔ اچانک راہداری کے آخری سرے سے پچھا فرماق اور مرزا ابوکھلائے ہوئے سے آتے دکھائی دیے۔ مشی کے ابا نے جلدی سے پوچھا ”خون کا انتظام ہو گیا.....؟“

”ہاں..... خون تو ہم بلڈ پینک میں جمع کر آئے ہیں اور ڈاکٹر کو اطلاع بھی کر دی ہے، لیکن شاید اور ضرورت بھی پڑ جائے۔“ مشی کے ابا نے

ہاتھ آسمان کی جانب اٹھا دیے "یاماںک... بس تیراہی آس را ہے... میرے بچے پر حم کر..."

کتنی عجیب بات تھی کہ ہم تین دوستوں میں سے کسی کا بھی خون مشی کے خون کے گروپ سے میل نہیں کھاتا تھا جبکہ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ اتنا عرصہ ساتھ رہنے کے بعد دوستوں کا خون بھی ایک جیسا ہو جاتا ہو گا کیونکہ یہ وہ رشتہ ہے جو خون کے رشتہوں کو بھی پار کر جاتا ہے۔

جانے کب گھری شام رات میں ڈھلی اور کب رات کو صبح کے اجائے نے نگل لیا۔ ہمارے لیے وقت اور گھریاں ٹھہر چکی تھیں۔ ہم وہیں آئیں سی یو کی راہداری میں دیواروں سے ٹیک لگائے بیٹھے رہے۔ مشی کی حالت بگڑے اڑتا لیس گھنٹوں سے زیادہ گزر چکے تھے۔ جب بھی وارڈ کا دروازہ کھلتا ہم سب کے دل دھک سے رہ جاتے۔ مجھ میں تو اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر کھڑکی کے شیشے سے اسے پیوں میں لپٹا پڑا دیکھوں۔ پولیس والے تین چار مرتبہ مشی کا بیان لینے آچکے تھے لیکن وہ ہوش میں آتا تو کوئی بیان دیتا میں نے مرزا کے ذریعے اسماعیل کو پیغام بھجوادیا تھا کہ شاید میں دو چار روز ٹیوشن کے لیے نہ جاسکوں۔ لہذا وہ مجھے لینے نہ آئے۔ ریحان نے دبے لفظوں میں مجھے ایک دوبار گھر چل کرتا زہد ہو جانے کا کہا لیکن وہ خود بھی جانتا تھا کہ میں اب یہاں سے تب تک نہیں ٹلوں گا جب تک مشی کی حالت سنجھل نہیں جاتی۔ اسی اور رافعہ محلے کی باقی عورتوں سمیت اب تک دوبار وارڈ کے باہر ہی سے مشی کو دیکھنے آچکی تھیں۔ البتہ مشی کی اماں تو اسی وقت سے جائے نماز پر سجدے میں پڑی ہوئی تھیں جب سے انہیں اپنے لاڈلے کی خبر ملی تھی وہ مشی کو دیکھنے بھی نہیں آئی تھیں۔ رجاء اور بالا بھی دوروز سے اپنے گھروں کو نہیں گئے تھے۔ ہم تینوں کے دل کے اندر اس وقت جو طوفانِ الہر ہاتھا سے ہم نے صرف مشی کی ابتر حالت کے پیش نظر اپنے سینے میں دبار کھا تھا، اور شاید کہیں نہ کہیں اس جوار بھائی کی خبر ہمارے والدین کو بھی تھی۔ تبھی جب تیری رات محلے کے بزرگ مشی کے ابا کو تسلی دے کر گھر لوٹنے کے لیے پڑئے تو انہوں نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلا یا۔

"غھے میں آکر ایسا کوئی قدم نہ اٹھا لینا کہ جس کے لیے بعد میں تمہیں پچھتا وا ہو۔ اللہ نذیر کے بنیے کو جلد شفا عطا کرے، یاد رکھو.... قانون ایسے غندوں سے نپنٹنے کے لیے ہی بنائے....."

میرا جی چاہا کہ ان سے پوچھوں کہ اس وقت یہ قانون کہاں تھا جب ہم چاروں حوالات میں بند تھے، لیکن میں چپ رہا۔ یہ وقت ان سے بحث کے لیے مناسب نہیں تھا۔ مجھے آج تک ایک بات کی سمجھ نہیں آئی تھی کہ شرافت انسان کو بزول بنادیتی ہے یا بزول اپنے اوپر شرافت کا لادہ اور ہر تھیں؟؟ شرافت کی اصل تعریف کیا ہے؟ اور کیا تھا نے کچھری جیسی جگہیں صرف شریفوں کے نام پر ہی ہمیشہ کے لیے بھلے لگادیتی ہیں کیا شرافت اجلالیاں اس قدر نازک ہوتا ہے کہ ان مقامات سے صرف گزر ہی اسے ہمیشہ کے لیے داغ دار کر دیتا ہے؟ کہ انہیں ہمیشہ سے نہ ہو لوگوں کی گزرگاہ سمجھا گیا ہے۔

تو پھر شرفا کو انصاف دلانے کے لیے کب اور کون سی جگہ وجود میں آئے گی؟ اگر کسی شریف کا واسطہ کسی غندے سے پڑ جائے تو وہ داوسی کے لیے کہاں جائے؟ کیونکہ بقول ابا تھانہ کچھری جانا شرفا کو زیب نہیں دیتا۔ کاش حکومت نے شرفا اور غیر شرفا کے لیے علیحدہ سے انصاف کی فراہمی بھی ممکن ہنا۔ ہوتی کیونکہ جس دو غلے، منافق اور بو سیدہ معاشرے میں ہم نے جنم لیا ہے وہاں تو انصاف سے متعلق ہر مقام کو پہلے ہی ناکامی کا سامنا ہے یا پھر شاید یہ بھی ہم جیسے نام نہاد شرفا کا حقیقت سے فرار کا ایک خود ساختہ بہانہ ہے۔ دراصل یہ ہم جیسے شرفاء ہی ہوتے ہیں جو اس غندہ گردی کے پھلنے پھونے کا باعث ہوتے ہیں۔ ہمیں صرف گلیوں کے لکڑ، سنان چوراہوں اور گھر کی چار دیواری کے پیچے چھپ کر سرگوشیاں کرنا آتی ہیں۔ ہم برائی کے خلاف اعلان

کرنے کی جرأت ہی نہیں رکھتے، صرف کسی غیبی نجات دہنہ کے انتظار میں ہجوم کا حصہ بننے رہتے ہیں۔ کبھی ہجوم سے ایک قدم آگے بڑھ کر ظالم کو لکارنے کی ہمت نہیں کرتے۔ کیونکہ ہمیں تھا رہ جانے کا خوف ہر دم ستاتا ہے۔ مجھے اس روز اپنے اروگروں کی اس منافقت سے گھن آنے لگی تھی۔

آخر آسمان کو ہم پر حرم آیا اور تیرے دن مشی نے ذرا دیر کے لیے آنکھیں کھو لیں۔ اتفاق سے اس وقت اس کے نزدیک بالا موجود تھا۔ وہ چیختا چلاتا شور مچاتا پاہر راہداری میں نکل آیا۔ مشی کے باکے ہاتھ سے تسبیح گرگئی اور میں گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ بالے کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

”انو..... یار..... وہ..... وہ مشی کو ہوش آرہا ہے۔“ ہم سب اندر کی جانب بھاگے، راہداری میں کھڑا تھا نے دار بھی اپنے مشی کے ساتھ لپکا۔ مشی کی نظر مجھ پر پڑی تو اس کے نیلے ہونٹوں پر وہی بچپن والی معصومی مسکرا ہٹ ابھری۔ اس کی آواز سرگوشی نہ تھی۔ ”انو..... کہاں تھا یار.....“

میں نے جلدی سے مشی کا ہاتھ تھام لیا، میں تھیں ہوں۔۔۔ اب میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔۔۔ تھانے دار نے جلدی سے ہمیں ایک طرف کیا اور مشی پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ”تمہاری یہی حالت کس نے بنائی۔۔۔ کیا تم ان لوگوں کے نام بتا سکتے ہو۔۔۔ انہیں پہچان سکتے ہو۔۔۔؟“

مجھے تھانیدار کی بات پر شدید غصہ آگیا۔ ”آپ کو بھی تک ان کے ناموں کا پتہ نہیں چلا۔۔۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے کہنے پر آپ نے اس

روز ہمیں گرفتار کیا تھا۔ آپ کو بھی تک ثبوت اور گواہ کی تلاش ہے۔“ تھانے دار نے کڑی نظروں سے مجھے دیکھا۔

”ویکھوڑ کے۔۔۔ مجھے بیان لینے دو۔۔۔ میں یہ ساری حقیقت زخمی کی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔۔۔“

ٹھیک اسی لمحے مشی کے اباۓ مشی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ اشارہ کیا جو ہر مجبور اور غریب باب اپنے تیس اپنی اولاد کی بہتری کے لیے کر سکتا ہے۔ مشی نے بے چارگی سے ہماری طرف دیکھا اور آنکھیں موندھ لیں ”نہیں۔۔۔ میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتا۔۔۔ نہ ہی دوبارہ سامنے آنے پر پہچان سکوں گا کیوں کہ اس وقت شام کا اندر ہیرا پھیل چکا تھا۔“

راجہ اور بالے نے اپنا سر پھیٹ لیا۔ تھانے دار اپنی کارروائی پوری کرنے کے لیے مشی سے سوالات کرتا رہا اور آخر کارڈ اکٹر کی مداخلت پر

بیان ختم کر کے وہاں سے چلا گیا۔

مشی کے بے ہوشی کے وقوف میں بذریعہ کمی آتی گئی۔ چوتھے روز اس نے زبردست ہمیں کپڑے اور شکلیں بدلنے کے لیے گھر بھجوادیا۔

پانچویں روز میں چند لمحوں کے لیے ناہید کو ٹیوشن دینے بھی چلا گیا۔ ناہید کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ وہ غیر ضروری سوالات سے ازحد پر ہیز کرتی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکرا ہٹ آگئی۔

”آیاں بھائی۔۔۔ اچھا ہوا آپ آگئے۔۔۔ میں اور بوا بھی آپ کا ہی ذکر کر رہے تھے۔۔۔ پتہ ہے بھیا۔۔۔ بابا بھی آج رات کی فلاٹیٹ سے واپس آ رہے ہیں۔۔۔ یقیناً آپ ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔۔۔“ میں ناہید کی دل جوئی کے لیے اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ ورنہ میرا دھیان کہیں اور ہی تھا۔

ٹیوشن سے فارغ ہو کر ہسپتال پہنچا تو شیخ صاحب تنوری سمیت کمرے سے نکلتے نظر آئے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے گلہ کیا۔

”یہ کیا میاں۔۔۔ اتنی بڑی بات ہو گئی اور تم نے ہمیں خبر تک نہیں کی۔۔۔ وہ تو اچھا ہوا کہ تنوری میاں کی مرزا صاحب سے ملاقات ہو گئی اور

ان سے اس سانحہ کا پتہ چلا۔“ میں نے جواز پیش کیا۔

”وراصل میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آپ پہلے ہی گھر کی پریشانیوں میں گھرے ہوئے ہیں.....“

لیکن شیخ صاحب اب تک ناراض سے تھے ”نہیں آیاں میاں..... بس آپ نے ہمیں اپنا نہیں سمجھا..... اور کچھ نہیں..... جانتے ہو یہ بات سن کر شیخانی جی اور بچیاں کس قدر پریشان ہیں۔ تم آجاتے تو انہیں بھی کچھ حوصلہ ہو جاتا۔“

”ضرور حاضر ہوتا لیکن آپ جانتے ہیں کہ مشی کی حالت بہت سیر یں تھی۔ ابھی دورات پہلے ہی تو اس نے آنکھیں کھوئی ہیں۔“ شیخ صاحب کے چہرے پر دکھ کے تاثرات ابھرے۔ ”ہاں میاں..... بڑا ظلم کیا ایں ظالموں نے..... خدا انہیں پوچھ گا.....“ میرا جی چاہا کہ میں ان سے کہوں کہ ”اگر ہر ظالم کو اس دنیا میں خدا نے خود پوچھتا ہوتا تو آج یہ دنیا جنت ہوتی۔“ لیکن میں چپ رہا۔ شیخ صاحب کچھ دیر پیش کے بعد مجھ سے جلد گھر آنے کا وعدہ لے کر اٹھ گئے۔

راجا اور بالے کو میں نے کسی کام سے باہر بھیج رکھا تھا الہڑا آہٹ پر میں چونک چونک جاتا تھا۔ آخر سازھے دس بجے کے قریب وہ پہنچ گئے۔ میں نے انہیں ہونتوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ہم تینوں مشی کو غنوڈی میں چھوڑ کر باہر راہداری میں آگئے۔ راجہ کی آواز دھیمی لیکن پر جوش تھی۔ ”کام کی ابتداء ہو گئی ہے..... ریگل سینما کی چھپلی گلیوں میں آج رات ہفتہ مانگنے والوں سے نہنے کے لیے یہ چڑڑ کے تیار کر دیے ہیں اور وہ قدیر ہے نا۔ ہائی اسکول والا ہمارا کلاس فیلو وہ آج کل شام کے کسی اخبار کا رپورٹ لگا ہوا ہے وہ کورنیج بھی دے گا اس واقعے کی۔ بس دعا کرو کہ کوئی چوک نہ ہو جائے.....“

”کوئی بات نہیں..... اگر آج وہ ہم سے چوک بھی گئے تو کل پھر آئیں گے۔ اب یہ جنگ ہم میں سے کسی ایک کے خاتمے پر ہی ختم ہو گی۔“

ہم نے فیصلہ کرایا تھا کہ اب اس بحث خوری کے خلاف خود میں ہی کوئی قدم اٹھانا ہو گا، اور اس کام کے لیے ہم نے آس پاس کی گلیوں میں موجود اپنے جیسے درجنوں فارغ الاوقات نوجوانوں کو متحرک کرنے کا فیصلہ کیا تھا جنہیں راتوں کو گلیوں کی نکڑ اور سڑک کے تھڑوں پر پیش نہیں اور گپ شپ کے علاوہ دوسرا کوئی کام نہیں تھا۔ ہم چاروں کی پیدائش اسی علاقے کی تھی اور ہم میں سے ہر ایک کہ بہتوں سے جان پچان تھی۔ ہمارے اسکول کے لڑکے کالج اور اب یونیورسٹی کے ہم جماعتوں کی ایک کشیر تعداد انہی گلیوں میں بستی تھی۔ ان سب کے والدین بھی انہیں دن بھرنا کارہ اور نالائق ہونے کے طمعنے دیتے تھے اور ملک کے لاکھوں کروڑوں نوجوانوں کی طرح ان کا مسئلہ بھی صرف ایک ہی تھا ”روزگار“ لیکن میں جانتا تھا کہ ابھی ان میں سے ایسے بہت سے ہوں گے جن کے دلوں پر منافقت کی مہربانی گئی ہو گی۔ ان کے اندر بہتے خون میں اتنا اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کے جراثیم بھجوک، بے کاری اور بے روزگاری کے طعنوں نے ختم نہیں کیے ہوں گے۔ البتہ شوکی اور اس کے گروہ کو ہم نے اپنے لیے رکھ چھوڑا تھا اور ہم رات دیر تک اس پیامبر کا انتظار کرتے رہے جسے ہم نے شوکی کی خبر دینے پر لگا رکھا تھا۔ آخر صبح کی اذان سے کچھ دیر پہلے مرزا ہانپتے کا نیچے ہپتال پہنچ گیا۔“ وہ لوگ پٹھان کے ہوٹل پر چائے پر اٹھنے کے ناشتے کے لیے رکے ہیں پٹھان انہیں ناشتہ دینے میں کچھ دیر لگائے گا۔ میں اشارہ کر آیا ہوں۔“ ہم تینوں اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ مرزا کچھ ہچکایا ”ایک بار پھر سوچ لو۔ بات بہت بڑھ جائے گی۔“ ”بات تو پہلے ہی بہت بڑھ چکی ہے۔ تم بس یہ دھیان رکھنا کہ ریگل چوک سمیت کم از کم دو چار مکلوں میں ان گروہوں کو آج رات تھیک نکر لمنی چاہئے۔ شوکی گروہ پر حملہ کی خبر تیزی سے گلیوں میں پھیلنی چاہئے۔“ مرزا تیزی سے راہداری میں ہمارے پیچے پکا ”اس کی قسم فکر نہ کرو۔۔۔ مگر مٹھرو۔۔۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“ مرزا تیزی سے ہمارے سامنے آگیا۔

بالے نے اسے گلے لگایا "نمیں مرزا جی..... تمہیں اور بہت سے کام کرنے ہیں....." وہ پیچھے سے ڈوٹی ہوئی آواز میں چلا یا "اپنا خیال رکھنا تالا لقہو....." ہم جب پٹھان کے ہوٹل کے قریب پہنچ تو ہمیں دور سے ہی شوکی اور اس کے دوساریوں کے قلقے سنائی دیے۔ شاید یہ ان کا روز کا معمول تھا کہ دریافت تک ہفتے اکٹھا کرنے یا آوارہ گردی کرنے کے بعد یہاں مفت کا ناشتہ کرنے آتے تھے۔ ہم ان کی بے خبری میں کچھ یوں اچانک ان کے سر پر پہنچ کے انہیں سمجھنے کا ذرا بھی موقع نہیں ملا۔ پھر راجہ کی ہاکی اور بالے کی بائیک کی چین ان پر کچھ اس طرح بری کہ مشی کے جسم پر لگے ہرزخم اور ہر نیل کا حساب برابر ہوتا چلا گیا۔ کچھ ہی دری میں اس کا رخیر میں پٹھان کے ہوٹل کے وہ ننھے منے بیرے اور چھوٹو بھی شامل ہو گئے جونہ جانے کب سے روزاں اس وقت شوکی کی گاہیوں اور عتاب کا نشانہ بنتے تھے۔ پٹھان پہلے تو انہیں روکنے کے لیے چیخ رہا تھا پھر کچھ دری بعد وہ بھی اپنے شاگردوں کو شاباشی دینے لگا "ماروان خانہ خرابوں کو..... اس کا بڑی توڑو....." شوکی اور اس کے ساتھی ہتھیاروں سے لیس تھے لیکن شاید انہیں یہ ہتھیار استعمال کرنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ ہتھیار بہت دن تک استعمال نہ ہوں تو اسے زنگ لگ جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے حرام کی روٹیاں توڑنے والوں کا اندر زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ ہمارے سامنے بھی چند زنگ آلود جسم ٹیڑے میڑھے زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ میں نے شوکی کو کھینچ کر ایک جھٹکے سے کھڑا کر دیا "معافی مانگنے کے آداب یاد ہیں تمہیں"۔ شوکی نے بنا کچھ کراہتے ہوئے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ میں نے اس کا گریبان چھوڑ دیا اور وہ کسی کے ہوئے شہیر کی طرح زمین پر ڈھنے لگا۔

اس کے بعد وہی ہوا جو ہم نے سوچ رکھا تھا۔ ہم گھروں کو جانے کے بجائے کیفے فراق کے باہر آ کر بیٹھ گئے۔ سازھے آٹھ بجے پولیس کی چیپیں ہمارے استقبال کو پہنچ گئیں۔ اس سے پہلے ہم مرزا کو اپنے لیے وکیل کرنے کا تمام طریقہ کار سمجھا چکے تھے۔ مرزا نے ہمیں بتایا کہ اس رات ریگل سینما سمیت چار مقامات پر بھتہ خوروں سے علاقے کے لڑکوں کی جھڑپیں ہو چکی تھیں۔ صبح کے اخبارات میں چھوٹی مگر نمایاں خبروں میں بہت لینے والوں کے خلاف اس ایکی کا ذکر تھا۔ ہمیں بنا کسی تقتیش کے حوالات میں منتقل کر دیا گیا۔

کچھ ہی دری میں بالے اور راجہ کے اباکتے جھکتے اپنے بیٹوں کو کوستے ہوئے تھانے پہنچ گئے لیکن اس بار پولیس نے انہیں باہر ہی روکے رکھا۔ میرے گھر سے اب تک کوئی نہیں آیا تھا۔ پہنچ نہیں مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ اس بار ابا مجھے لینے نہیں آئیں گے۔ پولیس نے اس بار ہم پر دفعات بھی بہت سخت لگائی تھیں اور پھر عصر کے وقت تک میرے خدشات نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ مجھے ڈوبتے سورج کے سے ریحان کی روشنی صورت دکھائی دی۔ اسے چند لمحوں کے لیے مجھ سے بات کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔ اس نے آتے ہی میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"انوریار..... یہ کیا کر دیا....." میں نے اس کی طرف دیکھا

"ابا نہیں آئے....." ریحان نے مجھ سے نظریں چاکیں۔

"میں انہی کا پیغام پہنچانے آیا ہوں۔ انہوں نے کہلا بھیجا ہے کہ وہ اب تم سے کوئی رشتہ باقی نہیں رکھنا چاہتے۔ نہ ہی تم جیل سے رہا ہوئے کے بعد گھر کا رخ کرنا۔ انہوں نے تمہارے ساتھ ہر تعلق ختم کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔"



## باب 9 کتاب گھر کی پیشکش

میرے ہوتوں پر ایک زخمی مسکراہٹ اجھری "اس کا مطلب یہ ہوا کہ مغل اعظم نے شہزادے سلیم کو عاق کر دیا آخر کار....." میں ریحان اور چھوٹی جب کبھی اپنے موڑ میں امی کو نگ کرنے بینجا کرتے تھے تو ہم اندازہ لگایا کرتے تھے کہ اگر کبھی اپنے غصے میں مجھے عاق کر دیا تو میں ان کے کس کس ترکے سے محروم ہو جاؤں گا۔ میں انگلیوں پر گنتا "ایک ٹوٹی ہوئی سائیکل، دوپانے پار کر پین، ایک زنگ زدہ چھڑی....." اور پھر امی ہمارے مارنے کو پکتیں تو ہم ہستے ہوئے بھاگ جایا کرتے تھے، لیکن آج اپنے آخ کار مجھ سے اپنا رشتہ توڑنے کا اعلان کر رہی دیا تھا۔ ریحان نے جلدی سے مجھے تسلی دی۔

"ایسی بات نہیں ہے آیاں..... وہ تم سے اب بھی بہت پیار کرتے ہیں..... بس ذرا غصے میں ہیں اس لیے ایسا کہہ رہے ہیں۔ تم نے بھی تو ان کی آج تک ایک نہیں مانی....."

"میری بات ہوتی تو میں نے آج تک انہی کی بات کے سامنے سرجھ کایا ہے..... لیکن تم جانتے ہو اس بار معاملہ کچھ اور تھا۔ آج اگر مشی کی جگہ ان کا اپنا بیٹا اس ہسپتال کے بستر پر یوں پڑا ہوتا تو کیا بھی وہ مجھے یا تمہیں یوں لتعلق رہنے کا حکم دیتے ہیں؟..... ہمارے والدین کے سمجھی اصول سمجھی ضابطے صرف اپنی اولاد کے لیے ہی کیوں ہوتے ہیں.....؟"

ریحان چپ رہا۔ وہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ دوسروں کی مان لینے والا۔ خود ہار جانے والا۔ اسی لیے تو وہ ہمیشہ سب کے دل جیت لیتا تھا، اور میں ہمیشہ سب کچھ جیت کر بھی ہار جاتا تھا۔ آج شاید میں نے ایک اور رشتہ کھو دیا تھا۔

ریحان میرے پاس مزید نہ رہنا چاہتا تھا لیکن سفتری نے اسے واپس بلا لیا۔ میں واپس حوالات میں آیا تو راجہ اور بالا میرے کہہ بنا ہی سب کچھ سمجھ چکے تھے۔ بالے نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا "فکر نہ کریا۔..... یہ سارے ابا ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ ناریل کی طرح اوپر سے کڑک اور اندر سے ملائی کی طرح نرم۔ تیرے ابا بھی تجھے معاف کر دیں گے آخر کار....."

باہر اندر ہیرا چھا چکا تھا۔ ایک سپاہی نے آکر حوالات کے سامنے لگی ہوئی گیس بتی کی لو اونچی کی "تم لوگوں میں سے آیاں کون ہے.....؟" میں کھڑا ہو گیا۔ "چلو تمہاری ضمانت ہو گئی ہے....." میں نے حرمت سے راجہ اور بالے کی جانب دیکھا "میری ضمانت؟..... کس نے دی.....؟" سفتری نے معنی خیز نظروں سے میری جانب دیکھا "بڑے کرمون والے ہو سمجھی..... ورنہ میں نے تو آج تک سارنگا کے نائب کو خود کبھی کسی کی ضمانت کے لیے تھانے آتے دیکھا..... نہ سنا" ہم تینوں اچھل ہی تو پڑے "کیا کہا، سارنگا کا نائب میری ضمانت کے لیے آیا ہے.....؟" بالے نے میرا ہاتھ مضبوطی سے کپڑا "انویا۔..... مجھے تو یہ کوئی سازش لگتی ہے۔ ضرور وہ تجھے تھانے سے نکال کر کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہے....."

سپاہی زور سے ہنسا "اے نقصان پہنچانا ہو تو یہ حوالات اس کی پہنچ سے کیا دور ہے....." پھر اچاک اسے احساس ہوا کہ انجانے میں شاید وہ

کوئی "غیر سرکاری راز" افشا کر بیٹھا ہے۔ اس نے جلدی سے بات بدلتی "چلو جلدی کرو..... ایس ایج اوس صاحب کے کمرے میں تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔"

میں نے باہر نکلتے وقت راجہ اور بالے کو اطمینان رکھنے کا اشارہ کیا۔ تھانے دار کے کمرے کے دروازے پر ایک جھولتی ہوئی پرانی چک پڑی ہوئی تھی۔ جہاں سے ایک خاص بیڑی کے دھویں کی مہک نے باہر نکل کر اس تمام اندھیری راہداری کو مہکار کھاتا۔

میں چک اٹھا کر کمرے میں داخل ہوا تو تھانے دار موبد سا بیٹھا ہوا سامنے والے کو کچھ وضاحت کر رہا تھا۔ کمرے میں دو اور اشخاص

اپنے مضبوط بازوؤں کے کف کہنی تک چڑھائے مستعد سے کھڑے تھے۔ شاید وہ بیٹھے ہوئے شخص کے محافظ تھے۔ تھانیدار کہہ رہا تھا "لیکن موی بھائی ان تینوں نے شوکی اور اس کے ساتھیوں کی ہڈی پسلی ایک کر کے رکھ دی ہے۔ وہ تینوں اس وقت ہڈیوں کے وارڈ میں داخل ہیں..... لو یا آگیا

تمہارا مجرم..... اسی کا نام آیا ہے..... بھی ان سب کا سر غذہ ہے....."

کری پر بیٹھا ہوا شخص کھڑا ہو گیا اور میری جانب پڑتا۔ وہ چالیس پینتالیس سال کا ایک دراز قد آدمی تھا۔ چہرے پر نوکیلی موجھیں، گلے

میں کسا ہوا تعویز اور داسیں ہاتھ پر مضبوطی سے بندھا ہوا امام ضامن..... بازوؤں کی مچھلیاں کرتے کی آستین سے پھٹ کر باہر نکلنے کو تیار، ایک ہاتھ

میں لو ہے کا سخت کڑا، آنکھوں میں سمندر جیسی گہرائی اور کرخگی، چہرہ ہرا حساس سے عاری اور گھنے بال لثوں کی صورت میں گدی سے ہو کر شانوں پر

چھوٹ رہے تھے۔ وہ موی تھا۔ کچھ دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کی جانب دیکھتے رہے۔ موی کی آنکھوں میں ضرور کچھ بات تھی۔ کچھ عجیب سی

لہر..... جیسے ایکس رے..... وہ بغور میرا جائزہ لیتا رہا اور پھر مسکرا کر بولا "اچھا..... تو یہ ہے وہ بہادر جس نے ایک ہی رات میں سارنگا کی چارٹویوں

سے نکلی ہے..... خوب..... بہت اچھا کیا..... اس حرام خور شوکی کی تو پچھی ہوئی پسلیاں بھی توڑا لئی چاہئے تھیں تجھے..... جی خوش کر دیا....."

موی تھانے دار کی طرف مڑا..... "کوتوال جی..... شوکی کی طرف سے کیس میں واپس لیتا ہوں۔ تم اس جوان کو ضمانت پر رہا کر دو

کوئی کاغذ بھرنا ہے تو ابھی بھرو والو....."

ایس ایج اونے مستعدی سے کہا..... "لکھت پڑھت بھی ہو جائے گی۔ جب آپ نے کیس ہی واپس لے لیا ہے تو پھر بات ختم ہو گئی۔

جاو بھی..... تم اپنے گھر جاسکتے ہو....."

"میں اپنے دوستوں کو لیے بغیر واپس نہیں جاؤں گا..... اگر رہا کرنا ہے تو ہم تینوں کو رہا کرو..... ان پر بھی وہی الزام ہے جو مجھ پر تھا....."

تحانے دار نے موی کی طرف دیکھا۔ موی نے سر ہلا�ا۔

"لگتا ہے دوستی کے سمجھی سبق پڑھ چکے ہو..... کوتوال جی..... اس کے دوستوں کو بھی جانے دو....." تھانے دار کے اشارے پر باہر کھڑا

ایک پاہی حوالات کی جانب چلا گیا میں نے موی سے پوچھا "میں اس مہربانی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟" موی نے تازہ بیڑی زبان سے بھگو کر ہونٹوں میں دبائی۔ اس کے قریب کھڑے ایک محافظ نے جلدی سے بیڑی کو تیلی دکھائی۔ موی نے ایک گہرا اش لیا

"کیا کریں شہزادے..... تیری سفارش ہی بڑی اوپنجی آئی تھی..... تمہی تو ماں کے مجھے یہاں بھیجا ہے..... جا ب گھر جا..... تیرے گھر

والے تیری راہ دیکھتے ہوں گے....."

انتہے میں بالا اور راجہ بھی سپاہی کے ساتھ کمرے میں آگئے۔ موی نے انہیں بھی غور سے دیکھا اس کے انداز میں کچھ ایسی دلچسپی تھی جیسے کوئی بزرگ اپنے خاندان کے چند شریر بچوں کو سرزنش بھی کر رہا ہوا اور ساتھ ہی ان کی شرارت کا مزہ بھی لے رہا ہو..... اس نے آگے بڑھ کر پہلو انوں کے انداز میں راجہ اور بالے کے شانوں پر زورڈا اور ہم سب کے بازوں کو ٹوٹوں ٹوٹوں کر دیکھا ”ہڈیاں مضبوطی سے بھائی ہیں اپنی اپنی جگہ پر تم سب نے ..... میرے حرام کے جتنے تو گلتا ہے صرف روٹیاں ہی توڑتے رہے آج تک .....“ ہمارے لیے سارے نگاہ کا یہ روپ بالکل ہی غیر متوقع تھا۔ آخر اس نے ہماری مدد کے لیے اپنے خاص کارندے موی کو تھانے ہماری ضمانت کے لیے کیوں بھیجا تھا۔ جبکہ ہمارے خلاف اس بارatenے بڑے ازمات تھے کہ ہم آرام سے چھ چھ ماہ کے لیے جیل کی ہوا کھا سکتے تھے۔ اگر سارے نگاہ کو ہم سے کوئی بدله لینا تھا یا ہمیں نشان عبرت بنانا تھا تو اس کے لیے ابھی اس کے پاس بہت وقت پڑا تھا۔ پھر ہمیں تھانے سے نکلنے کی اتنی جلدی کیوں؟ ہو سکتا ہے وہ اپنے حساب کتاب زیادہ دیر باقی نہ رکھنے کا عادی ہو؟؟

ہم جتنا سوچتے اتنا ہی مزید الجھتے رہے۔ جب ہم کیفے فراق کے قریب پہنچے تو رات کے ساڑھے بارہ نج رہے تھے۔ مرزا اور فراق پچا جا چکے تھے۔ ہم تینوں میں سے سب سے زیادہ مجھے گھروپس جانے میں جھجک ہو رہی تھی، لیکن مجبوری تھی۔ گھر کے علاوہ ہمارے پاس کوئی اور ٹھکانہ بھی تو نہیں تھا۔ راجہ نے جدا ہونے سے پہلے مجھے اور بالے کو تھنی سے تاکید کی کہ اب ہم تینوں میں سے کوئی بھی اکیلا کالونی سے باہر نہیں جائے گا۔ جب تک سارے نگاہ کی نیت ہم پر پوری طرح کھل نہیں جاتی تب تک ہمارا تھا گھومنا بے حد خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ ایسی ہی ایک غلطی کی سزا ہم مشی کے ہسپتال میں پڑے گھائل جسم کی صورت میں بھگت رہے تھے۔

اپنی گلی میں پہنچ کر میرے قدم خود بخودست پڑ گئے۔ میں نے جھوکتے ہاتھوں سے دروازے پر دستک دی۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر میں نے زمین سے دو چار سنکراٹھائے اور وقفے و قفے سے صحن میں اچھاں دیے۔ کچھ ہی دیر میں صحن میں کسی کے بھاگنے کی آواز سنائی دی اور دوسرا ہی لمحے کھلے دروازے سے چھوٹی نے جھانکا۔ اس کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی ”آیاں بھائی..... آپ آگئے.....“ مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور رہا ہو جائیں گے۔ آپ جانتے ہیں آپ کے لیے آپ کی چھوٹی لکناروئی ہے.....“ چھوٹی کے آنسو اب بھی ملکنے کے لیے تیار تھے۔ میں نے اس کے سر پر ملکی چپت لگائی اور صحن میں داخل ہو گیا ”کیوں تمہیں تو خوش ہونا چاہیے تھا..... صبح ناشتے کی ملائی کا ایک حصہ دار تو کم ہوتا تا.....“ اب تمہارا اور اس پڑھا کو پروفیسر کاراج ہوتا سارے دسترخوان پر.....“ چھوٹی روٹے روٹے نہس پڑی ”نہیں چاہیے اب مجھے اپنا حصہ..... کل سے میں اپنا حصہ بھی آپ کو دے دیا کروں گی..... لیکن اب آپ کہیں نہ جائیے گا..... آپ چھت پر چلیں میں آپ کے لیے کھانا گرم کر کے لاتی ہوں.....“ میں نے ایک قدم ہی اٹھایا تھا کہ ابا کی سردی آواز گوئی

”وہیں رک جاؤ..... اب تمہارا اس گھر پر کوئی حق نہیں ہے..... تم کس منہ سے واپس آئے ہو..... ہم سب کے چہرے پر کا لک پوت کر.....“

ای ان کے پیچے برآمدے میں لکھیں .....“ یا آپ کیا کہہ رہے ہیں..... وہ اپنے گھرنے آتا تو اور کہاں جاتا.....؟.....“ ابا چلائے ”نہیں ہے

یا اس کا گھر..... اس گھر کو اپنا سمجھتا تو اس کی عزت کا بھی پاس ہوتا اے..... اخباروں تک شہرت پہنچ گئی ہے اس کی اوفر گردی کی..... لوگ بازار میں مجھے روک روک کر پوچھتے ہیں کہ یہ آیان احمد آپ کا سپوت ہے جو شہر کے سب سے بڑے غنڈے سے الجھتا پھرتا ہے..... مطلب یہ تو اس غنڈے سے بھی بڑا غنڈا ہوا..... ”

اتنے میں ریحان بھی چھٹت سے نیچے اتر آیا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ رات دیر تک چھٹت پر میرے کمرے میں کھلی ہوا میں بیٹھ کر کچھ نہ کچھ پڑھتا رہتا تھا..... اس نے میری طرف داری کی ہمت کی..... ” نہیں ابا..... اب انکو اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا ہے..... اب یہ آئندہ ایسا کچھ نہیں کرے گا۔ ”

ابا اگر جے ”بس..... بہت ہو گیا..... خبردار جواب اگر کسی نے بھی اس کی طرف داری کی کوشش بھی کی..... پوچھو اس سے..... کیا میں نے اسے منع نہیں کیا تھا کہ اس بھگڑے میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے..... کیا میں نے اسے خود ہپتال میں خاص طور پر یہ حکم نہیں دیا تھا کہ خود کو اس غنڈے گردی سے علیحدہ رکھے..... لیکن اس نے ایک نہیں کئی بار پھر پورے خاندان کو رسوا کر دیا..... ”

میں نے سراہھیا ” انہوں نے ہمارے دوست کو موت کے منہ تک پہنچا دیا..... کل کو یہ سلوک وہ میرے یار ریحان کے ساتھ بھی کر سکتے ہیں..... کیا تب بھی آپ..... اب انے غصے سے کا نپتے ہوئے میری بات کاٹ دی ” ریحان کو مت ملا اپنے ساتھ..... یہ تمہاری طرح افون نہیں ہے..... ” گویا ابا کو اس بات سے فرق نہیں پڑتا تھا کہ کوئی مجھے مار کر پھینک جائے انہیں تو بس اپنے بڑے اور سعادت مند بیٹے کی فکر تھی۔ امی نے میرے چہرے کے تاثرات پڑھ لیے اور وہ جلدی سے بولیں

” یا آپ کیا کہہ رہے ہیں ریحان کے ابا..... دونوں بیٹوں میں فرق تونہ کریں..... ” ابا امی کی طرف پلٹے ” اس نے مجھے مجبور کر دیا ہے یہ فرق روا رکھنے کو..... کہو اس سے کہ اگر یہ ریحان کی طرح بننا چاہتا ہے تو آج سب کے سامنے تمہارے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائے کہ یہ آئندہ اپنے ان آوارہ دوستوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھے گا۔ صرف اسی صورت میں میں اسے معاف کروں گا۔ ”

ابا کی بات سن کر سب ہکا بکا سے رہ گئے۔ دنیا کی سب سے کڑی شرط رکھی تھی انہوں نے مجھے معاف کرنے کی۔ ماحول پر سناٹا سا چھا گیا۔

پھر میں نے ہی خاموشی توڑی ” ہم چاروں میں سے ہر ایک کے والد دوسرے تینوں کے لیے وہی خیالات رکھتے ہیں جو آپ کے ان کے بارے میں ہیں اور ہم میں سے ہر ایک خود کو باقی تین کی بدنامی کا باعث سمجھتا ہے۔ اگر میں ریحان کی طرح پڑھائی میں بہت زیادہ تیز نہیں ہوں تو اس میں ان تینوں کا نہیں..... میرا قصور ہے ابا..... اور پھر خدا نے ہر انسان کو الگ ذہن اور الگ استطاعت دی ہے، لیکن میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ آپ کے معیار پر پورا اتر سکوں، لیکن ہر طالب علم کا نصیب یا خواہش صرف سرکاری نوکری ہی تو نہیں ہوتی اور شاید میں کوئی بہت اچھا سرکاری نوکر بن بھی نہ پاؤں کیونکہ صبح نو سے شام پانچ بجے تک کی پابندی میرے مزاج کے خلاف ہے..... شاید میں کچھ اور کرنا چاہتا ہوں..... شاید میرا نصیب اور خواہش کچھ اور ہو..... ”

امی چھوٹی اور ریحان دم سادھے میری بات سن رہے تھے۔ کیونکہ زندگی میں پہلی بار میں نے ابا سے ایک ہی وقت میں اتنی بھی اور سیدھی

بات کی تھی۔ ورنہ ہمارے درمیان نسلی فاصلہ کچھ اتنا طویل تھا کہ ہوش سننے کے بعد صرف سلام دعا، ڈاٹ یا کسی ضرورت کے وقت میری ابادے بات ہوتی تھی اور وہ بھی بذریعہ امی، چھوٹی یا ریحان اور صرف مجھ پر کیا موقوف۔ مجھے تو لگتا تھا کہ ہمارے ملک کی نوے فی صد غریب اور اوسمی درجے کی نوجوان نسل اپنے ماں باپ سے کھل کر اپنی بات نہیں کر پاتے۔ ابا کی سانس میری لمبی تمہید کے دوران پھر تی رہی۔ ”بہت خوب۔ تو آج تم نے اپنے باپ کے سامنے کھڑے ہونے کا فیصلہ کرہی لیا ہے۔ ٹھیک ہے۔ شاید ایک دن ایسا ہونا ہی تھا۔ تو تم اپنے دوستوں کو نہیں چھوڑ سکتے۔ اب ذرا یہ بھی بتا دو کہ تم کرنا کیا چاہتے ہو۔ ساری زندگی سینکڑ اور تھرڈ ڈویژن کے نمبروں سے بمشکل پاس ہونے والے کو ایسی کون سی پیشکش ہو گئی ہے لاکھوں روپے مہانہ کمانے کی۔؟“

”ماتا ہوں کہ میں ساری زندگی بہت کم نمبروں سے کامیاب ہوا ہوں لیکن اس کی وجہ میری نالائقی سے زیادہ میری زیادہ نمبر لینے کی دوڑ میں شامل نہ ہونے کی خواہش بھی تھی۔ میں نے ہمیشہ 35 نمبروں کو ہی کافی سمجھا۔ کیونکہ میرے مضمون ہمیشہ آپ کے منتخب کردہ ہوتے تھے۔ آپ نے کبھی مجھے یہ سوچنے ہی نہیں دیا کہ میں خود کیا پڑھنا چاہتا ہوں۔ کیا بنتا چاہتا ہوں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں آج اپنے آپ کو ہی گم کر بیٹھا ہوں۔ میرا تعلیمی کیریئر اوس طد درجے کا ہے اور میرے سامنے کوئی بڑی منزل نہیں ہے۔ مجھے چار پانچ گریڈ کی کسی سرکاری نوکری پر ہی اکتفا کرنا پڑے گا جو میں کرنہیں سکتا۔“

ایں نے بات بگزتے دیکھ کر مجھے ڈائیٹ ”انو۔ یقہ کیا کہہ رہا ہے۔ اپنے ابادے کوئی ایسے بات کرتا ہے۔؟“  
ابانے امی کو روک دیا ”نہیں کہنے دو اے۔ اس کے اندر کا زہر باہر تو آئے۔ تاکہ تم سب کو بھی پڑھ چل سکے کہ اس کے دل میں اپنے بات کی کتنی عزت ہے۔ اب سنو آیاں میاں۔ میں نے تمہاری سن لی۔ اس گھر میں اب تم اسی وقت رہ سکتے ہو جب اپنے باپ کو کچھ بن کے اور کچھ کر کے دکھاؤ گے۔ دوسری صورت وہی ہے کہ تمہیں یہاں رہنے کے لیے وہی سب کچھ کرنا ہو گا جو میں تم سے ہمیشہ کہتا آیا ہوں۔ اپنی تمام آوارہ گردی ترک کرو اور اپنے بھائی کی طرح اپنے باپ کا سہارا بننے کی کوشش کرو۔ نہ کہ اپنے بزرگوں کا نام یوں بازاروں میں اچھاتے پھرو۔ میں اس کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔“

میں نے حتمی فیصلہ کر لیا ”ٹھیک ہے۔ اگر آپ بھی چاہتے ہیں تو میں اس گھر میں تبھی قدم رکھوں گا۔ جب کچھ بن جاؤں گا۔ نہ بن سکا تو آپ کو اپنی صورت کبھی نہیں دکھاؤں گا۔“

ای جواں باختہ ہو گئیں۔ ”انو۔ دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تیرا۔۔۔ ریحان۔۔۔ تو کچھ کہتا کیوں نہیں اپنے چھوٹے بھائی کو۔۔۔“ لیکن ریحان کی تو اپنی سیٹی گم تھی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑنے کے لیے میری جانب لپکا۔ چھوٹی روپڑی ”آیاں بھائی۔۔۔ مت جائیں۔۔۔“ لیکن ابا چٹان کی طرح مضبوط کھڑے رہے۔ میں ریحان سے ہاتھ چھڑا کر گھر سے باہر نکل آیا۔ اندر امی اور چھوٹی رو روکر ابا کو دہائیاں دیتے رہے لیکن ریٹا رڑھیدہ ماسٹر تو قیر احمد کے اندر کا سخت گیر استاد آج اسے کسی دہائی کے سامنے پکھننے نہیں دے رہا تھا۔ ریحان نے میرے پیچھے آنے کی کوشش کی تو اب اے زور سے ڈاٹ کر اسے اندر بلایا۔

میرے دل و دماغ میں اس وقت آندھیاں چل رہی تھیں۔ ہم غریب لوگوں کی جیسیں کتنی بھری ہوئی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں ایسٹ پھر کی کوئی بھی دیوار ان کی دیوار سے بلند نہیں ہو سکتی۔ میرے اور ابا کے درمیان بھی آج وہی دیوار کھڑی ہو گئی تھی۔

میرے قدم ایک بار پھر اسی مہربان بیٹھ کی طرف بڑھتے گئے جو ہمیشہ سے کیفے فراق اور میری تھائیوں کا ساتھی تھا میں بہت دریافت کر آسمان کے تاروں سے پوچھتا رہا کہ اب کہاں جاؤں .....؟ تارے مجھے دیکھ کر روتے رہے اور میرے سوالوں سے منہ چھپاتے رہے۔ جانے کتنی دیر بیت گئی اور مجھے احساس بھی نہیں ہوا کہ کوئی موڑ میرے سامنے سے گزر کر آگے جا کر رک گئی ہے اور پھر اس میں سے کوئی اتراء ہے۔ میں اس وقت چونکا جب کسی نے میرا شانہ ہلا�ا۔ ”کیوں جوان ..... گھر نہیں گئے اب تک“ وہ موی تھا ”گیا تھا ..... لیکن اب انے گھر سے نکال دیا .....“ موی نے تاسف سے سر ہلا�ا۔ ”یہ ساری دنیا کے بزرگوں کو ایک ہی مسئلہ ہوتا ہے کیا .....؟ اچھا چلو ..... ماں ک تھیں بلا رہے ہیں .....“ میں نے بے دھیانی میں پوچھا ”کون“۔

”ارے بھائی رنگا بھائی ..... اپنے ماں ک تھیں بلا رہے ہیں ..... وہاں سامنے گاڑی میں .....“ میں زور سے چونکا ..... ٹھیک اسی لمحے دور کھڑی کار کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک قدم نیچے اترنے کے لیے باہر نکلا۔

## کتاب گھر کی پیشکش \* کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com>

## کتاب گھر کا پیغام

کتاب گھر کی پیشکش

آپ تک بہترین اردو کتابیں پہنچانے کے لیے، ہمیں آپ ہی کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ہم کتاب گھر کا اردو کی سب سے بڑی لائبریری ہیں، لیکن اس کے لیے ہمیں بہت ساری کتابیں کمپوز کروانا پڑیں گی اور اسکے لیے مالی وسائل درکار ہوں گے۔

اگر آپ ہماری براہ راست مدد کرنا چاہیں تو ہم [kitaab\\_ghar@yahoo.com](mailto:kitaab_ghar@yahoo.com) پر رابطہ کریں۔ اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو کتاب گھر پر موجود **ADs** کے ذریعے ہمارے سپانسرز و یہ سائنس کو وزٹ سمجھئے، آپ کی یہی مدد کافی ہو گی۔

کتاب گھر کی پیشکش

یاد رہے، کتاب گھر کو صرف آپ بہتر بناسکتے ہیں۔

## باب 10 کتاب گھر کی پیشکش

کار سے نیچے اترنے والا شخص سارنگا ہی تھا۔ لمباقد، تابنے جیسی تیز گندمی رنگت، آنکھوں میں ہلکی سی سرفی اور سر مے کی دھار، بال سلیقے سے پیچھے کو والٹائے ہوئے، فراخ ماتھا، ہونٹوں میں دبایاں، مضبوط کسرتی بدن، دائیں ہاتھ کی کلامی میں تنگ پیش کا کڑا اور باسیں ہاتھ میں بہت قیمتی گھڑی، مہنگی بوکلی کا کرتا اور سفید کلف والی لٹھے کی شلوار میں ملبوس، بے خیالی میں اپنی موچھوں کوتاؤ دیتے ہوئے وہ واقعی کسی چھوٹی موٹی ریاست کا سلطان محسوس ہو رہا تھا۔ میں موی کے ساتھ چلتے ہوئے نئے ماڈل کی بی ایم ڈبلیو کار کے قریب پہنچ گیا۔ موی نے ہنستے ہوئے دور ہی سے سارنگا کو اطلاع دی..... ”کہتا ہے اب انے گھر سے نکال دیا ہے..... ادھر بھی اپنی ہی کہانی ہے مالک.....“

موی کی بات سن کر رنگا کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری ”تو توچ مج نالائق تھا موی.....“ تجھے تو گھر سے نکال کر اچھا ہی کیا ہو گا تیرے ماں باپ نے.....“ پھر اس نے غور سے میری جانب دیکھا۔

”تو کہے تو میں خود چال کر تیرے باوے سے بات کروں..... انہیں بتاؤں کہ ہمارا تجھ سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ لہذا وہ تجھے معاف کر دیں.....“

”نہیں..... اس کی ضرورت نہیں ہے..... اور پھر آپ کو میرے ساتھ دیکھ کر تو انہیں پورا لیکن ہو جائے گا کہ میں.....“

میں کچھ کہتے کہتے رک گیا لیکن رنگا نے میری بات پکڑ لی تھی۔ اس نے زور کا قبھرہ لگایا اور موی سے کہا

”لے بھائی موی..... شہر میں صرف تو ہی اکیلا بدنام نہیں..... اپنا نام بھی شامل ہے اس افسانے میں..... ویسے لڑکا کہتا تو ٹھیک ہے..... اپنے تقدم بھی جس چوکھت پر پڑ جائیں اسے دیکھ مار جاتی ہے..... تو پھر تو ہی بتا کر رنگا تیرے لیے کیا کر سکتا ہے..... تیرے لیے کہیں رہنے کا بندوبست کر دوں جب تیرے باواراضی ہو جائیں تو واپس چلے جانا..... اور اطمینان رکھ۔ کسی کو یہ پتہ نہیں چلے گا کہ یہ بندوبست رنگا بھائی کی طرف سے ہے۔“

”نہیں..... آپ کا بہت شکر یہ..... میں کچھ کر لوں گا.....“

”جیسے تیری مرضی بھی..... خوش رہ“ رنگا نے کار کا پچھلا دروازہ کھولا۔

”چل بھی موی..... ہماری نیا بھی پار لگا دے.....“ موی ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ کی جانب بڑھا۔ رنگا کار میں بیٹھ چکا تھا۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر کھڑکی سے اندر جھانکا ”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے ہم سب کی ضمانت کیوں دی۔ ہم تو آپ کے دشمنوں میں سے ہیں۔“ سارنگا نے غور سے میری جانب دیکھا ”سارنگ کا دشمن زمین میں چھفت نیچے یا پھر چھفت اوپر منگا ہوتا ہے سا جن..... اور وہ لوٹنے لپاڑے میرے آدمی نہیں میرے آدمیوں کے درکر ہیں۔ گلیوں سے پیسے جمع کر کے اپنا گزارہ کرتے ہوں گے..... تو نے ٹھیک کیا ان حرام کے جنوں کے ساتھ..... کافی نام خراب کر ڈالا تھا انہوں نے رنگا کا بے فکر رہ..... اب ان میں سے کوئی تیری راہ میں نہیں آئے گا۔ آئے تو کاش ڈالنا..... آگے رنگا

سنجدال لے گا....."

"لیکن آپ مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہیں۔ میں تو آپ کوٹھیک سے جانتا بھی نہیں ہوں....."

رنگا نے اپنا سر جھکا۔ "اسا عیل کو تو جانتا ہے نا۔۔۔ وہی حرام خور خبر لے کر آیا تھا تیری۔۔۔ چل اب اپنے داماغ کو زیادہ نہ تھکا۔۔۔ زیادہ سوال ہمیشہ چیزوں کو الجھادیتے ہیں۔۔۔ جو گنجی جتنی کھل سکے۔۔۔ اسے اتنا ہی کھولا کر۔۔۔" سارنگا نے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ گاڑی آگے بڑھنی اور میں اپنے ذہن میں نہ جانے کتنی بندگی تھیاں لیے وہیں کھڑا رہ گیا۔

اسا عیل کا رنگا کے ساتھ کیا تعلق تھا؟ اور اس نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ وہ رنگا کو جانتا ہے۔ میں صبح تک یونہی الجھا بیٹھا رہا، اور پھر جب فجر کے بعد مرزا اور پھر فراق چچا کیفے پر آئے تو میری حالت جان کر پریشان ہو گئے۔ چچا فراق تو باقاعدہ غصے میں کھڑے ہو گئے۔

"لگتا ہے ہمیڈ ماسٹر صاحب سے آج تفصیلی بات کرنی ہی ہو گی۔۔۔" اتنے میں راجہ اور بالا بھی آگئے۔ انہیں بھی شاید ابا کے فیصلے کی کوئی سن گن مل چکی تھی۔ وہ مشی کے لیے ہسپتال ناشتے لے جانے کے بہانے سے گھر سے نکلے تھے۔ راجہ جذباتی ہو گیا۔

"یارا نو۔۔۔ اب ہم بھی اپنے گھروں میں نہیں رہیں گے۔ یہاں کسی کو ہماری فکر نہیں ہے۔"

مرزا نے انہیں ڈالنا۔" بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔ سب گھروں کو تمہاری فکر ہے۔ تبھی وہ تم لوگوں کو منع کرتے ہیں لیکن اس وقت انہیں تمہاری بات سمجھنیں آ رہی ہے۔۔۔ یہ جزیشن گیپ Generation Gap ہے پیارے۔۔۔ بھرتے بھرتے بھرے گا۔۔۔" میں نے فراق چچا کا

ہاتھ پکڑ کر بڑی مشکل سے انہیں روکا۔۔۔ "نہیں۔۔۔ اب ابا سے کوئی بھی اس معاملے میں بات نہیں کرے گا۔ وہ اپنی جگہ درست ہوں گے کہ ہر باپ ایک کامیاب اولاد کی خواہش رکھتا ہے، لیکن شاید وہ مسن چاہی کامیابی ہر اولاد کا مقدر نہیں ہوتی میں اپنی منزل اب خود تلاش کروں گا۔۔۔ کم از کم منزل

نہ ملنے کی صورت میں بھٹک جانے کا الزام تو میرے سر ہی رہے گا۔۔۔؟" وہ سب خاموش ہو گئے ہم کچھ دیر کے لیے مشی کے پاس ہسپتال بھی گئے۔ اسے گھروں سے خبر مل چکی تھی کہ اس کا یہ حال بنانے والوں کو ہم نے کسی دوسرے ہسپتال کے بستر وں کی زینت بنادیا ہے۔ وہ ہمارے لیے بہت فکر مند تھا۔" انویار۔۔۔ یہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہوا۔۔۔ اگر تم لوگوں کو کچھ ہو جاتا تو۔۔۔" راجہ نے بھی سی انگڑائی می۔۔۔" ہو جاتا تو ہم تینوں بھی اسی وارڈ

میں پڑے ہوتے اور اس سرکاری ہسپتال کی خوبصورت نرسوں کو بار بار بہانے سے بخار چیک کروار ہے ہوتے۔" مشی نے تکمیل اٹھا کر اسے مارا۔" تم کبھی نہیں سدھرو گے۔"

ہسپتال سے نکلنے کے بعد میں نے راجہ اور بالے کو ان کے گھر جانے کا کہا۔ وہ دونوں بیک وقت بوئے۔" لیکن اس وقت تم کہاں جاؤ گے۔۔۔؟"

"میں کچھ دیر کے لیے شیخ صاحب کی طرف جانا چاہتا ہوں۔۔۔ شام ہونے سے پہلے مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔۔۔"

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔" اوہ۔۔۔ تو گویا شیخ صاحب کے ہاں ڈیرہ ڈالنے کی ٹھانی ہے جناب نے۔۔۔ ہم تو بھول ہی گئے تھے کہ اپنے آیاں کا ایک سرال سادات محلے میں بھی ہے۔۔۔"

”بکومت..... تم کیا سمجھتے ہو کہ میں ان کے گھر رہنے کے لیے جا رہا ہوں .....؟ وہ بہت پریشان تھے۔ انہیں یہ بتانا ضروری ہے کہ رنگا والا معاملہ ختم ہو گیا ہے.....“

جاتے جاتے راجہ نے ایک جملہ اور پھینکا ”کچھ بھی کر لینا آیاں پیارے ..... پر کہیں گھر داما دبنے کی ہائی نہ بھرا آتا“، میں نے انہیں گھور کر دیکھا لیکن میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ کالونی کی طرف بڑھ چکے تھے۔ میں سادات محلے میں شیخ صاحب کی گلی میں پہنچا تو سورج سر پر آچکا تھا اور چند لمحے پہلے تک سکون سے دھڑکنے والا میرا دل اس وقت کچھ اس طرح سے دھڑک رہا تھا کہ جیسے چند ہی لمحوں میں پسلیوں کی حوالات توڑ کر باہر آگئے گا۔ ہمیشہ کی طرح گھنا کا سامنا کرنے کا سوچ کر ہی میری سانسیں تیز اور گلا خشک ہونے لگا تھا۔ لاکھوں کی بھیڑ میں کوئی ایک چہرہ ہماری اندر ورنی حالت کو ایسے یکسر کیسے بدلتا ہے .....؟ میں یہ راز بھی جان نہیں پایا تھا۔

دستک پر دروازہ ستارہ نے کھولا۔ میں نے شیخ صاحب کا پوچھا تو وہ کہیں کام سے لٹکے ہوئے تھے، تنور بھی اپنے کانج کی نوکری کو جا چکا تھا۔ میں نے مایوس ہو کر واپسی کے لیے قدم تو لے۔

”ٹھیک ہے تو پھر آپ شیخ صاحب کو میرا پیغام دیجئے گا کہ آیاں ان سے ملنے آیا تھا۔ میں پھر حاضر ہو جاؤں گا.....“  
دروازے کی اوٹ سے ستارہ کی لپکتی سی آواز ابھری.....

”آپ اندر آ جائیں ..... ابا کچھ دیر میں آ جائیں گے .....“  
میں ذرا جھجھکا ”لیکن اس وقت گھر میں کوئی مرد.....“

”آپ غیر توانیں ہیں ..... ابا کو اگر پتہ چلا کہ ہم نے آپ کو یوں دروازے سے لوٹا دیا تو وہ بہت ناراض ہوں گے۔ میں بیٹھ کا دروازہ کھلواتی ہوں ..... آپ وہاں بیٹھ کر ابا کا انتظار کر سکتے ہیں .....“

ستارہ ہر یہ کوئی بات نے بغیر اندر چل گئی اور پھر کچھ دیر کے بعد اندر برآمدے سے اسی کی آواز دوبارہ ابھری  
”اندر آ جائیں .....“

میں اندر داخل ہوا۔ صحن میں آگے برآمدے میں بیٹھ کاراستہ مجھے معلوم تھا۔ ستارہ وہیں برآمدے کے ایک ستون کی آڑ میں کھڑی رہی اور میں بیٹھ میں داخل ہو گیا۔ کچھ دیر بعد شیخانی جی اندر آئیں اور سلام کے جواب میں دعا دے کر مجھے بیٹھنے کا کہا۔ وہ کافی پریشان و کھلائی دے رہی تھیں۔

”کل مرزا صاحب ملے تھے انہیں ..... انہوں نے بتایا کہ تم لوگوں کا پھر کوئی جھگڑا ہوا ہے ان بدمعاشوں سے، آیاں بیٹھا میری مانو تو اس معاملے کو یہیں ختم کر دو، ان کا تو کام ہی تھا نہ کچھ رہی ہے، لیکن تمہارے بوڑھے والدین شاید زیادہ دیر یہ سب کچھ سہہ نہ پائیں۔“

”جی ..... ایسا ہی ہو گا ..... آپ بے فکر ہیں .....“

”جیتے رہو ..... تم بیٹھو میں تمہارے لیے شکنجیں بنو کر بھیجنی ہوں ..... شیخ صاحب قریبی ڈاک خانے تک گئے ہیں۔ بس آتے ہوں گے .....“ شیخانی بھی انہ کر اندر چل گئیں اور ان کے اٹھتے ہی درمیانی پردے کے پیچے سے ہلکی سی کھنکار سنائی دی۔ میرا سن ڈول سا گیا۔ وہ گھنا ہی تھی

”جناب آیاں صاحب..... آج آپ ایک بات تو پتا کیں..... یہ ساری دنیا میں ایک آپ ہی ہیں جسے سب سے زیادہ غصہ آتا ہے.....؟“ مجھے اس کے انداز پر نہیں آگئی ”کیوں..... آپ کیوں پوچھ رہی ہیں.....؟“ وہ واقعی غصے میں تھی ”اس لیے کہ غصہ کسی اور کو بھی آ سکتا ہے۔ آخر آپ ہم سب کو اتنا پریشان کیوں کرتے ہیں.....؟..... آپ کو بانے پہلے بھی کہا تھا ناکہ ان لڑکوں کے منہ نہ لگیں..... لیکن آپ نے تو کسی کی بات بھی نہ مانے کا تھیہ کر رکھا ہے۔ شاید.....“ گھنپا پردے کے پیچھے ہی سے یہ ساری باتیں کر رہی تھی مگر میں اس کے لیے چہرے پر غصے کے آثار اور اس کی شریکت کی بار بار کی پریشانی یہاں سے بھی دیکھ سکتا تھا۔ ”معافی چاہتا ہوں..... لیکن مجھے خبر نہیں تھی کہ کوئی میرے لیے اتنا پریشان ہے.....“ میرے شرارت بھرے جواب پر وہ مزید جز بزر ہو کر رہ گئی ”یہی تو آپ کا مسئلہ ہے..... آپ کو بھی کسی بات کی خبر ہی نہیں ہوتی۔ ستارہ آپ بھی آپ سے بے حد ناراض ہیں۔“

”اچھا چلیں..... جھگڑا ختم کریں اور اپنی ستارہ آپی سے پوچھ کر کوئی ہرجانہ طے کر دیں..... میں بھرنے کے لیے تیار ہوں.....“ اس کی چوڑیاں ٹکنیں ”ہرجانہ تو آپ کو ضرور بھرنا پڑے گا۔ تیار رہئے گا، اور ستارہ آپی کو آپ سے کچھ کام بھی ہے..... وہ بھی آپ ہی کو کرنا ہو گا.....“ اتنے میں دروازے پر کچھ آہٹ ہوئی اور شیخانی جی خود ہی شربت کی ٹرے لیے اندر داخل ہوئیں۔ پردے کے پیچھے خاموشی چھا گئی۔ میں

نے جلدی سے ٹرے تھام لی ”ارے..... آپ نے کیوں زحمت کی.....“

”زحمت کیسی بیٹا..... ستارہ نے میری مدد کی ہے..... وہ تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہے لیکن شیخ صاحب کے سامنے اسے جھبک ہوتی ہے۔ تمہارے پاس وقت ہے تو ذرا اس کی بھی سن لو.....“ میں ہر بڑا سا گیا ”جی جی..... ضرور۔“ شیخانی جی نے ستارہ کو آواز دے کر اندر بیٹھک میں ہی بلوالیا۔ وہ جھگھکتی ہوئی سی اندر آئی اور سست کر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ شاید غم اور یاس کا پسلی رنگ سے کوئی گہر اتعلق ہوتا ہے۔ تبھی اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی چار سو پیلا ہٹ سی چھا گئی۔ اس کی پلکیں جھکی ہوئی اور لب نیلگوں سے تھے۔ ستارہ نے مجھ سے کہا۔ ”میں ایم۔ اے فائل میں تھی کہ اسے پڑھائی چھوڑنی پڑی۔ شادی کے بعد تعلیم مکمل کرنے کا ارادہ تھا لیکن حالات نے اس بات کی مہلت ہی نہ دی، لیکن اب وہ محسوس کرتی ہے کہ اسے بڑے بھائی کی غیر موجودگی میں باپ کا سہارا بننا چاہئے۔ تو نیراپنے طور پر توہ خاطرداری کرتا ہے مگر ایک تխواہ میں وہ اتنے لوگوں کا بوجھ کیسے اور کب تک اٹھا پائے گا۔ جو جائیداد اور مال متاع تھا وہ سب سیلا ب بہا کر لے گیا۔ ان کا بڑا بھائی صیغراپنے علاقے میں حکومت کی جانب سے کسی امداد کے انتظار میں بیٹھ بیٹھ کر سوکھ چکا ہے لیکن وہاں سے بھی کچھ ملنے کی امید نظر نہیں آتی۔ اس لیے گھر کا خرچ بانٹنے کے لیے اس نے کچھ کام کرنے کی ٹھانی ہے۔ تو نیرا سے ذکر اس لیے نہیں کیا کہ وہ مردوں میں کبھی یہ ہونے نہیں دے گا۔ لہذا اگر میری نظر میں کوئی بھی سلامی کڑھائی کا یا اس سے ملتا جلتا کوئی بھی ایسا کام ہو تو میں ستارہ کو ضرور مطلع کروں۔“ میں چپ چاپ ستارہ کی بات سنتا ہا اور سوچتا ہا کہ اس نازک سی لڑکی کی مدد کیسے کروں۔ میں اسے یہ بھی کہنا چاہتا تھا کہ یہ زمانہ گدھ کی نظر رکھتا ہے اور اس جیسی شفاف دامن ہستی کے سفید کورے دامن پر داغ لگانے میں یہ سماج ذرا سی دری بھی نہیں کرے گا۔ عورت جتنی محفوظ اپنے گھر کی چار دیواری میں ہوتی ہے اتنی محروم شاید کسی مسجد مندر میں بھی نہ ہو۔

اچاک میرے ذہن میں ایک کونڈا ساپ کا ”آپ بیوشن کیوں نہیں پڑھاتیں یہیں گھر پر۔ اس طرح آپ کو گھر سے باہر بھی نہیں نکلا پڑے گا اور آپ گھر کے خرچے میں ہاتھ بھی بٹا سکیں گی۔“

”ہاں میں نے سوری بھائی سے ٹیوشن کی بات بھی کی تھی۔ مگر اتنے دن گزر گئے کام نہیں بنا۔ دراصل آج کل طالب علم خود چل کر جانے کے بجائے استاد کو گھر بلانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ میں دوسروں کے گھر جانے کو بھی تیار ہوں مگر کوئی بات بننے تو سہی.....“

”یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں دو ہزار روپے کی ایک ٹیوشن لے رہا ہوں لیکن شاید اب جاری نہ رکھ پاؤں۔ میں وہاں آپ کی بات

چلاتا ہوں.....“

”نہیں نہیں۔ وہاں کیوں۔ وہاں تو آپ خود ہی پڑھائیے۔ ایسا کچھ بھی ہرگز نہ کہجئے گا۔ ہم پر آپ کے پہلے ہی بہت احسانات ہیں۔“ ستارہ کی بات ادھوری رہ گئی اور باہر کے دروازے پر دستک ہو گئی۔ شیخ صاحب واپس لوٹ آئے تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کا چہرہ محل سا گیا۔ ”اخاہ۔ اپنے آیاں میاں آئے ہیں۔ بھی بڑی راہ دکھائی تم نے۔“ ستارہ ان کے بیٹھک میں آنے سے پہلے ہی واپس اندر جا چکی تھی۔ میں نے تھہائی ملتے ہی دبے لفظوں میں شیخ صاحب کو باکی ناراضگی کے بارے میں بتا دیا اور یہ بھی کہ شاید اب میں واپس اپنے گھرنے جاؤں۔ ساتھ ہی میں نے ان سے یہ درخواست بھی کی کہ جب بھی اس بات کا ذکر اپنے گھر والوں کے سامنے کریں تو ان کی پریشانی کو مد نظر رکھتے ہوئے بات کا اسلوب کچھ ہلکا رکھیں۔ آس اور امید ہی انسان کا سب سے بڑا سرمایہ ہوتی ہے۔ بری سی بری خبر بھی امید و آس کی پنی میں لپیٹ کر سنائی جائے تو انسان بہل جاتا ہے۔ میں کچھ دیر شیخ صاحب کے پاس بیٹھنے کے بعد اجازت لے کر اٹھ آیا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے برآمدے میں شیخانی جی کو خدا حافظ کہنے کے لیے رکا تو ان کے عقب میں تھپھی گھننا نے شیخ صاحب سے نظر چاکر جانے اشارے میں مجھ سے کیا کہا، لیکن اس کے بہتے لوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مجھے ستارہ کا کام یاد دلا رہی ہے۔ یہ لڑکی کس طرح میری آنکھوں سے بنا اجازت میرے دل کے بند کوازوں کو توڑتی ہوئی اندر گھسی جا رہی تھی۔ کیا محبت کی لہروں کو روکنے والا کوئی بندہ نہیں ہوتا؟ شیخ صاحب نے دروازے سے نکل کر گلی میں پلٹتے وقت میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”یقین کرو آیاں میاں۔“ یہ میرا پنا گھر ہوتا تو کبھی تمہیں واپس نہ جانے دیتا آج۔ تمہیں کبھی یوں در برد بھکلنے نہ دیتا، لیکن تم جانتے ہو میں خود یہاں مہماں ہوں۔“ میں نے انہیں تسلی دی۔ ”آپ دل پر بوجھنے لیں۔ رشتون کو کبھی خود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔“ اور آپ میری فکر نہ کریں۔ اب توجہ تک ابا مجھے ہفتے میں ایک بار گھر سے نکال نہ دیں مجھے خود اپنا گھر بھی اپنی سالگئے لگتا ہے،“ شیخ بھی میرے ساتھ ہی مسکرا پڑے۔ انہوں نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”مجھے تمہاری یہ بات سب سے زیادہ پسند ہے۔ حالات چاہے جیسے بھی ہوں آیاں میاں۔“ میں نے تمہیں کبھی ہار ماننے نہیں دیکھا۔ جیتے رہو۔“ میں کیفے فراق پہنچا تو مرزا نے بتایا کہ اس اعیل دوبار آ کر میرا پوچھ چکا ہے۔ اس اعیل سے تو میں خود بھی ملنے کے لیے بے چین تھا، لیکن وہ مجھے کیوں ڈھونڈ رہا تھا۔ اس سوال کے جواب کے لیے مجھے پورے چار بجے تک انتظار کرنا پڑا۔ اور پھر ٹھیک چار بجے اس اعیل کی گاڑی سڑک کے نکڑ سے مڑتے دیکھ کر میں جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

اس اعیل کے گاڑی سے اترنے سے پہلے ہی میں کار میں بیٹھ چکا تھا۔ اس اعیل نے گاڑی بڑھا دی۔ ”کہاں تھے تم آیاں بابو۔ سارا شہر ڈھونڈ لیا تمہارے پیچے۔“

”تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ تم سارنگا کو جانتے ہو،“ اس اعیل مسکرا یا۔ ”مجھے کب پتہ تھا کہ تم لوگوں کا جھگڑا شوکی پارٹی سے ہوا ہے۔ ورنہ

””تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ تم سارنگا کو جانتے ہو،“ اس اعیل مسکرا یا۔ ”مجھے کب پتہ تھا کہ تم لوگوں کا جھگڑا شوکی پارٹی سے ہوا ہے۔ ورنہ

پہلے ہی یہ قصہ نہ پڑ جاتا۔ میں سمجھتا رہا کہ یہ محلے کے اندر کی کوئی لڑائی ہے۔ وہ تو بھلا ہو مرزا کا جس نے مجھے اصل بات بتائی..... ورنہ تم تو کچھ بتاتے ہی نہیں.....”

## کتاب گھر کی پیشکش

میں نے اس اعلیٰ کی طرف غور سے دیکھا۔

”تم نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا..... تم سارنگا کو کیسے جانتے ہو..... اور وہ صرف تمہاری سفارش پر ہمارے خلاف اپنے ہی کارندوں کی درج کرائی گئی شکایت واپس لینے پر کیسے تیار ہو گیا؟.....“  
اس اعلیٰ نے گاڑی ایک طرف روک دی۔

”سارنگا بھائی ہی میرے مالک ہیں۔ میں انہی کا دن کا ڈرائیور ہوں اور انہوں نے میرے کہنے پر نہیں بلکہ ناہید بیٹا کے کہنے پر موئی بھائی کو تمہاری حضانت کے لیے تھانے بھیجا تھا۔“

میرے اندر ایک دھماکہ سا ہوا۔ گویا ب تک جانے انجانے میں خود بھی ناہید کے ٹیوٹر کے روپ میں سارنگا کی ہی توکری کر رہا تھا۔



## کتاب گھر کی پیشکش

### میرے خواب ریزہ ریزہ

جو چلے تو جاں سے گزر گئے جیسے خوبصورت ناول کی مصنفہ ماہل کی ایک اور خوبصورت تخلیق۔ میرے خواب ریزہ ریزہ کہانی ہے اپنے ”حال“ سے غیر مطمئن ہونے اور ”شکر“ کی نعمت سے محروم لوگوں کی۔ جو لوگ اس نعمت سے محروم ہوتے ہیں، وہ زمین سے آسانی تک پہنچ کر بھی غیر مطمئن اور محروم رہتے ہیں۔

اس ناول کا مرکزی کردار نہ بھی ہمارے معاشرے کی ہی ایک عام لڑکی ہے جو زمین پر رہ کر ستاروں کے درمیان جیتی ہے۔ زمین سے ستاروں تک کا یہ فاصلہ اس نے اپنے خوش رنگ خوابوں کی راہ گزر پر چل کر طے کیا تھا۔ بعض سفر منزل پر پہنچنے کے بعد شروع ہوتے ہیں اور انکشافت کا یہ سلسلہ اذیت ناک بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے رستوں کا تعین بہت پہلے کر لینا چاہیے۔  
یہ ناول کتاب گھر پر دستیاب ہے، جسے رومانی معاشرتی ناول سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

## باب 11 کتاب گھر کی پیشکش

میں ابھی تک ہکا بکا ساتھا "مگر..... تم..... تم نے تو کہا تھا کہ تم کسی سیئٹھ داؤ د کے ملازم ہو؟ اور یہ کہ تمہارا مالک دوہی گیا ہوا ہے۔"

اسا عیل نے ایک گھری سی سانس لی ..... یہ ایک لمبی کہانی ہے، کبھی وقت اور موقع ہوا تو سناؤں گا۔ فی الحال اتنا جان لو کہ دنیا والوں کی نظر میں ناہید بھیا سیئٹھ داؤ د کی صاحبزادی ہے۔ جسے دنیا سے گزرے دوسال ہو چکے، اسکوں اور کالج میں بھی بھیا کی یہی ولدیت درج ہے لیکن رنگابھائی کے صرف چند قربی ساتھی ہی جانتے ہیں کہ ناہید کا اصل باپ خود سارنگا ہے، لیکن اس کی پیدائش والے دون سے ہی اس نے اپنے نام کی بدنامی کو اپنی بھی کے نام کے ساتھ جوڑنے سے گریز کیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تعلیمی میدان یا ذاتی زندگی میں کہیں بھی ناہید اس کے نام سے جانی جائے۔ وہ اس کو بھی میں رہتا بھی نہیں جہاں ناہید بھیارہتی ہے۔ گھر میں میرے علاوہ صرف بواہے جسے یہ بات پڑتے ہے۔

میں حیرت سے اسما عیل کی بات ستارہا۔ "لیکن کیا ناہید یہ بات جانتی ہے کہ سارنگا ہی اس کا باپ ہے؟" اسما عیل نے گاڑی کا گنیر بدلا اور وہ اپنے باپ سے بے انتہا محبت کرتی ہے ..... شاید سارنگا کی بھی دنیا میں واحد کمزوری اس کی اپنی بیٹی ہی ہے ....."

اسما عیل نے مجھے یہ بھی بتایا کہ سارنگا ہمیشہ ہی سے "رنگابھائی" نہیں تھا۔ تیس (30) سال پہلے وہ صرف یعقوب فور میں تھا جو اپنے بڑے بھائی داؤ د کے ساتھ دوہی کے ریگزاروں میں محنت مزدوری کر کے اپنا پیرس اپنے ملک میں منتقل کرتا تھا تا کہ ایک دن یہاں وہ اپنے سپنوں کا محل تعمیر کر سکے۔ دونوں بھائیوں نے دن رات اپنا خون پیسہ بہا کر ایک ایک پائی جوڑی لیکن کچھ بازی گروں نے فناں کمپنی کے نام پر دونوں بھائیوں کا ملک میں جمع شدہ پیرس ہڑپ کر لیا۔ ان دونوں ملک میں چاروں طرف ایسی کمپنیوں کا ایک مافیا ساقائم ہو چکا تھا اور داؤ د اور یعقوب بھی اس کی زد میں آگئے۔ داؤ د کا پیرس تو ایک ایسی کمپنی کھائی جو ملک میں آسمانی کتاب کی اشاعت کے سب سے بڑے تاجر تھے۔ آخر کار یعقوب کو حساب کتاب کے لیے ملک واپس آتا پڑا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ یعقوب پر اپنی اور زمین کے کاروبار میں کچھ یوں ابھرا کہ ساحلی شہر کے بڑے بڑے صنعت کا راس کی چوکھ پر حاضری دینے لگے۔ کہتے ہیں کہ اس نے زمین کے کاروبار میں باقاعدہ اپنا ایک گروہ بنایا تھا جو راتوں رات زمین پر قبضہ کرنے میں ذرا دیر نہیں کرتا تھا۔ یعقوب فور میں سے رنگابھائی کیسے اور کب بنایے تو کوئی نہیں جانتا ہاں مگر دنیا اتنا ضرور جانتی تھی کہ یعقوب فور میں نے سارنگا بننے سے پہلے آخری قبضہ ایک رنگ ساز کارخانے پر کیا تھا۔ کہتے ہیں کارخانے کا مالک بھی بڑا جی دار اور اوپنی پہنچ والا بندہ تھا مگر جیت یعقوب کی ہوئی۔ تب سے اس کے نام کے ساتھ کارخانے کا نام سارنگا ملک گیا تھا جو رفتہ رفتہ رنگابھائی میں تبدیل ہو گیا۔ داؤ د جب ملک واپس آیا تو سیئٹھ داؤ د بن چکا تھا، لیکن اس نے اپنی پہچان کو سارنگا کی بدنامی سے ذرا پرے ہی رکھا، مگر دونوں بھائیوں میں اندر وین خانہ زبردست ایکا تھا۔ اسی نے رنگا کی شادی ایک سیدھی سادھی عورت سے کروادی جوانی دو بھائیوں کی برادری میں سے تھی۔ رنگا کی بیوی نے ایک بیٹے اور اس کے دوسال بعد ایک بیٹی کو جنم دیا اور پھر کسی وبا کی مرض میں بیٹا ہو کر چل بھی۔ سارنگا کی زندگی کا محور اب اس کی اولاد تھی لیکن کہتے ہیں کہ بہت زیادہ پیرس اور زور اپنے ساتھ

بہت سارے دشمن بھی لے کر آتا ہے۔ رنگا کا اسکول جاتا بیٹا بھی اسی دشمنی کی بھیت چڑھ گیا۔ تب رنگا نے اپنی بیٹی کو داؤد کے حوالے کر دیا اور خود اپنی دشمنیاں نبھانے لگا۔

بھائی کی موت کے بعد سارنگا نے شہر بدل لیا اور ہمارے شہر میں آ کر اپنی بیٹی کے لیے وہ خوبی خریدی۔ آس پاس اپنے وفاداروں کا فولادی جال بن کروہ بھی ہر وقت اپنی لاڈی کے لیے ہر وقت پریشان ہی رہتا ہے۔ زندگی نے سارنگا کو ایسے دورا ہے پر لاکھڑا کیا کہ سب کچھ پاس ہوتے ہوئے بھی وہ علی الاعلان اپنی بیٹی کو بیٹھنیں پکار سکتا تھا۔“

اسا عیل کی باتوں میں راستہ کیسے کٹ گیا مجھے کچھ خبر ہی نہیں ہوئی۔ میں تب چون کا جب گاڑی پورچ میں داخل ہو کر ایک جھٹکے سے رک گئی۔ میں بڑے ہال میں پہنچا تو بوا اور ناہید دونوں کو ہی پریشان پایا۔ ناہید مجھے دیکھ کر جلدی سے میری جانب پکی ”آیاں بھائی..... آپ ٹھیک تو ہیں ناں..... پلیس نے آپ کو زیادہ تنگ تو نہیں کیا..... جب اسما عیل چاچانے آپ کی گرفتاری کی خبر دی تھی، میں اور بوا تو پریشانی کے مارے ایک کروٹ بھی چین سے نہیں بیٹھے.....“

میں اس معصومی مخلص لڑکی کو دیکھتا رہا۔ کیا دنیا سے خلوص اور وفا بالکل مٹ چکے ہیں؟ نہیں..... کیونکہ میرے سامنے ان کے رشتہوں کا خلوص اب بھی بکھرا پڑا تھا۔ میں نے ما حول کو بدلنے کی خاطر خوش دلی سے کہا ”میں سمجھتا تھا کہ صرف میری امی ہی ملکہ جذبات ہیں، لیکن آج پتہ چلا کہ اس گھر میں تو ان کی نکر کے لیے دو، دو ملکا میں موجود ہیں.....“ بوا اور ناہید دونوں ہی میری بات سن کر مسکرا دیں ”وہ تو بڑی خوش ہوتی ہیں جب میں انہیں یہ لقب دیتا ہوں“ ناہید کی آنکھوں میں ایک عجیب سی حرمت در آئی۔ ”آیاں بھائی چ..... کبھی کبھی بہت جی چاہتا ہے کہ میں آپ کے سب گھروں کو سے ملوں..... امی سے، رافعہ سے، ریحان بھائی سے..... آپ مجھے لے چلیں گے ناپنے گھر..... لیکن بابا تو مجھے گھر سے نکلنے ہی نہیں دیتے..... آیاں بھائی..... میں بھی باقی سب کی طرح رہنا چاہتی ہوں..... آزاد..... اپنی مرضی کی مالک.....“

”تم فکرنا کرو..... میں تم اور بوا تمہارے بابا سے چھپ کر سب سے مل آئیں گے..... چلواب یہ ادا کی پریختم کرو۔“ ناہید بچوں کی طرح خوش ہو گئی ”چ.....؟ ہاں یہ ٹھیک ہے..... ہم چھپ کر سب سے مل آئیں گے.....“ پھر جیسے ناہید کو اچانک کچھ خیال سا آیا۔ ”آیاں بھائی..... بابا میری حفاظت کی خاطر مجھ سے دور رہتے ہیں۔ لوگ ان کے خوف کی وجہ سے میرے قریب نہیں آتے..... کالج میں بھی میری کوئی سکھلی نہیں ہے، حالانکہ میں وہاں سینہ داؤ دکی بیٹی کی حیثیت سے داخل ہوں..... لیکن جنمیں یہ پتہ ہے کہ میرا سارنگا فیملی سے کوئی تعلق ہے وہ میرے سامنے سے بھی دور بھاگتے ہیں..... حتیٰ کہ کوئی مجھے ٹیوشن پڑھانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ یہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ آپ نے بامی بھر لی۔ آپ مجھے پہلے دن سے ہی باکل اپنے بھیا کی طرح لگے۔ کھوئے کھوئے سے..... لا پرواہ سے..... سلمان بھیا بھی بالکل ایسے ہی تھے۔ اسی لیے میں نے اسما عیل چاچا کو ختنی سے تاکید کی تھی کہ وہ آپ سے کچھ نہ چھا دیں۔ چاچا کو خوف تھا کہ بابا اس بات سے کہیں نا راض نہ ہو جائیں لیکن میں نے بابا سے بھی کل رات صاف کہہ دیا تھا کہ میں آپ سے کچھ نہیں چھا دیں گی، اور بابا میری بات کبھی ٹال نہیں سکتے اس کا مجھے ہمیشہ سے یقین ہے.....“

ناہید بے خودی کے عالم میں اپنے بابا کی باتیں بتاتی گئی اور میں سوچتا رہا کہ باہر کی دنیا میں اس بات پر کون یقین کرے گا کہ سارنگا کے دل

میں بھی ایک باپ کا دل ہو سکتا ہے۔ انسان اپنے اوپر کتنی تھیں کتنی پر میں چڑھائے رکھتا ہے۔ اس کی خبر کسی کو نہیں ہو سکتی۔ کبھی کبھی تو ہمارے اندر کا انسان اس تہذیب پر تھہ پر تھہ خول کے نیچے ہمیشہ کے لیے کھو جاتا ہے، اور ہم صرف ایک معنوی چہرے کے ساتھ ساری زندگی گزار دیتے ہیں۔ اس روز میں معمول سے کچھ زیادہ دریتک وہاں بیٹھا رہا۔ پڑھائی کا موقع ہی نہیں ملا۔ بس تاہید کی سنتا رہا۔ شاید اس کے دل پر پڑا بہت دنوں کا بوجھ اتر گیا تھا اس لیے وہ ہلکی چکلکی ہو کر اپنے بچپن سے لے کر اب تک کی ہر بات مجھ سے باہر رہی تھی۔ جانے یہ لڑکیاں اتنی چھوٹی چھوٹی سی باتیں اپنی تمام جزئیات کے ساتھ کیسے یاد رکھ لیتی ہیں۔ میں نے اس موقع پر ابا کی طرف سے اپنے ”دیس نکالے“ کا ماجرا سنا کر اسے پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

نتیجہ جب میں باہر نکلا تو تاہید کی باتوں کی پتاری بند ہوتے ہوئے گھری شام نے اپنے بال کھول دیے تھے۔ اسماعیل میرے انتظار میں پورچ میں ہی کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرا یا ”بابو..... میں جانتا تھا کہ آج تمہیں دیر ہو جائے گی۔“ میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ ”پہلے تو مجھے تم یہ بتاؤ کہ تم مجھے بابو کیوں کہتے ہو؟ آیاں کہہ کر کیوں نہیں بلاتے.....؟“ اسماعیل نے گاڑی گیٹ سے باہر نکال کر سڑک پر ڈال دی ”بس مجھے اچھا لگتا ہے۔ تم کپڑے بھی تو بابوؤں جیسے پہننے ہو.....؟“ میں نے اپنی پرانی جیز اور آدمی آستین کی چیک والی شرت پر نظر ڈالی اور مجھے ہنسی آگئی۔ ”لیکن میرے ابا کے بقول یہ اوفروں والا لباس ہے.....؟“ اسماعیل بھی ہنس پڑا۔ ”آج کہاں اتاروں تمہیں.....؟..... گھر تو تم جانیں سکتے.....؟“

”کہیں بھی اتار دو..... جو بے گھر ہوتے ہیں۔ سارا شہر انہی کا ہوتا ہے۔ کسی بھی فٹ پاٹھ پر یا پارک میں رات گزاری جاسکتی ہے.....؟“ اسماعیل کسی گھری سوچ میں گم تھا۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”بابو ایک بات مانو گے میری.....؟“

”ضرور..... اگر میرے اختیار میں ہو تو ضرور.....؟“

”تم میرے ساتھ چلو..... میں رنگا بھائی کی حوالی کے پچھوڑے کو اڑز میں رہتا ہوں۔ میرا اس دنیا میں کوئی خون کا رشتہ باقی نہیں رہا..... جب تک تمہارے ابا تمہیں معاف نہیں کر دیتے یا تمہیں کوئی دوسرا مستقل مکان نہیں مل جاتا تم میرے ساتھ رہ سکتے ہو۔ وہ جگہ بدنام ضرور ہے لیکن یقین کرو وہاں اتنے برے لوگ نہیں رہتے جتنے ان اجلی اور نئی کوئیوں میں رہائش پذیر ہیں۔ اگر مجھ پر ڈرا بھی اعتبار ہے تمہیں تو یقین رکھو کہ اسماعیل تمہیں کبھی کسی غلط جگہ چلنے کے لیے نہیں کہے گا.....؟“ میں کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ ”مجھے اپنے علاوہ دنیا کے باقی ہر شخص پر اعتبار ہے۔ جانے میں خود پر کب اعتبار کرنا سیکھوں گا۔“ میری بات سن کر اسماعیل نے پہلے یوڑن ہی سے بنا کسی جھٹ کے گاڑی موڑی۔ فضائیں نائزوں کی چرچاہت دور تک گوئی۔ کچھ ہی دیر میں شہر کا وہ علاقہ شروع ہو گیا جو انگریز کے دور میں اصل شہر تھا اور اب اندر وہ شہر یا صدر کا علاقہ کھلا تھا۔ یہاں پرانے طرز کے مکانات اور چھوٹی بڑی حملیوں کی بہتات تھی۔ یہ متوسط درجے کے لوگوں کا یا پھر اب تک اپنی پرانی تہذیب سے جڑے متول لوگوں کا رہائشی علاقہ تھا۔ پرانے طرز کے مکان، چوبارے، گلیاں اور کھڑکیوں سے جھانکتی ماضی کی شاندار روایت کی عکاسی کرتی بالکل دنیا اب بھی ویسے ہی ایتادہ تھیں۔ میرے ذہن میں ایک عجیب سی بات آئی کہ انسان شاید ازال سے ابد تک زوال کا ہی شکار رہا ہے۔ اسی لیے ہمیں ہر حال کے دور میں ماضی کی روایات، تغیرات اور سلیقے سدا بھاتے ہیں۔ سو جن پر ماضی پرستی کا الزام لگایا جاتا ہے وہ ماضی پر بہت کچھ ایسے قصور و ارکھی نہیں کیونکہ حال اور مستقبل کا

آئینہِ پاٹی کے مقابلے میں ہر دور میں دھندا ہی رہا ہے۔

گاڑی تک سڑکوں اور کشادہ گلیوں سے گزرتے ہوئے ایک ایسے اھاٹے میں داخل ہو گئی جس کے چار اطراف پھولوں کے خوانچوں سمیت خلک میوے، دودھ اور پنسار کی دوکانیں موجود تھیں۔ مغرب کا وقت تھا اور بازار میں کافی چہل پہل تھی۔ انہی دوکانوں میں شاید کہیں پرانے دیکارڈوں کی دوکان میں کوئی پرانا گیت نج رہا تھا۔ ”دوہنسوں کا جوڑا..... پچھڑ گیو رے..... گجب ہیورا ما..... ظلم ہیورے.....“ میں بھی تو ایک پچھڑا ہوا نہ تھا۔ جو اپنی ڈار سے علیحدہ ہو جانے کے بعد اب یہاں وہاں بھلک رہا تھا۔ ایک لمحے کے اندر ہی مجھے کیفے فراق، اپنے گھر اور دوستوں کی بے حد اور پری طرح یاد نے آگھیرا۔

گاڑی ایک بہت بڑے سے چوبی گیٹ کے سامنے جا کر کچھ مخصوص انداز میں ہارن بجا لیا۔ گیٹ کے اندر سے کسی نے چھوٹی سی روشن دان نما کھڑکی کا تختہ ہٹا کر باہر جھانکا اور پھر فوراً ہی دوسرتی بدن کے دربانوں نے گیٹ کھول دیا۔ گیٹ پر یعقوب مینشن کی تختی لگی۔ ہوئی تھی۔ گویا سارے نگانے اپنے پرانے نام سے مکمل ناطق نہیں توڑا تھا۔ گاڑی اندر داخل ہوئی تو مجھے ایک اور ہی جہاں دیکھنے کو ملا۔ یہ جو میں بذات خود کی محلے قصہ ہی وسیع و عریض تھی جس کے بڑے بڑے والائیں اور اوپنے اونچے سفید ستون کسی پرانی رومی دور کی فلم کے منظر کی یاد دلار ہے تھے۔ والائوں میں جا بجا لکڑی یا سنگ مرمر کے تخت بچھے ہوئے تھے جن پر کچھ ضعیف مگر پہلوان نما افراد بیٹھے اپنے سامنے ہوتے۔ نگل کے کھلاڑیوں کی رہنمائی کر رہے تھے اور انہیں مختلف داؤ بیچ سکھا رہے تھے۔ ایک طرف باقاعدہ چاقو کھولنے بند کرنے اور اسے کلائی میں گھمانے یا ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرنے کی مشق ہو رہی تھی۔ مجھے ایک دم ہی شوکی کا چاقو قیاد آگیا۔ ایک جانب خالص دودھ کی باقاعدہ سیلیں لگی ہوئی تھی اور اہتمام دیکھ کر صاف پتہ چلتا تھا کہ یہاں روزانہ منوں کے حساب سے خالص دودھ آتا ہوگا۔ تو گویا باہر کی دوکانوں میں دودھ کے کاروبار کی وجہ بھی یہی احاطہ ہی تھا۔ احاطے میں موجود بڑے بڑے والائوں کو کیا ری کی اینٹوں سے مختلف مگر ایک ہی پیائش کے درجنوں لکڑوں میں تقسیم کیا گیا تھا جس میں ریت اور خشک یا گیلی مٹی سے پاٹ کر کے انہیں مشق کے قابل بنایا گیا تھا۔ مجھے تو وہ جو میں اور پہلوانی سکھانے کا کوئی اڈہ زیادہ معلوم ہو رہی تھی۔ چاروں طرف استادوں اور شاگروں کے شور سے ایک بجیب سامان بندھ گیا تھا۔

میں نے حیرت سے اسماعیل کی طرف دیکھا ”یہ سب کیا ہے.....؟“ اسماعیل مسکرا یا ”اپنے رنگا بھائی کو ہمیشہ سے بس ایک شوق ہی تو رہا ہے..... کرت کا۔ داؤ پیچ کا اور کلامی کے زور کا..... اور تم یہ جتنے نوجوان یہاں تربیت لیتے ہوئے دیکھ رہے ہو۔ آگے چل کر یہ رنگا بھائی کے علاقوں کا کنٹرول بھی سنبھالیں گے۔ جو اس وقت کام سنبھال رہے ہیں۔ وہ بھی سال دو سال پہلے یہیں سے سکھ کر میدان میں نکلے ہیں..... یہ رنگا بھائی کی نوج ہے با بو.....“

”لیکن اس دور میں لڑنے والا کلامی کا زور اور داؤ پیچ استعمال ہی کب کرتا ہے۔ وہ تو پسل یا کلاش کوف نکالتا ہے اور پل بھر میں کھیل ختم بلکہ اب تو پسل اور ریوا اور جتنے ماوز رجھی آگئے ہیں..... پھر ان آتشیں اسلحہ برداروں کے سامنے تمہاری یہ فوج کس کام کی.....“

اسہا عیل نے بر سامنہ بنایا ”گولی سے بزدل لڑتے ہیں۔ ہمارے دھندے میں اصل کی پچان زور ہے اور یہی پیانہ بھی ہے..... ہاں جن تھمرداروں اور پسل چلانے والے کم ظرفوں کی تم بات کر رہے ہو ان کے بندوبست کے لیے بھی یہاں خاص انتظام موجود ہے، لیکن وہ صرف محافظ

ہوتے ہیں۔ اُڑے کا اصل آدمی کبھی ایسی اوچھی حرکت نہیں کرتا، لیکن ایسے اوچھے وار کرنے والوں کو جواب دینے کے لیے اس کے ساتھ یہ آتشیں اسلخ رکھنے والے محفوظ بھی ہمیشہ موجود رہتے ہیں....."

میں حیرت سے اس اعلیٰ کی باتیں سن تارہا۔ میرے لیے یہ بالکل نئی دنیا تھی جہاں باقاعدہ شاگردی کی رسم ہوتی تھی اور چاقو بازی یا زور سکھنے کے لیے شاگرد کی کلائی پر دھاگا باندھا جاتا تھا اور بد لے میں وہ اپنے استاد کو نیک میں جوڑا، پکڑی، ایک سو ایک روپیہ اور امام ضامن پیش کرتا تھا۔ چاقو بازی کی شاگردی کے لیے پہلے اپنا چاقو استاد کے قدموں میں ڈالا جاتا تھا اور پھر جب استاد وہ بند چاقو اٹھا کر اور کھول کر اپنے شاگرد کے حوالے کرتا تو باقاعدہ اسے شاگرد کی سندھل جاتی تھی۔

بعض مشقوں کی شاگردی پانے کے لیے وفاداری کے طور پر شاگرد کو اپنی کلائی کاٹ کر خون کے چند قطرے استاد کے قدموں یا پھر اُڑے کی مٹی کے نذر کرنے ہوتے تھے۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ اب وہ عمر بھرا پنے استاد اور اس اُڑے سے وفاداری نہ جائے گا۔

عام اسکول کا الجوں کی طرح یہاں بھی وقت اور سندھل رنج تھی۔ جو جتنا مشق میں وقت گزارتا اور مختلف امتحان پاس کرتا جاتا اس کا درجہ اور سندھی اس قدر بلند ہوتی جاتی۔ جیسے کہ اُڑے میں مختلف بیلٹس Belts کی ڈگری ہوتی ہے اسی طرح یہاں بھی جماعت اور مشق کی بنیاد پر شاگروں کو مختلف درجوں میں بائیجا جاتا تھا۔ شاید سارنگا کی بھی فوج تھی جو تربیت پانے کے بعد شہر میں اس کا راج چلاتی تھی۔ زمین پر قبضہ کرتی تھی اور سارنگا کی ان دیکھی حکومت کے احکامات کو شہر بھر میں رانج کرتی تھی۔

اس اعلیٰ نے مجھے یہ بھی بتایا کہ یہ زیر زمین حکومت بھی باقاعدہ ایک طریقہ کار کے تحت وجود میں آتی تھی اور شاید ہماری ظاہری حکومت سے کہیں زیادہ شفاف اور ایمان دار انہ چنان اس حکومت کے قیام کے لیے رانج تھا۔ شہر کے تمام چھوٹے بڑے زیر زمین گروہ اس چنانوں میں شامل ہوتے تھے اور چار یا دو بڑوں کو اپنارہنمہ تسلیم کر کے ان کا چنانوں کرتے تھے۔ چنانوں کے لیے باقاعدہ کوئی دن مخصوص ہوتا تھا اور پرچمی اور بولی کے ذریعے اپنے اپنے رہنماءں لیے جاتے تھے۔ وہ چار رہنماءں کے نقشے کو میز پر رکھ کر اسے چاقو کے ذریعے چار حصوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور یوں مشرق، مغرب اور شمال جنوب کے چار علاقوں میں آجاتے تھے۔ پھر ان علاقوں کی حکمرانی کے لیے یا تو پیسے کی بولی اور یا پھر زور اور بل کی بنیاد پر حصہ داری تقسیم کر لی جاتی تھی۔ عام طور پر بندرگاہ، ریلوے اسٹیشن اور ڈاک یارڈ وغیرہ کے علاقوں جس کے حصے میں آتے وہ زیادہ خوش قسم تسلیم کیا جاتا تھا، مگر ایک بار جب تقسیم ہو جاتی تو اگلے تین سال تک ان میں سے کوئی بھی لیڈر دوسرے کے علاقوں میں داخل اندازی نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا کرنے کی صورت میں زیر زمین دنیا کے بزرگ اور پرانے حکمران سخت جرم انہ عائد کرتے تھے اور بعض اوقات ایسی جرأت کی پاداش میں درانداز کو علاقہ بدری اور نا اعلیٰ کی سزا بھی مل سکتی تھی۔ ہاں اگر کوئی زور کے بل پر کسی کے علاقے کا دعوے دار ہوتا تو اسے باقاعدہ مقابلہ کر کے اپنی طاقت ثابت کرنے کے بعد وہ علاقہ چھیننا پڑتا تھا مگر اس مقابلے کے اصول بھی بزرگ رہنمائی طے کرتے تھے اور ان کی پیٹ Senate ہی آخری فیصلہ صادر کرتی تھی۔

میں یہ سب سن کر ایک جہاں حیرت میں غرق تھا کہ اچانک میرے عقب سے آواز ابھری اور کسی نے میرے کاندھے پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی "باہر سے کیا تم اس دیکھ رہے ہو۔ بہت ہے تو اکھاڑے میں آ کر مقابلہ کرو....." میں نے پلٹ کر دیکھا۔



## باب 12 کتاب گھر کی پیشکش

میرے پیچھے موی اور سارنگا کھڑے تھے۔ سارنگا نے قریب آ کر گرم جوشی سے مجھے سینے سے لگایا۔ موی نے بھی حس عادت میرے سینے اور بازوؤں کی ہٹیاں پٹھاں ڈالیں "اچھا کیا تو یہیں آ گیا۔ ہم برے ہیں..... پرانے بھی برے نہیں ساجن....."

اسا عیل نے دبی دبی آواز میں سارنگا کو بتایا کہ وہ مجھے کس شرط پر اپنے ساتھ یہاں لے کر آیا ہے اور یہ کہ میں اس کے ساتھ ہی پچھلے ہے میں نہ ہوؤں گا۔ موی نے اساعیل کو ڈانٹا "کیوں ہے..... تو کہاں کا حاجی ہے کہ شہر کی رہنمائی کرنے چلا ہے.....؟" سارنگا مسکرا یا "چلن ٹھیک ہے..... جیسے تیری مرضی..... ہمارے حصے میں رہ یا پچھلے ہے میں..... رہے گا تو اپنے ساتھ ہی..... اپنی لاڈلی تیری بڑی تعریف کرتی ہے، کہتی ہے بھیا بنا لیا ہے میں نے اسے..... تو تو ہمارا بھی کچھ ہوانا..... کسی چیز کی ضرورت ہو تو ماںگ لیتا..... شرم نہ کرنا..... پھر چلیں گے کسی دن تیرے باوا کی طرف بھی..... انہیں منانے....."

سارنگا نے جاتے جاتے اساعیل کو ہدایت کی کہ وہ میرے لیے حولی کے عقب میں بنے مہماں خانوں کے کروں میں سے کوئی بھی کمرا کھلوادے اور میرے کھانے پینے سمیت ہر چیز کا خیال رکھے۔ پھر دو قدم چل کر وہ واپس پلٹ آیا۔

"اور سن اساعیلے..... دو چار جوڑی کپڑے بھی بنوادے اس ضدی کے لیے..... ورزی کو یہیں بلوالیتا اور بتا دینا کہ صحیح کپڑے تیار چاہیں..... کیا سمجھا.....؟" اساعیل نے جلدی سے تابعداری میں سر ہلا کیا۔ سارنگا موی کے ساتھ نہ جانے کس گوشے کی جانب چلتا ہوا غائب ہو گیا۔ دیے بھی اس طویل و عریض حولی کی بھول بھلیوں کو یاد رکھنے میں مجھے ہفتواں لگ سکتے ہیں۔ اساعیل مجھے لیے حولی کے عقب میں رہائشی حصے میں آ گیا۔ اس طرف شاید عام لوگوں کا داخلہ منوع تھا۔ یہ بھی پرانے طرز کی ایک پوری حولی ہی تھی۔ تقسیم ہند سے قبل اس علاقے میں ہندوؤں کے بڑے بڑے پاؤے اور مندر تھے۔ لہذا یہاں کی تعمیر میں ہندو ثقافت کا رنگ بھی نمایاں نظر آ رہا تھا۔ کروں کے سامنے کشادہ اور وسیع برآمدہ جس کے فرش پر قدیم طرز کی متفہیں بینا کاری کی گئی تھیں اور برآمدے کے سامنے سرخ اینٹوں کا بہت بڑا دالان۔ دالان کے درمیان میں بہت بڑا سا پیڑ جس کے گرد سفید سنگ مرمر کا بڑا سا گول چبوترہ بنا ہوا تھا۔ دالیں جانب چند سنگ مرمر کی مورتیاں اور ان سے پرے ایک بہت بڑا سا با غچہ تھا جہاں رنگ برنگ بھول اور درخت اپنی بہار دکھار ہے تھے۔

با غچے کی گھاس اور باڑھ بہت نفاست اور ترتیب سے تراشی ہوئی تھی۔ آس پاس بہت سے نوکر اپنے کاموں میں مشغول تھے۔ اساعیل کو دیکھ کر بھی نے اسے تعظیم دی۔ مطلب اساعیل کو یہاں رنگا کا خاص آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اساعیل کے اشارے پر میرے لیے فوراً ایک کرہ کھول دیا گیا۔ کرہ کیا تھا پورا ہاں تھا۔ ہمارے کوارٹر کے تینوں کمرے اس میں سا جاتے۔ پرانے طرز کی بڑی لکڑی کی کھڑکیاں اور ڈوری سے کھلنے اور بند ہونے والے چاروں دیواروں میں روشن داں..... کرے کے وسط میں وسیع چوبی پلٹک اور دالیں جانب قد آدم آئینہ (ڈرینگ) اساعیل نے

کمرے میں گھوم پھر کرغش خانے اور باقی الماریوں وغیرہ کا جائزہ لیا ”کمرہ ٹھیک ہے نا..... پسند نہ ہو تو بد لوالینا.....“۔

”نہیں نہیں..... ٹھیک ہے..... لیکن مجھے اتنے بڑے کمرے میں سونے کی عادت نہیں ہے..... تھائی کا احساس ہوتا ہے۔“ اس اعلیٰ نہیں پڑا ”وہ بابو..... کھلی برسات میں سڑک کنارے بچھے لکڑی کے تختے پر تو خوب مزے سے سو جاتے ہو اور کمرے میں ڈرتے ہو.....“ میں خاموش رہا..... اب اسے کیا بتاتا کہ وہ سڑک کے کنارے نصب لکڑی کا نئخ تو بچپن سے مجھے ماں کی طرح لوری دے کر سلاتار ہا ہے اس کا مقابلہ بھلان بے جان مخلوں کی خواب گاہوں سے کیا؟

کچھ ہی دیر میں رات کا کھانا آگیا۔ پوری دعوت کا اہتمام تھا۔ اس اعلیٰ نے مجھے بتایا کہ حولی کا اپنا لانگر خانہ ہے جو چونہیں گھنٹے جاری رہتا ہے۔ اس نے مجھے سے ناشتے کے بارے میں پوچھا ”صحیح کے لیے کوئی خاص فرمائش ہے تو بتاؤ..... کیسا ناشتہ کرو گے.....؟“۔

”ایک سادہ روٹی اور چائے کا ایک پیالہ.....“ اس اعلیٰ کامنہ کھلاڑہ گیا ”بس..... اور کچھ نہیں.....“۔

”نہیں۔ ہم برسوں سے گھر میں ایسا ہی ناشتہ کرنے کے عادی ہیں۔“ مجھے یاد آیا کہ امی کس طرح ریحان اور چھوٹی سے چھپا کر میرے لیے باور پھی خانے میں بالائی کا پیالہ اور پ طاق میں رکھ دیتی تھیں اور وہ دونوں پھر شام تک امی سے جھگڑتے رہتے کہ وہ میری وجہ سے ان کے حصے کی چیز بھی مجھے کھلادیتی ہیں۔ میری آنکھوں کے گوشے بھی گنے لگیں گے لیکن میں نے آنکھیں مسل ڈالیں۔ اس اعلیٰ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد واقعی مجھے تھائی کا احساس کاٹنے لگا۔ میں نے بستر پر آدھا گھنٹہ کروٹیں بد لئے کے بعد تجھ آکر بھی کھڑکیوں کے پردے ہٹا دیں۔ باہر آسان پر میرے بچپن کے سمجھی دوست تارے جیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے کیونکہ آج تک میں ان سے اپنی چھت سے باتمیں کرتا آیا تھا، لیکن آج وہ سب مجھے اس اجنبی جگہ دیکھ کر جیرت سے اپنی آنکھیں پٹ پٹا رہے تھے۔ پھر مجھے اس ماہرو، مہتاب کا خیال آگیا۔ کیا وہ بھی اپنے گھر کے آنکن سے ان تاروں کو دیکھ رہی ہوگی؟ کیا وہ بھی مجھے سوچتی ہوگی.....؟..... کیا میرا نام اتنا مقدر والا ہو گا جسے وہ اپنی ہتھیلی پر لکھ لکھ کر مٹاتی ہوگی.....؟ نہیں نہیں..... مجھے جیسے آوارہ بخارے کے لیے کوئی ناز نہیں بھلا کیوں اپنی زلف کو پریشان کرے گی..... مگر اس نے خود ہی تو کہا تھا کہ اسے میری بہت فکر ہے..... پوری رات میرا نادان دل خود ہی اعتراض پیدا کرتا رہا اور خود ہی تاویلیں گھڑ کر ان اعتراضات کے جواب بھی دیتا رہا۔ سچ ہے کہ دل کسی کا دوست نہیں۔ یہ خود عشق کی بھٹی سلاگاتا ہے اور پھر خود ہی ہماری نسوں میں بنتے خون کو اس بھٹی کا ایندھن بنایا کر آخری قدرے تک جلاتا رہتا ہے۔

میں بھی صحیح تک اسی عشق بھٹی میں جلتا رہا لیکن اس سوال کا جواب پھر بھی نہیں سکا کہ کیا گھنٹا بھی میرے بارے میں سوچتی ہوگی؟ صحیح ناشتے کے ساتھ ہی اس اعلیٰ بھی پہنچ گیا ”کیوں بابو..... نہیں تو آئی ناٹھیک سے؟“..... اس اعلیٰ کے ہاتھ میں کپڑوں کا تھیلا تھا ”چلو نہادھو کر کپڑے بدل لو..... یہ تمہارا نیا بس ہے.....“ اس اعلیٰ نے تھیلے سے کرتا شلوار نکال کر بینگر میں لٹکا دیا۔ میں نے مسکرا کر اس اعلیٰ کو دیکھا ”ایک تعویذ اور ہاتھ کا کڑا بھی لا دو..... پورا اڑے والا بن کر پھر لوں گا.....“ ناشتے کے دوران اس اعلیٰ نے مجھے بتایا کہ روزانہ صح 10 بجے سارنگا کا دفتر لگتا ہے جہاں دن بھر کی مصروفیات اور آنکنہ کے کام بانٹے جاتے ہیں۔ میں نے جیرت سے اسے دیکھا ”دفتر.....؟..... کیا..... یہاں بھی باقاعدہ دفتری کام ہوتا ہے.....“۔

”وفز کیا آیاں بابو..... پوری عدالت کہو..... حکومت چلانا آسان کام تھوڑی ہے.....“

یہاں میرے لیے ہر قدم پر ایک نئی حرمت بانہیں کھولے میری منتظر کھڑی تھی۔ اسماعیل کے بقول یہ علاقہ ابھی چند ماہ پہلے ہی سارنگا کے قبضے میں آیا ہے۔ اس سے پہلے کوئی ”کالی“ نام کا زور آور اس علاقے کا مالک تھا لیکن رنگا سے ہر اکر شہر کے اس حصے کا قبضہ دار بنا جس میں ہمارا کافی فراق اور بابو کا لوئی بھی شامل تھی۔ علاقے کا کنٹرول سنبھالتے ہی قبضہ دار کو سب سے پہلے مختلف حصوں کی تعیناتیاں (پوسٹنگ) کرنی ہوتی ہیں۔ اپنی انتظامیہ کے اہل اور ایمان دار کارندوں کو ان کی الیت کے مطابق علاقے بانٹے جاتے ہیں جہاں کے تمام معاملات کے وہی نگران ہوتے تھے۔

ان معاملات میں زمین پر قبضہ، علاقے کے سیٹھوں سے بختہ وصولی، مخالفوں کا انخواء، بازار کا قبضہ، شہر، جوئے کے اڈوں کا حساب، تاجریوں کے معاملات اور شہر بازار کا حساب کتاب، علاقے کے تھانے سے تعلقات و روابط، اپنے علاقے میں کسی دوسرے گروہ کی دخل اندازی کو روکنا اور ایسے کئی دوسرے جگہ نہ نمائانا بھی شامل تھا۔ عام نظام حکومت کی طرح اس زیر زمین سلطنت کی بھی اپنی عدالتیں اور اپنی سزا میں مقرر تھیں، اور شاید ہماری ظاہری حکومت سے کہیں زیادہ پراشر اور مکمل بھی۔ حکومتی اہل کاروں کی طرح یہاں بھی عہدے دار اپنے عہدے کے حساب سے اپنا کام سر انجام دیتے تھے۔ مجھے یہ سن کر بھی بہت حرمت ہوئی کہ ہر علاقے میں ایسے لوگوں کی کثیر تعداد موجود ہوتی ہے جو ہماری سرکار اور عدالتوں کے چکر میں پڑنے کے بجائے براہ راست اپنے جگہ اسی زیر زمین نظام کے تحت حل اور ختم کروانے پر یقین رکھتے ہیں اور وہ اس نظام کے فیصلوں کو من و عن تسلیم بھی کرتے ہیں، کیونکہ یہاں انصاف ملنے میں درمیں لگتی۔ عام عدالتوں کی طرح سالوں بجل خوار نہیں ہونا پڑتا ہی ہر روز پولیس اور عدالتوں کے ہاتھ اپنی عزت نفس کو کھلتے ہوئے دیکھنا پڑتا ہے۔ مجھے اس روز اپنے ایک اور سوال کا جواب بھی مل گیا۔ جس دن سے میں نے سارنگا کی اس بادشاہت کے بارے میں سنا تھا میرے ذہن میں ایک الجھن ہمیشہ کلباتی رہی کہ اگر ایسا کوئی زیر زمین نظام ہمیشہ سے ہمارے آس پاس موجود رہتا ہے تو پھر مجھے جیسے عام انسانوں کو اس کے بارے میں پتہ کیوں نہیں چلتا؟..... اسماعیل کی باتیں سن کر یہ معمد بھی حل ہو گیا۔ اس نظام کا براہ راست تعلق زر اور زوروں کے ساتھ تھا۔ غریب بے چارہ تو ان کے لیے صرف مزدوری ہی کر سکتا تھا۔ اس نظام کا غربت اور غریب سے کچھ لینا دینا نہیں تھا اس لیے مجھے جیسے غریب گھرانے سے تعلق رکھنے والوں کے لیے یہ نظام سدا پوشیدہ رہتا تھا۔ تاو قتیلہ کوئی حادثہ ہمیں اس زیر زمین دنیا سے متعارف نہ کروا دے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے میں ان جانے میں اس نظام سے آنکھ رایا تھا۔

جب تک میں اسماعیل کے ساتھ بیرونی احاطے میں پہنچا۔ تب تک رنگا کی عدالت لگ چکی تھی۔ احاطے میں باقاعدہ دربار کی طرح دائیں بائیں دو قطاروں میں بہت سی کرسیاں بچھائی گئی تھیں جن پر عہدیدار اور ضرورت مند آکر بیٹھ چکے تھے۔ سارنگا قطاروں کے اختتام پر درمیان میں رکھے ایک بہت بڑے صوفے پر براہماں تھا اس کے بائیں جانب ہاتھ میں ایک رجسٹر پکڑے کوئی شخص کھڑا لوگوں کے نام پکار رہا تھا اور بائیں جانب موی کھڑا تھا جو آنے والے سائل کے کوائف اور مسئلے سے رنگا کو آگاہ کرتا جا رہا تھا۔

ہمیں دیکھ کر موی نے دور سے ہی ہاتھ ہلایا۔ ”واہ شہزادے..... آج تو اپنا ہی بھائی بندگ رہا ہے.....“ سارنگا نے چونک کر سراٹھیا اور مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آگئی۔ اسماعیل کچھ دور ہی رک گیا تھا لیکن رنگا نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے قریب بلاؤ کر ایک خالی کرسی پر

بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اسماعیل وہیں اپنی جگہ کھڑا رہا۔

مقدمات کھل چکے تھے۔ سب سے پہلے موئی تو ندا والا ایک ٹھیکے دار نام سیٹھ اٹھ کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ موئی نے تعارف کروایا۔ ”رنگا بھائی یہ اپنا سیٹھ جبار ہے۔ تین سال ہو گئے ہیں اس کے کمرشل پلازے کے کیس کو۔ دوسری پارٹی قبضہ نہیں دے رہی۔ کروڑوں کا نقصان ہو چکا ہے اس کا۔ زمین تو گئی سو گئی۔ تعمیر کا پیسہ بھی گیا۔ چالیس منزلیں تیار پڑی ہیں لفت تک لگ گئی ہے۔ سارنگا نے لبی سانس لی۔ ”ہونہہ۔ ٹھیک ہے۔ قبضہ تو اسے تیس 30 دن کے اندر مل جائے گا۔ مگر تھلی پہلی دو منزلیں ہماری ہوں گی۔ منتظر ہے تو کاغذ بھروالے اس سے۔۔۔“

سیٹھ جبار کے منہ سے مری مری سی آواز نکلی۔ ”رنگا بھائی گراڈ فلور اور میز نائن تو، بہت زیادہ ہو جائے گا۔۔۔ میں نیچے کی چالیس دو کانوں کی زبان علاقے کے ایم پی اے کو دے آیا ہوں۔۔۔“ رنگا کو غصہ آگیا۔۔۔ ”زبان دے آیا ہے تو پھر یہاں کیا لینے آیا ہے۔ قبضہ بھی جا کر اسی وزیر سے لے لے۔۔۔“ سیٹھ جبار نے بات گھٹتی دیکھ کر جلدی سے دامیں جانب کھڑے شخص سے ایک اشامپ پپر لے کر دستخط کر دیے اور سلام کر کے پلٹ گیا۔

دوسرے سائل آگے بڑھا۔۔۔ موئی نے پہچان کروائی۔۔۔ ”یہ فیقا فلم والا ہے بھائی۔۔۔ دو سال پہلے اپنی فلم کا اعلان کر کے ایڈ و انس بھی دے چکا ہے۔۔۔ لیکن کوئی نیا ہیرو ہے جو وقت نہیں دے رہا۔۔۔ پیسے بھی کھا چکا ہے، لیکن اب شونگ کے لیے مزید پیسے مانگ رہا ہے۔ پروڈیوسر تباہ ہو گیا ہے رنگا بھائی۔۔۔“

سارنگا نے فلم پروڈیوسر پر معنی خیز نظر ڈالی۔۔۔ ”کیوں بھی، فیقے عرف رفیق، مل گئی تجھے فرصت اپنی فلم کی پریوں سے۔۔۔ وہ تیری ہیروئن تو اسٹوڈیو سے زیادہ وقت تیرے اس فلیٹ میں گزارتی ہے۔۔۔ پھر کیسے بننے کی تیری فلم۔۔۔؟“ موئی نے ل Ced دیا ”زیادہ تر تو یہ اپنی ہیروئن سے شادی رچا یتا ہے رنگا بھائی۔۔۔“ رنگا نے زیریب کچھ کہا اور پروڈیوسر کو جھاڑا ”خوب جانتا ہوں میں اس کی ان فلمی شادیوں کو۔۔۔ بہر حال۔۔۔ کاغذ بھروالے اس سے کہ فلم مکمل ہونے کے بعد چل پڑی تو آدھا منافع ہمارا۔۔۔ اور یہ ٹکلی کے طور پر اس کا وہ فلیٹ لکھوا لے۔۔۔ اچھا ہے نہ رہے گا فلیٹ نہ چلیں گی اس کی یہ عیاشیاں۔۔۔ جا کر اپنی فلم پر دھیان دے۔۔۔“ پروڈیوسر بھی دستخط کر کے آگے بڑھ گیا۔۔۔ سامنے بیٹھے ایک کمی عمر کے عہدے دار نے شکایت کی ”رنگا بھائی وہ ڈاک یارڈ کا نیا افسر بہت شکر کر رہا ہے۔۔۔ دو مہینے پہلے ہی ڈی ایس پی لگا ہے علاقے میں لیکن آتے ہی ہمارے ہر کام میں دخل دینے لگا ہے۔۔۔ دو مرتبہ سندیسر بھی بھجوایا ہے کہ ہمارے معاملوں میں ٹانگ نہ اڑائے مگر ایمان داری کا بھوت سوار ہے اس کے سر پر۔۔۔“ رنگا نے غور سے عہدے دار کی طرف دیکھا، ایمان دار ہے یا ریٹ زیادہ چاہتا ہے۔۔۔“

”نہیں بھائی۔۔۔ ریٹ تو اس کے آتے ہی دو گت کر چکے ہیں ہم لوگ۔۔۔“ رنگا کسی گھری سوچ میں پڑ گیا۔۔۔ پھر اس نے موئی کو حکم دیا ”وہ کون سا اوڑیزیر ہے جو یہ معاملے دیکھتا ہے۔۔۔ ہاں۔۔۔ داخلے کا۔۔۔ فون لگا اس کو۔۔۔“ موئی نے جلدی سے دستی فون سیٹ اٹھا کر کوئی نمبر لگایا۔۔۔ دوسری جانب لاکن ملنے پر اس نے فون رنگا کے حوالے کر دیا۔۔۔ رنگا نے سلام دعا کے بعد براہ راست شکوہ کیا ”کیا بولوں سرکار۔۔۔ آپ بھی چن کر ہمارے

علاقے میں افسرگاتے ہو..... ڈاک یارڈ میں جس کو آپ نے نیا بھرتی کر کے بھیجا ہے بار بار راستے میں آ رہا ہے..... کل کلاں کوڑ کے کچھ کریمیں گے پھر آپ ہی کوشکایت ہوتی ہے کہ پہلے کیوں نہیں بتایا..... ” وہ دوسری جانب کی بات سننے لگا ” بس اس کو بدلتی کرنا ہے اور آج شام تک ہی کرنا ہے ..... ڈاک یارڈ میں آپ کے تیرہ ہزار روٹ ہیں ..... پیک ناراض ہو گئی تو اگلے ایکشن میں سنجالا مشکل ہو جائے گا ..... ٹھیک ہے ٹھیک ہے کل تک ہی سہی ..... آپ کا ہی دیا کھاتے ہیں ..... ” رنگانے مکراتے ہوئے فون بند کر دیا اور عہدے دار سے بولا

” آج تین بجے بڑے دفتر میں جا کر اس افسر کا نام دے دینا جسے ڈاک یارڈ میں لگوانا ہے اور دھیان رہے ..... بندہ کام کا ہو ..... ہڈ حرام نہ ہو ..... ” رنگا دوپہر تک احاطے میں بیٹھا اپنی سرکار چلاتا رہا ..... کون سامسلہ تھا جو اس کی عدالت میں پیش نہ کیا گیا ہو ..... چوری، ڈیکتی، قتل، اغوا، قبضہ، رسہ گیری، شادی بیاہ، ہندزی، سیاسی جھگڑے ..... غرض کوئی قضیہ ایسا نہیں تھا جس کا فیصلہ سارنگا نے وہیں بیٹھنے نہ کر دیا ہو، اور حیرت کی بات یہ تھی کہ بمشکل ہی کسی نے اس کے فیصلے پر کوئی اعتراض کیا ..... شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سب جانتے تھے کہ چاہے انہیں آدھا انصاف ہی مل لیکن مل ضرور جائے گا، اور سچ بھی یہی تھا کہ رنگا انہیں فوری طور پر ان کے حسے کا آدھا انصاف فراہم کر دیتا تھا ..... باقی آدھا انصاف رنگا کی سرکار کے حق میں جاتا تھا ..... لہذا کچھ نہ ملنے سے آدھا ملتا ہی سب کے لیے قابل قبول ہوتا تھا ..... ”

دوپہر 2 بجے دربار برخواست ہو گیا ..... باقی ماندہ کیس اگلے دن کے لیے ملتوی کر دیے گئے ..... کچھ ہی دیر میں وہیں درختوں کی چھاؤں تکے ایک وسیع اور کشاورہ دستاخوان بچھا دیا گیا اور کھانا چین دیا گیا ..... سارنگا نے وہیں سب کے ساتھ کھانا کھایا ..... مجھ سے دوبار اس نے پوچھا کہ مجھے یہاں کوئی پریشانی تو نہیں ہے ..... اب میں اسے کیا بتاتا کہ میرے لیے یہ سب کیسا جہان حیرت ہے ..... ”

4 بجے اس اعیل نے ناہید کی حولی کی طرف جانے کے لیے گاڑی لگادی ..... رنگا دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کرنے کے لیے رہائشی حصے کی طرف جا چکا تھا ہم ناہید کے ہاں پہنچ تو اسے اور بوا کو میری گزشتہ شب بسری کی خبر پہلے ہی مل چکی تھی ..... ناہید بے حد خوش تھی کہ میں نے کہیں اور نہیں اس کے بابا کی طرف منتقلی کا فیصلہ کیا ہے ..... اس نے مجھ سے گل بھی کیا میں نے گزشتہ روز ہی اسے اپنے گھر بردی کے بارے میں کیوں نہیں بتایا تھا ..... جانے اسے یہ ساری خبریں کون پہنچاتا تھا ..... اس اعیل تو کل رات دیر تک میرے ساتھ ہی تھا ..... شاید دون میں جب میں رنگا سرکار کی عدالت دیکھ رہا تھا ..... وقت وہ یہاں آیا ہو ..... کیونکہ درمیان میں وہ دو مرتبہ کہیں گیا تھا ..... میں نے ناہید کو تسلی دی کہ ابا کا غصہ ختم ہوتے ہی ریحان خود مجھے لینے آجائے گا، لیکن نہ جانے کیوں میرا دل اندر سے کچھ اور ہی کہہ رہا تھا ..... مجھے لگ رہا تھا کہ گھر اور میرے درمیان فاصلہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا ..... ناہید مجھ سے بار بار پوچھتی رہی کہ اس کے بابا مجھے کیسے لگے؟ انہوں نے میراٹھیک سے خیال رکھا یہیں .....؟ اور میں وہاں خوش تو ہوں؟ وغیرہ وغیرہ اور میں اسے اپنے گزرے دن کے بارے میں بتاتا رہا ..... ”

پھر میں نے خاص طور پر ناہید سے ستارہ کے بارے میں بات کی کیونکہ میں سارنگا سے پہلے ناہید سے ستارہ کی ٹیوشن کے بارے میں اجازت لینا چاہتا تھا ..... ناہید تمام بات سن کر افردہ ہو گئی ” کیوں آیاں بھائی ..... آپ مجھے نہیں پڑھانا چاہتے کیا .....؟ ”

” ایسی بات نہیں ..... وہ لوگ اس وقت ضرورت مند ہیں لہذا انہیں کسی ایسی مدد کی ضرورت ہے کہ ان کی خودداری متأثر نہ ہو، اور اب میرا

اور تمہارا رشتہ ایسے کسی بہانے کا متناقضی بھی تو نہیں۔ تمہارا جب جی چاہے میں تمہاری مدد کے لیے یہیں موجود ہوں گا۔۔۔، ”میری بات سن کرنا ہید کے چہرے پر روشنی سی آگئی ”تو پھر تھیک ہے۔۔۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔۔۔ مگر بابا شاید مجھے گھر سے باہر پڑھنے کے لیے نہ جانے دیں۔۔۔“

”کوئی بات نہیں۔۔۔ اس صورت میں اسما علیل روزانہ ستارہ کو یہاں لاسکتا ہے۔۔۔ جیسے وہ مجھے لے کر آتا ہے۔۔۔“

ناہید کی رضامندی کے بعد میں ہلاکا پھلکا سا ہو گیا تھا۔ جب اسما علیل مجھے دوبارہ یعقوب میشن لے کر پہنچا تو ایک اور شام ڈھلنے والی تھی۔ احاطے میں کل شام کی طرح کلائی اور زور کی مشق جاری تھی۔ آج رنگا خود بھی ایک بڑے سے اسٹول پر بیٹھا اپنے کارندوں کو زور سکھار رہا تھا۔ اس کے سامنے ایک نوجوان نے دوسرے کی کلائی زور سے درمیان میں پچھی میز پر گرا دی۔ فضا میں ہلکی سی ہڈی چھٹنے کی آواز ابھری۔ مجھے دیکھ کر سارنگا نے دعوت دی ”کیوں بھی ساجن۔۔۔ کلائی لڑائے گا میرے شیروں سے۔۔۔ سناء تھجھ میں بڑا دم خ ہے۔۔۔ یہ اور کھن پنج لڑانے کے لیے صرف کلائی کی نہیں، کلیج کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔“ میں نے ہلکے سے مسکرا کر مغدرت کی۔

”نہیں۔۔۔ آپ کے شیر واقعی سوا سیر ہیں۔ میرا ان سے کیا مقابلہ۔۔۔؟“ لیکن موی نہ مانا اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر سارنگ کے سامنے پچھی لکڑی کی میز پر بائیں جانب بڑھا دیا۔ ایک نوجوان اپنی کلائی پر ہاتھ پھیرتا ہوا میرے مقابل آ کر بیٹھ گیا۔ مجبوراً میں نے اپنا ہاتھ پنج لڑانے کے لیے میز پر رکھ دیا۔ نوجوان کی نظریں میری نظروں سے ٹکرائیں۔

## کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

### 1947ء کے مظالم کی کہانی

### کتاب گھر کی پیشکش خود مظلوموں کی زبانی اب گھر کی پیشکش

ایسے خون آشام قلب و جگر کو ترپادینے والے چشم دید واقعات، جنہیں پڑھ کر ہر آنکھ پر نم ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کی خون سے لکھی تحریریں، جنہوں نے پاکستان کے لیے سب کچھ لٹا دیا اور اس مملکت سے ٹوٹ کر پیار کیا۔

تو پھر یہی صدابند ہوتی ہے کہ۔۔۔ کیا آزادی کے چراغ خون سے روشن ہوتے ہیں؟ یوم آزادی پاکستان کے موقع پر کتاب گھر کی خصوصی پیش کش۔۔۔ نوجوان نسل کی آگئی کے لیے کہ یہ وطن عزیز پاکستان ہمارے بزرگوں نے کیا قیمت دے کر حاصل کیا تھا۔

اس کتاب کو کتاب گھر کے **تاریخ پاکستان** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

## باب 13

## کتاب گھر کی پیشکش

سارنگانے زور سے تالی پیٹی "واہ بھئی..... میدان میں تو میرا بڑا سورما اترتا ہے۔ چل سینڈو..... دکھاوے اپنا زور اس شہزادے کو....."

بچپن سے اب تک میں کئی بار ریحان اور اپنے دوستوں کے ساتھ پنجہ لڑانے کا یہ کھیل کھیل چکا تھا، لیکن بالے کے علاوہ مجھے اور کوئی ہر نہیں پایا تھا۔ بالے کی کلائی میں واقعی بلا کا زور تھا۔ ریحان کو تو میں زبردستی بھی دونوں ہاتھوں سے پنجہ گرا کر ہرا دیتا تھا اور اس کام میں چھوٹی میرا ساتھ دیتی تھی وہ میرے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کا زور بھی ڈال دیتی تھی اور ریحان کو ہارنا ہی پڑتا تھا کیونکہ اگر وہ جیت جاتا تو پھر میں دن بھر منہ چلائے پھرتا اور ریحان سے بات بھی نہیں کرتا تھا۔ جانے یہ بچپن ایک دم پھر سے اڑ کر کہاں او جھل ہو جاتا ہے۔

سینڈو نے اپنا بیاں ہاتھ اپنی پشت پر پیچھے مضبوطی سے کس لیا اور مجھے بھی اشارہ کیا کہ میں بھی اسی عمل کو دھراوں تاکہ صرف داکیں ہاتھ کے پنجے اور کلائی کا زور ہو سکے۔ ہمارے آس پاس موجود باقی سارے شاگرو، کارندے اور ان کے بوڑھے استاد بھی ہمارا یہ بے وزن مقابلہ دیکھنے کے لیے اپنی مشق چھوڑ کر ایک دائرے میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ قاعدے کے مطابق موی میری طرف سے میرا حوصلہ بڑھانے والا مقرر ہو گیا اور سینڈو کی سر پرستی خود سارنگا نے سنبھال لی۔ میرے حق میں نظر لگانے والوں کو موی نے بالائیں جانب کھڑا کر دیا اور سینڈو کے حمایتی داکیں جانب اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ گویا باقاعدہ ٹیم بننا کہ پنجہ لڑانا بھی یہاں کے آداب و تربیت میں شامل تھا۔ ایسا شاید اس لیے کیا جاتا ہو گا کہ کوئی ایک مقابل دادا اور جوش کی بیٹائی میں تہرانہ رہ جائے۔ ایسا موقع سارنگا یہاں اپنے دشمنوں کے لیے بھی ضرور فراہم کرتا ہو گا۔ سینڈو نے اپنا پنجہ کھولا اور میں نے اپنی ہتھیلی اس کی ہتھیلی سے جوڑ کر اپنی انگلیاں کس لیں۔ موی نے گتنی شروع کی۔ تین۔ دو۔ ایک اور اس کی انگلی گرتے ہی فضا میں شور سامج گیا۔ ”شباش سینڈو..... وہ سینڈو سے زیادہ نہیں لگنے چاہئیں..... گرادے اے.....“ کوئی میری طرف سے چلا یا ”شباش جوان..... ہمت کرو..... گرنے نہ پائے“ سینڈو بآسانی میرا ہاتھ میری طرف جھکانے میں کامیاب ہو گیا لیکن میز کی سطح چھونے سے پہلے ہی میری کلائی نے اپنا زور پکڑ لیا اور میں دھیرے دھیرے سینڈو کا ہاتھ واپس برابر سطح پر لانے میں کامیاب ہو گیا لیکن سینڈو واقعی پنجہ لڑانا جانتا تھا۔ اس نے میری لاکھ کوشش کے باوجود بھی اپنے ہاتھ کو اپنی جانب زیادہ جھکنے نہ دیا۔ میری کن پٹی سے پسینے کی ایک بوند پھوٹی اور دھیرے دھیرے میرے کان کے پیچھے غائب ہو گی۔ ہم دونوں کے ہاتھوں کی نیس پھٹنے کو تھیں۔ چاروں طرف شور برپا تھا۔

”بلے بھئی بلے..... آج تو سینڈو کو پنجہ دکھانے والا بھی کوئی پیدا ہوا ہے۔ آفرین ہے جوانا.....“ دوسری طرف سے سارنگا نے نظرہ مارا ”کیا کر رہا ہے..... عزت ڈبوئے گا کیا سارے اڑے کی..... اتنا لمبات کھینچ.....“ موی تو باقاعدہ چلا رہا تھا ”واقعی ماں کا دودھ پی کر پلا ہے یہ جوان..... توڑ ڈال اس سانڈ کی کلائی آج..... ہڈی چٹخا دے سینڈو کی.....“ میں اور سینڈو دونوں پسینے میں تربہ تر ہو چکے تھے۔ ہماری کہنوں کے نیچے پنجھی میز کی سطح میں سے اب باقاعدہ لکڑی کی چرچڑاہٹ کی آوازیں آنے لگی تھی۔ مجھے آس پاس صرف ایک سرخ اندر ہمراہ کھانی دے رہا تھا اور میری

پوری حیات سمٹ کر صرف میری کلائی کے اندر سما گئی تھیں۔ پھر اچانک سینڈو نے ہاتھ کو ایک لمحے کے لیے کچھ ڈھیلا چھوڑا اور میری توجہ بٹی اور شاید یہ میری غلطی تھی کیونکہ دوسرے ہی لمحے سینڈو میرا بازو میز کی سطح پر گرا چکا تھا۔ ماحول نعروں اور چینوں سے گونج اٹھا۔ اٹھے کا سینڈو جیت چکا تھا لیکن سارنگا کا مودا بھی خراب تھا۔ اس نے قریب پڑی لکڑی کی ایک پلیٹ اٹھا کر سینڈو کی کمر پر دے ماری "حرام خور..... پورے ڈھائی منٹ لگا دیے تو نے چربی چڑھ گئی ہے تیرے جسم پر..... اتارنی پڑے گی..... اتنی دیر میں تو پہلے دس بندے گروادیتا تھا، سینڈو نے مسکراتے ہوئے مجھے سے ہاتھ ملایا اور میری کلائی تھام کر مجھے کھڑا کر دیا" اس میں بڑا دم ہے بھائی..... یہ ان میں سے نہیں ہے۔" موی نے بھی میرے بازو سہلائے ..... "جی خوش کر دیا تم نے آج....." سارنگا نے جیب سے ہزار کا نوٹ نکالا، اور مجھ پر دار کر کسی خدمت گار کو تھا دیا" جانتا ہے تو سینڈو سے کیوں ہار گیا.....؟....."

## کتاب گھر کی پیشکش

"کیونکہ سینڈو مجھ سے بہتر پچھہ باز ہے....." سارنگا نے نقی میں سر ہلایا۔ "نہیں..... اس لیے کہ یعنی آخری لمحے میں تیری نظر اس کی نظر سے ہٹ گئی تھی،" میں نے حیرت سے سارنگا کی طرف دیکھا" کیا مطلب ہے؟..... مقابلہ تو کلائی کے زور کا ہور ہا تھا۔ پھر نظر کا نظر سے کیا واسطہ.....؟....."

سارنگا نے ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے پاس بیٹھا لیا۔ "نظر کا ہی تو سارا کھیل ہے پیارے..... پچھہ آزمائی میں جتنا کلائی کا زور درکار ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ اپنے مقابل کی نظر پچاننا بھی ضروری ہے....." میں حیرت سے سارنگا کی بات سنتا رہا۔ اس دن مجھے پتہ چلا کہ پچھہ آزمائی کے دوران حریف ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے ایک دوسرے کو آخری لمحے تک گھورتے کیوں ہیں۔ اصل میں وہ دوسرے کی نظر پڑھ رہے ہوتے ہیں ہاتھ تو دماغ کی ہدایت پر اپنی پوری تو انائی کا زور صرف کرہی رہا ہوتا ہے لیکن مقابل کی نظر یہ بتاتی ہے کہ وہ کس وقت اپنی کلائی کو کس انداز میں جھکتے گا یا ساکت رکھے گا۔ نظر سے ہی پتہ چلتا ہے کہ اگلا حریف اب اس مقام پر ہے جہاں ایک آخری جھٹکا اس کی کلائی کو گرا سکتا ہے۔ غرض یہ صرف کلائی سے کلائی کی نہیں..... بلکہ آنکھ سے آنکھ کی بھی برابر کی لڑائی ہوتی ہے۔ سارنگا کے جانے کے بعد موی نے وہیں بیٹھے بیٹھے مجھے پچھہ آزمائی کے چند گر بھی بتا دیے اور مجھے مشق کرتے رہنے کی تلقین بھی کی۔

بعد میں اساعیل نے مجھے بتایا کہ موی خود ایک زمانے میں شہر کا سب سے بڑا چاقو بازارہ چکا ہے۔ اس کے ہاتھ میں بجلی کی سی تیزی اور پھرتی تھی کہ مقابل کو سوچنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا اور وہ اپنی شرگ سے خون کے فوارے بلند ہوتے دیکھتا تھا۔ اساعیل نے مجھے چاقو بازی کے کہہ اصولوں سے بھی روشناس کروا یا کہ اچھا چاقو باز کبھی جلدی میں اور اچھا وار نہیں کرتا اور اگر وہ ماہر بھی ہو تو اگلے کے جسم پر لگا چاقو کا ہر زخم اور نشان ہمیشہ کے لیے اس کی نیک یا بد نامی کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ کیونکہ ماہر کو ہمیشہ ناپ قول کروار کرنا ہوتا ہے کسی مستند جراح کی طرح، اور اس کی مشق کا ایک عام پیانہ یا امتحان یہ رکھا جاتا ہے کہ اسے مختلف جسموں کے کسی ایک مخصوص حصے پر ایک ہی ناپ اور سائز کا زخم لگانے کا کہا جاتا ہے اور بعد میں اگر ان دس بارہ زخموں سے ایک سنٹی میٹر بھی کم یا زیادہ ہوتا ہے ماہر کی گدی سے اتنا دیا جاتا ہے۔ یا پھر سے امتحان میں شریک ہونے کا فیصلہ صادر کر دیا جاتا ہے۔

ایک اور بڑی حیرت انگیز بات پتہ چلی کہ ایک ماہر سرجن یا جراح کی طرح اچھا چاقوباز چاہے تو اپنے زخم کا نشان نہیں چھوڑتا وہ ہر وار جسم پر بنی قدرتی لکیرول (Body lines) کے متوازنی کرتا ہے اور زخم بھر نے پر زخم کا زرہ برابر نشان بھی باقی نہیں رہتا۔ بالکل ویسے ہی جیسے کوئی تجربہ کار پلاسٹک سرجن کسی مریض کی پلاسٹک سرجری کرتا ہے۔ بقول اس اساعیل نئے لڑکوں کو مشق کرتے ان عمر سیدہ استادوں میں اب بھی ایسے کئی چاقو باز موجود تھے جو اڑتی مکھی کو بھی نشان بنا نے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ میں نے اس اساعیل سے درخواست کی کہ کیا میں اگر اس فن کی کوئی سدھ بدھ حاصل کرنا چاہوں تو کر سکتا ہوں، لیکن اس اساعیل نے نفی میں جواب دیا کہ صرف چند مشقوں کی حد تک تو ٹھیک ہے ورنہ باقاعدہ یہ فن چاقوبازی سیکھنے کے لیے مجھے اڈے سے وفاداری کا حلف اٹھانا ہو گا اور کسی ایک استاد کو باقاعدہ اپنا استاد مان کر اور بھینٹ چڑھا کر اس کی شاگردی میں آنا ضروری ہو گا ورنہ اس دنیا کے دریتی رواج اور اصول میرے آڈے آجائیں گے۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد اس اساعیل نے مجھے پان کی پیش کش کے لیے باہر جانے کا پوچھا۔ مجھے یاد آیا کہ سارنگا سے پہلی ملاقات کی رات وہ بھی موئی کے ساتھ کیفے فرماں سے اگلے چورا ہے پرمی شہر کی مشہور پان کی دوکان سے ہی پلٹ رہے تھے جب موئی نے مجھے سڑک کنارے دیکھا تھا۔ میں نے اس اساعیل کے سامنے شرط رکھی کہ اگر وہ کیفے فرماں کے اگلے چورا ہے تک لے چلے تو مجھے پان کی یہ پیش کش منظور ہے۔ اس اساعیل میرا مدعا سمجھ کر مسکرا دیا اور کچھ دیر بعد ہم گاڑی میں سوار شہر کی سنان سڑکیں ناپ رہے تھے۔

اس اساعیل نے پان خریدنے کے بعد واپسی پر گاڑی کیفے فرماں کے سامنے کھڑی کر دی۔ مرزا نے چونک کر سراخھایا اور پھر مجھے گاڑی سے اترتے دیکھ کر وہ دوڑتا ہوا میری جانب آیا۔ مجھے گھر سے نکلے بمشکل اڑتا لیس گھنٹے ہوئے تھے لیکن یوں لوگ رہا تھا جیسے میں اڑتا لیس سال بعد کیفے فرماں آیا ہوں۔

مرزا آتے ہی مجھے سے لپٹ گیا ”انویار..... کہاں چلے گئے تھے تم.....“ میں نے اس سے راجہ اور بالے کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ دونوں مشی کے پاس ہسپتال گئے ہیں لیکن میرے لیے پیغام چھوڑ گئے ہیں کہ میں جب بھی آؤں تو مرزا کے ساتھ کوئی وقت ضرور طے کروں جب ہماری ملاقات ہو سکے۔ میں نے مرزا سے کہا کہ کل کا پتہ نہیں لہذا میں ابھی ہسپتال سے ہو آتا ہوں۔ میں نے مرزا کو ریحان کے لیے پیغام بھی دیا کہ میں ٹھیک ہوں میری فکر نہ کرے۔ میں نے اس اساعیل کو ہسپتال چلنے کا کہا۔ میں دل میں یہ دعا کر رہا تھا کہ وارڈ میں مجھے مشی کے ابایا محلے کا کوئی دوسرا بزرگ نہ مل جائے۔ اس وقت میں کوئی وضاحت دینے کی حالت میں نہیں تھا۔

میری دعا میں رنگ لا گئی اور مجھے راہداری کے شیشے والے دروازے سے اندر صرف راجہ اور بالا ہی نظر آئے۔ وہ دونوں مجھ پر نظر پڑتے ہی یوں اچھل کر کھڑے ہو گئے جیسے انہوں نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو اور پھر دوسرے ہی لمحے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ شروع ہو چکی تھی ”کہاں تھے تم..... تمہیں پتہ بھی ہے ہم کتنے پریشان تھے، تمہیں تو بس سدا سے اپنی من مانی کا شوق ہے نا، ہماری پرواہ کے.....؟“ ان کے شور سے گھبرا کر مشی نے بھی اپنی بند آنکھیں کھول دیں۔ اس کی حالت اب کافی بہتر نظر آ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے انہیں دوسرے مریضوں کا واسطہ دے کر چپ کرایا۔ ”ٹھیک ہے ہم شور نہیں کریں گے مگر یہ بتاؤ کہ تم دو دن سے غائب کہاں ہو..... اور رات کہاں گزاری تم نے.....؟“

”میں سارنگا کے یعقوب میشن میں تھا.....“ میری بات سن کر پہلے تو وہ کچھ سمجھے ہی نہیں اور پھر جب انہیں سمجھ میں آیا کہ میں نے کیا کہا ہے تو جیسے ان کے سروں پر کسی نے زور دار بم پھوڑ دیا۔ اس مرتبہ چلانے والوں میں مشی خود بھی شامل تھا۔ ان کی آوازیں سن کر ڈیوٹی پر موجودز گھبرا کر ڈیوٹی روم سے بھاگتی ہوئی مشی کے بستر کی جانب آگئی اور پھر اس نے تینوں کی وہ جبری کہ انہیں معافی مانگتے ہی بینی ورنہ وہ شاف انہیں وارڈ بدر کرنے پر ہی مصرتھی۔ ان تینوں کی آوازاب بھلے ہی دھیسی ہو چکی تھی مگر ان کے تاثرات اب بھی انتہائی اوپنچ (Loud) تھے۔ میں نے الف سے لے کر ہی تک ساری کہانی انہیں سنادی۔ کچھ دیر تک وہ سب خاموش رہے پھر راجہ نے پہل کی ”لیکن یارا نو..... لوگ تو یہی کہیں گے نا کہ کل تک جس رنگا کے خلاف ہم لڑ رہے تھے۔ آج ہمارا یارا سی رنگا بھائی کے گھر میں رہ رہا ہے“ میں نے ان کی طرف دیکھا ”لوگوں کی پرواہ کے ہے؟..... اور وہ شوکی جسے ہم رنگا کا خاص آدمی سمجھتے تھے وہ تو اس کے احاطے کے سوکوس دور بھی کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ یہ اچکا پن شہر میں اور بھی بہت سی جگہوں پر سارنگا کے نام پر ہوتا ہوگا۔ میں اس جگہ یا ان لوگوں کی حمایت نہیں کر رہا ہوں..... لیکن سچ یہی ہے کہ ہم جو انہیں سمجھتے ہیں وہ لوگ اس سے بہت مختلف ہیں.....“ بالے نے دھیرے سے کہا ”ویسے جس دن سے ہم تھانے سے چھوٹ کر آئے ہیں۔ علاقہ میں زبردستی بھتے یا ہفتہ لینے کے لیے کوئی پارٹی نہیں آئی..... اب تم نے بتایا ہے تو پتہ چلا ہے ورنہ آس پاس کے بھی دو کانڈارے ہمارا ہی کارنامہ سمجھ رہے تھے.....“

”چلو چاہے جیسے بھی سہی پر یہاں کے لوگوں نے سکون کا سائز تو لیا..... اور مجھے یقین ہے کہ اب دوبارہ ایسا بھی نہیں ہوگا۔..... جب تک سارنگا کے پاس یہ علاقہ ہے تب تک تو ہرگز نہیں.....“

تب ہی راجہ کی زبان سے ایک ایسا سوال نکل گیا جس کا جواب اس وقت ہم میں سے کسی کے پاس نہیں تھا۔

”لیکن جب یہ علاقہ سارنگا کے ہاتھ سے نکل گیا تب کیا ہوگا؟“ ہم سب ہی چپ ہو گئے۔ میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا ”اس سے پہلے ہمیں یہ علاقہ اپنے نام کرنا ہوگا۔ اس مسئلے کا سب یہی ایک حل ہے.....“ میرے پھلے ہاتھ پر تین ہاتھ اور آگرے اور ہم چاروں نے آج تک زندگی میں ایسے بہت سے عہد ایک دوسرے کے ساتھ کیے تھے اور ہم چاروں جانتے تھے کہ اب یہ عہد پورا کرنا ہم چاروں کا فرض بن چکا ہے۔

میں بہت دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اسماعیل کے خیال کی وجہ سے وہاں سے اٹھا آیا۔ اسماعیل آرام سے سیٹ سے ٹیک لگائے سور ہاتھ۔ میں نے دھیرے سے اس کا کاندھا بلایا ”آگئے بابو..... مل لیا دوستوں سے.....“

”ہاں..... مگر میں نے تمہیں بے آرام کر دیا.....“

”ارے نہیں..... ڈرائیور کا تو کام ہی انتفار کرنا ہے..... اور سچ بتاؤ۔..... جب تم اپنے دوستوں سے ملتے ہو تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ میں بھی کبھی یاروں کا یار تھا۔ پھر وقت نے ایسے پھیرے دیے کہ سارے دوست ایک ایک کر کے چھوٹتے گئے، لیکن تم اپنے دوستوں کو کبھی نہ چھوڑنا آیاں بابو..... یہی ایک وہ رشتہ ہے جو ہم خود بناتے ہیں۔ باقی تو بننے بنائے ملتے ہیں اور اس نبھانے پڑتے ہیں۔“

ہم یعقوب میشن پہنچ تورات نصف سے زیادہ بیت چکی تھی۔ احاطے میں صبح سوریے کی مشق کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہم کار سے اترے تو میں نے چند بزرگوں کو دودھ کی سنبھل والی جگہ پر نی پانی کی بڑی ٹینگی کے نیچے وضو کرتے دیکھا۔ کچھ دور چند حضرات صفیں بچھا رہے تھے۔

گویا یہاں نمازی حضرات کے لیے نماز ادا کرنے کا بھی مکمل بندوبست موجود تھا۔

اگلے دن جمعہ کا تھا۔ میں نے اس اعلیٰ سے کہا کہ مجھے صحیح ساز ہے وہ بجے تک کچھ دیر کے لیے سادات محلے جانا ہے لہذا اگر وہ مجھے یہاں نہ پائے تو پریشان نہ ہو، لیکن جب صحیح ساز ہے وہ بجے کے قریب میں باہر نکلنے لگا تو اس اعلیٰ کا ذمہ گزاری لیے تیار کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرا یا ”آیاں بابو۔ ڈرائیور حاضر ہے۔۔۔۔۔“

”لیکن تم نے کیوں تکلیف کی۔۔۔۔۔ میں چلا جاتا۔۔۔۔۔ ہماری غیر موجودگی میں کسی کو گاڑی کی ضرورت بھی تو پڑ سکتی ہے۔۔۔۔۔؟“

اس اعلیٰ نے گاڑی گیر میں ڈال دی۔۔۔۔۔ یہ گاڑی صرف ناہید بٹیا کی ڈیوٹی پر ہے اور بثیانے اسے اب تھہاری ڈیوٹی پر لگا دیا ہے کیونکہ اسے خود تو کہیں جانا نہیں ہوتا۔ بس کبھی بکھار شہر کی بڑی لا بھری یہ تک جانا ہو تو فون کر کے مجھے بلا لیتی ہے۔۔۔۔۔

کچھ دیر یہ بعد، ہم سادات محلے میں داخل ہوئے تو کچھ لوگوں کی نظریں اس بڑی گاڑی کو شیخ صاحب کے دروازے کے قریب رکتے دیکھ کر اٹھیں۔۔۔۔۔ دروازہ خود شیخ صاحب نے کھولا اور مجھے دیکھتے ہی حسب معمول ان کا چہرہ کھل گیا۔ میں نے بیٹھک میں بیٹھتے ہی سب سے پہلے ستارہ کی ٹیوشن کا ذکر چھیڑ دیا۔ ان کے چہرے پر بہت سی سوچوں کی لکیریں ابھر آئیں۔

”ہاں میاں۔۔۔۔۔ شیخانی جی نے ذکر تو کیا تھا ستارہ کی اس خواہش کا۔۔۔۔۔ پر تمہیں سچ بتاؤں تو میرا دل نہیں مانتا۔ اور پھر اگر ان کے بڑے بھائی یعنی میرے صاحبزادے حید کو اس بات کی خبر ہوئی کہ اس کی بہن نے ٹیوشن پڑھانا شروع کر دی ہے تو یقین جانو وہ بہت ناراض ہو گا۔ وہ اس معاملے میں بہت سخت مزاج ہے۔۔۔۔۔ اور اب اس کے یہاں آنے میں کچھ زیادہ دن بھی باقی نہیں ہیں،“ تنویر بھی کچھ دیر میں بیٹھک میں آگیا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ وہی ٹیوشن ہے جو اس نے مجھے دلائی تھی۔ سینئر داؤ د کی صاحبزادی والی۔۔۔۔۔ لیکن جب میں نے انہیں یہ بتایا کہ ناہید اصل میں سارنگا کی بیٹی ہے تو ان دونوں کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ شیخ صاحب نے سوچنے اور سب سے مشورہ کرنے کے لیے مجھ سے کچھ وقت مانگ لیا۔ کچھ دیر میں چاہے بھی آگئی مگر وہ جسے میری نظریں غیر ارادی طور پر ہمیشہ ڈھونڈتی رہتی تھیں آج وہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ پھر رخصت ہوتے وقت شیخانی جی نے ہی یہ عقدہ کھولا کہ ستارہ اور گھنا دلوں ہی پڑوں میں کسی کے بے حد اصرار پر ان سے ملنے گئی ہوئی ہیں۔ میں بھاری دل کے ساتھ یعقوب میشن پہنچا تو وہاں کچھ عید کا سامان تھا۔ مختلف اہل کار، شاگرد اور استاد سروں پر فلسطینی رومال باندھے اور صاف سترے پر کپڑے پہنے ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ اس اعلیٰ نے سر پر ہاتھ مارا ”اوہ۔۔۔۔۔ شکر ہے ہم وقت پر واپس آ گئے۔۔۔۔۔ آج توجہتہ المبارک ہے۔۔۔۔۔“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ”ہاں۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔؟“

”چلو تم بھی جلدی سے نہاد ہو کر تیار ہو جاؤ۔ آج کے دن ہم سب رنگا بھائی کے ساتھ جامع مسجد جاتے ہیں نماز پڑھنے۔۔۔۔۔ یہاں جمعہ کو خاص تیاری ہوتی ہے۔۔۔۔۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ہفتے کے باقی چھو دن کی نمازیں ضائع کر دینے والا رنگا جمعہ کو اس قدر اہتمام سے کیوں مناتا ہے۔

کچھ دیر بعد جب میں لباس تبدیل کر کے باہر احاطے میں آیا تو سبھی گاڑیاں لگ چکی تھیں۔ جلدی سامنے سے رنگا، موئی سمیت آتا نظر آیا۔ رنگا نے بھی سر پر چارخانے کا مخصوص فلسطینی رومال باندھ رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی تسبیح تھی۔ آنکھوں میں سر مے کی دھار کچھ

زیادہ گہری اور بس میں خاص اہتمام۔ اس نے مجھے احاطے میں گم کھڑے دیکھا تو اشارے سے مجھے اپنی بڑی وین نما گاڑی میں بلا لیا جس میں اس کے خاص محافظہ موکی سمیت پہلے ہی بیٹھ چکے تھے۔ وین کے پیچے باقی ساری گاڑیاں بھی چل پڑیں لیکن گیٹ سے نکلتے ہی ایک اور انہوں نی ہماری منتظر کھڑی ملی۔ سامنے پولیس کی بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں اور ان سب کی سر برائی اے ایس پی بلال کر رہا تھا۔ یہ وہی اے ایس پی تھا جو کبھی میرے ابا کاشا گردہ چکا تھا اور جس کے تھانے میں ہماری گرفتاری ڈالی گئی تھی۔

<http://kitaabghar.com>

گاڑیاں رک گئیں۔ ہم گاڑیوں سے اترے اور اے ایس پی کی نظریں مجھے رنگا کی وین سے اترے دیکھ کر حیرت سے پھیلتی گئیں۔

# کتاب گھر کی پیشکش

کیا آپ کتاب چھپوائے کے خواہش مند ہیں؟

اگر آپ شاعر/ مصنف / مؤلف ہیں اور اپنی کتاب چھپو انے کے خواہش مند ہیں تو ملک کے معروف پبلیشورز "علم و عرفان پبلیشورز" کی خدمات حاصل کیجئے، جسے بہت سے شہرت یافتہ مصنفوں اور شعراء کی کتب چھاپنے کا اعزاز حاصل ہے۔ خوبصورت دیدہ زیب نائٹل اور اغلاط سے پاک کمپوزنگ، معیاری کاغذ، اعلیٰ طباعت اور مناسب دام کے ساتھ ساتھ پاکستان بھر میں پھیلا کتب فروشی کا وسیع نیٹ ورک ..... کتاب چھاپنے کے تمام مرافق کی مکمل گلرانی ادارے کی ذمہ داری ہے۔ آپ بس میسر (مواد) دیجئے اور کتاب لیجئے ..... خواتین کے لیے سنہری موقع ..... سب کام گھر بیٹھے آئے کی مرضی کے عین مطابق.....

اوارہ علم و عرفان پبلیشورز ایک ایسا پبلیشنگ ہاؤس ہے جو آپ کو ایک بہت مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے کیونکہ ادارہ ہذا پاکستان کے کئی ایک معروف شعرا / مصنفوں کی کتب چھاپ رہا ہے جن میں سے چند نام یہ ہیں .....

عمرہ احمد	ماہمک	فرحت اشتیاق	رخانہ نگار عدنان	قیصرہ حیات	ابجم انصار
نازیہ کنول نازی	گھبہ عبد اللہ	رفعت سراج	نبیلہ عزیز	گھبہ سیما	میمونہ خورشید علی
اقراء صفیر احمد	ہاشم ندیم	طارق اسماعیل ساگر	ایم۔ اے۔ راحت	اعتبار ساجد	شیما مجید (تحقیق)
محی الدین نواب	علیم الحق حقی	امجد جاوید	جاوید چوبہ دری	ایس۔ ایم۔ ظفر	

<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> [ilmoirfanpublishers@yahoo.com](mailto:ilmoirfanpublishers@yahoo.com)

## باب 14

## کتاب گھر کی پیشکش

سارنگا کے مخالفوں نے فوراً اپنی بندوقیں اور پستول لوڈ کر لیں لیکن سارنگا نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔ اے ایس پی مجھے رنگا کے ساتھ دیکھنے کی حرمت کے پہلے جھٹکے سے باہر آچکا تھا۔ رنگا نے اس سے پوچھا ”کیوں بھائی..... یہ باہر کیوں بازار لگا رکھا ہے..... کوئی کام تھا تو اندر آ جاتا“۔ بلاں شاید رنگا کی حیثیت سے واقف تھا ”اندر آنے کا وقت آیا تو وہاں تک بھی ضرور آئیں گے۔ فی الحال تو ہم ایک اشتہاری کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آپنچے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ اسی علاقے میں غائب ہو گیا ہے مجھے شک ہے کہ وہ اسی میںش میں جا کر چھپ گیا ہے۔“

رنگا نے مسکرا کر موی کی جانب دیکھا ”اے موی..... تو یہاں اشتہاریوں کو بھی پناہ دیتا ہے؟..... کم از کم ان سے روز کا بھاڑا ہی لے لیا کر.....“ رنگا کی بات پر ایک زوردار قہقہہ فضا میں گونجا..... بلاں نے خون کے گھونٹ پی کر ہم سب کی طرف دیکھا..... ”ساری دنیا جانتی ہے کہ علاقے کا ہر اشتہاری اسی حوالی کی بھول بھیلوں کی طرف آ کر گم ہو جاتا ہے.....“ سارنگا نے اسے دعوت دی ”چل اگر تجھے اتنا ہی شک ہے تو دور کر لے اپنا وسوہ..... جا کر اندر تلاشی لے لے..... مگر پہلے اپنے بڑوں سے کاغذ لے آ.....“ اے ایس پی نے سرد لبجھ میں کہا ”سرچ وارنٹ بھی لے آؤں گا ایک دن..... اور یاد رکھنا..... وہ دن ان سب اشتہاریوں کا آخری دن ہو گا.....“ موی نے لقبہ دیا ”ٹھیک ہے بڑے صاحب..... ہم ابھی جمعہ کی نماز کے لیے جا رہے ہیں..... تیرے لیے بھی دعا ڈالتے آئیں گے۔“ موی کی بات پر سب کے لیوں پر مسکراہٹ آگئی۔ سارنگا نے سب کو گاڑیوں میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں واپس پلنے لگا تو بلاں نے آواز دے کر مجھے روک لیا۔ ”بات سنو.....“ میں دو قدم بڑھ کر اس کے قریب آگیا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا ”تم تو قیر احمد صاحب کے بیٹے ہوئاں..... کیا نام تھا تمہارا.....“ بلاں نے اپنے ذہن پر زور دیا۔ میں نے اس کی مشکل آسان کر دی ”آیاں..... آیاں احمد نام ہے میرا.....“ بلاں نے مجھ پر طریقہ نظریں ڈالیں۔ ”ہاں..... آیاں..... تمہیں تمہارے محلے میں انوکھتے ہیں ناں.....؟ خوب..... آیاں سے انودا دا بننے میں بڑا کم وقت لگایا تم نے..... تمہیں نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر اسی سارنگا کے آدمیوں کو پیٹنے کا دعویٰ کیا تھا..... بڑی جلدی تم نے اپنا ٹریک بدلتا یا“..... میں چپ رہا۔ میرے دوستوں کے خدشات سچ ثابت ہونا شروع ہو گئے۔ مجھے دین میں سے موی نے آواز دی۔ ”چل شہزادے..... دری ہو رہی ہے.....“ میں پلانا اور پھر کچھ سوچ کر رک گیا اور بلاں کی جانب مڑا۔ ”تم نے اس روز بھی میری بے گناہی پر یقین نہیں کیا تھا اور آج بھی تم تصور کیا ایک رخ ہی دیکھ رہے ہو۔ اس روز ہم چلاتے رہے کہ ہماری جگہ ایک بختہ خور کے خلاف تھی لیکن تمہاری ورودی نے شوکی کا ساتھ دیا تھا۔ آج جب میں اسی شوکی کی جگہ کھڑا ہوں تو تمہارے اعتماد کو کیا ہو گیا.....؟.....“ میں بات ختم کر کے لمبے لمبے قدم لیتا ہوا وین میں جا کر بیٹھ گیا۔ گاڑیاں آگے بڑھ گئیں۔ سارنگا نے اپنی تسبیح ختم کر کے مجھ سے پوچھا ”کیوں ساجن..... کیا بول رہا تھا وہ پولیس والا.....؟.....“

”وہ میرے ابا کا پرانا شاگرد ہے۔ مجھے آپ لوگوں کے ساتھ دیکھ کر اپنی حرمت کا اظہار کر رہا تھا۔“ رنگا نے گھری سانس لی ”کیا کریں بھیا..... اپنا تو

مقداری اتنا سیاہ ہے کہ جو ذرا دیر ہمارے ساتھ بیٹھ جائے اس کو بھی کالک چاٹ جاتی ہے۔“

وین میں گہری خاموشی طاری ہو گئی صرف کناروں پر لگے چھوٹے پنکھوں کی ہوا۔ گاڑی کے اے سی کی ٹھنڈک کے ساتھ مل کر مکھیوں کی سمجھنا ہٹ جیسی آواز پیدا کرتی رہی۔ تھوڑی دیر میں ہی ہم جامع مسجد کے باہر پہنچ گئے۔ نمازوں کے ہجوم میں سے بہت سوں کے ساتھ سارنگا کی اچھی خاصی شناسائی ظاہر کرتی تھی کہ وہ ہمیشہ یہیں جمع کی نمازاًدا کرنے کے لیے آتا ہے۔

<http://kitaabghar.com> نماز ختم ہوئی تو مسجد کے وسیع و عریض سنگ مرمر کے فرش والے صحن میں اور باہر مرکزی دروازے کی روشنی کی جانب سینکڑوں بھکاریوں اور

ضرورت مندوں کا ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اڈے کے تین نوجوان نگینے اور میٹھے چاول کی کٹیں کھلی گاڑیوں میں لے کر مسجد کے باہر پہنچ گئے اور سارنگا اور موئی نے خود اپنے ہاتھوں سے بڑی پرات نما تھالیوں سے چاول نکال کر سب لوگوں میں باشندہ کامل شروع کر دیا۔ پھر جلد ہی افتتاح کے کچھ دیر بعد دیگر کارندوں نے یہ ڈیوٹی سنبھال لی اور سارنگا موئی سمیت ان سب کی نگرانی کرتا رہا۔ اس دوران رنگا نے بہت سے لوگوں کی مٹھیوں میں بنا کچھ دیکھ کر روپے منتقل کرنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ میرے ذہن میں بہت سے سوالات نے یک دم ہی سراخانا شروع کر دیا۔

<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> تقریباً سہ پہر چار بجے کے قریب یہ مشق ختم ہوئی اور ہم سب یعقوب میشن پہنچ گئے۔ ہمارے داخل ہوتے ہی وہاں بھی دستِ خوان بچھ گیا اور سب نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد میں نے اسماعیل کو ناہید کی طرف چلنے کا اشارہ کیا تو سارنگا نے کہا ”مُحَمَّر جاسِن..... آج اپنی بھی باری ہے اپنی لاڈلی کے گھر پھیرا دلانے کی..... اسکے چلیں گے.....“

اسماعیل نے مجھے بتایا کہ رنگا بھائی زیادہ تر جمع کو ہی ناہید سے ملنے جاتا ہے کیونکہ باقی دن اسے اپنی سرکار کے معاملات سے ہی فرصت نہیں ہوتی۔ ہم اسماعیل کی گاڑی میں یعقوب میشن سے لکھے تو رنگا کی وین نے بھی ہماری راہ پکڑ لی۔ شاید اس میں دوسرے محافظ موجود تھے۔ موئی البتہ ہماری گاڑی میں بیٹھا رہا۔ تب اچانک میرے ذہن کے پردے پر ایک جھما کا ہوا کہ جس رات میں کیفے فراق کے باہر پہلی مرتبہ سارنگا سے ملا تھا تب بھی یہی وین سرک کی دوسری جانب کھڑی تھی مگر میں اس وقت اسے کسی دوسرے فرد کی سواری سمجھا تھا۔ مطلب سارنگا کے گرد چوپیں گھنخے اس کے جان شاروں کا پھرہ رہتا ہے۔ ہم ناہید کی حوصلی میں داخل ہوئے تو ہم سب کو ایک ساتھ دیکھ کر خوشی کے مارے اس کے توہا تھوڑے پاؤں ہی پھول گئے۔ بو بھی چاروں طرف بھاگ کر احکامات جاری کرتی رہی۔ موئی ناہید کے سر پر ہاتھ رکھ کر اور دعا دے کر واپس باہر دیگر محافظوں کی جانب چلا گیا، اور پھر سارنگا نے قبوے اور خشک میوے کی ٹرے رکھ کر واپس لپکتی ناہید کی کلائی پکڑ لی۔ ”یہ سب رہنے والے لاڈلی..... تیرا باوا یہاں تھے سے ملنے آتا ہے اور تو سارا وقت یہ خوان ڈھلائی کرنے میں ہی گزار دیتی ہے۔ اب یہاں چکلی بیٹھی رہ میرے پاس.....“

ناہید نہ سو دی ”بابا آپ بھی تو مہمانوں کی طرح آتے ہیں نا ہفتے میں صرف ایک بار..... تو پھر خاطر مدارات تو نہیں ہے نا..... اور آج تو میرے لیے دوہری خوشی ہے کہ آپ کے ساتھ آیاں بھیا بھی آئے ہیں..... میرے لیے آج کا دن بہت بہت خاص ہے.....“ سارنگا نے پیارے ناہید کو سمجھ کر اپنے قریب کر لیا اور بوا سے شکوہ کیا ”یہ کیا بڑی بی..... تو اپنی لاڈلی کوٹھیک سے کھلاتی پلاٹی نہیں ہے کیا..... کیسی سوکھ کر ہڈیوں کا ہار ہوئے جا رہی ہے.....“ بوا کو شکایت کا موقع مل گیا ”یہ کچھ کھائے پے تو میں اسے کھلاؤں نا یعقوب..... یہ تو بس پانی پر زندہ ہے.....“ بوا کے لمحے

سے لگ رہا تھا کہ وہ ضرور کبھی سارنگا کی بزرگ بھی رہی ہوگی۔ ناہید نے لاٹ سے اپنے باپ سے پوچھا ”بaba آپ کو میرے آیاں بھائی کیے لگے..... بالکل سلمان بھیجا جیسے ہیں ناں.....“

سارنگا کی آنکھوں میں غم کی ایک لہری آکر گزرنگی لیکن فوراً ہی اس نے خود پر قابو پالیا ”ہاں رہی..... ویسا ہی ضدی ہے..... اکھڑا اور من موجی.....“ ناہید خوش ہو گئی ”دیکھا..... میں نے کہا تھا نا بھائی..... بابا کو بھی ایسا ہی لگتا ہے،“ ناہید شاید دوری کی وجہ سے سن نہیں پائی مگر میں نے سارنگا کی وہ زیریب بڑا ہے سن لی کیونکہ میں اس کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ سارنگا کا لہجہ دعا سی تھا ”ہاں..... پر خدا نے اس کا فصیب بھی اس جیسا ہو.....“ ناہید اور بوانے ہمیں رات کے کھانے سے پہلے واپس جانے نہیں دیا۔ درمیان میں ستارہ کی ٹیوشن کا ذکر بھی آیا۔ سارنگا کو اس کے ناہید کے گھر آکر پڑھانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا، مگر وہ ناہید کے گھر سے نکلنے کے خلاف تھا اور اس کی وجہ بھی بہت واضح تھی۔ سادات محلے میں ناہید کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام کرنے میں بہت سی الجھنیں درپیش تھیں کیونکہ وہ ایک چھوٹا سا محلہ تھا اور وہاں روزانہ ایک مخصوص وقت پر اتنے محافظوں کی بھیڑ بھاڑ اور گاڑیوں کا آنا جانا خود محلے والوں کے لیے ایک اچھی خاصی زحمت کا باعث بن سکتا تھا۔

ہم ناہید کی حوالی سے نکلے تو رات سر پر تھی۔ مویں نے واپسی کے لیے ڈرائیور کو دوسرا است اخیار کرنے کی ہدایت کی۔ یعقوب مینشن کے در�ان نے ہمیں داخل ہوتے ہی بتا دیا کہ کچھ خاص مہمان بڑے مہمان خانے میں سارنگا کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے اپنی رہائش کی طرف قدم بڑھائے تو سارنگا نے میرا بات تھام لیا اور مجھے ساتھ لیے بڑے مہمان خانے کی طرف بڑھ گیا جہاں میں اس سے پہلے نہیں گیا تھا۔

وہ دراصل ایک بہت بڑا ذرا انگ روم نما ہال تھا جس میں بنا جوڑ کے ایک بہت بڑا اور قیمتی قالین فرش کو ڈھانپے ہوئے تھا اور چاروں جانب صوفے لگے ہوئے تھے۔ چھت کے درمیان میں لگئے فانوس سے چھن کر آنے والی روشنی کچھ اس زاویے سے زمین تک پہنچ رہی تھی کہ ماحول روشن ہونے کے باوجود خواب ناک ساتھا۔ آنے والے مہمان دو عمر سیدہ شخص تھے جن کے لباس کی نفاست اور رکھاؤ سے ان کی حیثیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ایک شخص سفاری سوٹ اور دوسرا قیمتی شیر و اونی میں ملبوس تھا۔ در�ان کے مطابق وہ لوگ مغرب سے بھی پہلے ہمارے انتظار میں یہاں آئیے تھے۔ سلام دعا کے بعد سفاری سوٹ میں ملبوس شخص نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر موی کو دیا جو اس نے سارنگا کو تھام دیا۔ سارنگا نے کارڈ پر نظر ڈالی اور پھر اسے جیسے کچھ بیا دا گیا۔

”ہاں ہاں..... مجھے بولا تھا براہیم نے کہ کچھ مہمان آنے کو ہیں..... پروہ تو کسی نواب صاحب کا ذکر کرتا تھا.....“

سفاری سوٹ والے نے شیر و اونی والے صاحب کی طرف اشارہ کیا ”جی..... یہی ہیں میرے دوست نواب دیرالملک..... شہر کے شہائی علاقے میں جو کاشانہ زمرد ہے، وہ انہی کا ہے.....“

سارنگا نے جلدی سے بات کاٹی ..... ”کاشانہ کیا بولتے ہو صاحب..... وہ تو پورا محل ہے..... سناء ہے ابھی تین سال پہلے ہی اس کا سودا طے ہوا تھا۔ اچھا تو یہ ہیں وہ نواب صاحب جو بھوپال سے تشریف لائے ہیں۔“

نواب نے پہلی مرتبہ زبان کھولی ”بھوپال تو آبا اور اجداد کی راج و حکومتی جتاب..... میری پیدائش اور تعلیم ساری باہر کی ہے..... بس

قسمت میں اس شہر کا دانہ پانی لکھا تھا تو یہیں آ کر بس گئے۔ میری زندگی کا زیادہ عرصہ ایران کے شہر تہران میں گزر رہے۔ وہاں زمرد کی کانیں تھیں ہماری..... ”نواب صاحب اپنی اور کار و بار کی باتیں بتاتے رہے جنہیں سارنگا غور سے منtar ہا۔ شاید جس ابراہیم نے نواب کو ہماری طرف بھیجا تھا وہ سارنگا کو بہت عزیز تھا کیونکہ میں نے اب تک سارنگا کو کسی اجنبی کو اتنا وقت دیتے نہیں دیکھا تھا۔ ”تو نواب صاحب..... ابھی ہم کو بولو کہ کیا خدمت کریں آپ کی..... کہیں وہاں کسی حرام خور نے آپ کے محل میں کوئی پرچمی ورچی تو نہیں ڈال دی اگر ایسا ہے تو رنگا کو بس حکم کر دو..... ”نواب نے جلدی سے رنگا کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ”نہیں نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ ہمیں کیوں شرمندہ کرتے ہیں..... ”سارنگا کو کچھ اطمینان سا ہوا ”اچھا تو پھر کسی مصیبت میں ہو تو بلو۔ کسی کو اٹھانا ہے یا کسی کا سر کاٹنا ہے..... زمین چاہئے یا پھر طاقت..... رنگا حاضر ہے..... ”

نواب دیر نے اپنے دوست کی طرف دیکھا جس نے اپنا نام کمال پاشا بتایا تھا۔ پاشا صاحب نے ہلکے سے کھنکار کروضاحت کی۔ ”وہ دراصل رنگا بھائی..... معاملہ کچھ ذاتی ہے..... تو اس لیے..... ”رنگا نے بات سمجھ کر دروازے پر کھڑے محافظوں اور چائے کافی پیش کرتے خدمت گاروں کو اشارہ کیا اور پل بھر میں ہی وہ سب وہاں سے جا چکے تھے۔ ”جی نواب صاحب..... ابھی بولو آپ..... اب صرف وہ لوگ باقی ہیں جو رنگا کے اپنے ہیں..... ”میں نے موی سے نظروں ہی نظروں میں وہاں سے اپنے اٹھنے کی اجازت طلب کی لیکن اس نے مجھے وہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ سارنگا میری وجہ سے کسی تلف کا مظاہرہ کرے لیکن سارنگا نے مجھے اٹھ کر پیچھے جاتے دیکھ لیا ”بیٹھ جارے..... اب تھے سے کیا چھپا ہے..... چپ کا بیٹھارہ..... ”

میں خاموشی سے دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ نواب صاحب نے گلا صاف کر کے اپنا مدعایاں کیا جس کا خلاصہ کچھ یوں تھا کہ وہ ان کی ایرانی بیگم اور بیٹی اور پچھلی بیوی سے ان کے دو بیٹے سب ہی کا شانہ زمرد میں رہتے ہیں۔ جسے لوگ اب زمرد حویلی کے نام سے پکارتے ہیں۔ دونوں بیٹے اپنی سوتیلی ماں سے کچھ زیادہ سروکار نہیں رکھتے اور ان دونوں کے اپنے مشاغل ہیں۔ گھر میں ان سب کے علاوہ نواب کے بڑے بھائی کی بیوہ نواب خاتون بھی رہتی ہیں لیکن ان کا گزر حویلی کے پچھلے حصے میں ہی زیادہ رہتا ہے اور وہ شوہر کی موت کے بعد زیادہ لوگوں سے گھلتی ملتی نہیں ہیں۔ پاشا صاحب بھی اپنے دوست کے اصرار پر اپنا زیادہ وقت زمرد حویلی کے مہمان خانے میں ہی گزارتے ہیں، لیکن گزشتہ مہینے سے حویلی میں کچھ پراسرار واقعات کی وجہ سے نواب صاحب کا جمیں غارت ہو گیا ہے۔ پہلے ان کی خواب گاہ میں کہیں سے کوئی سانپ گھس آیا جب کہ اس علاقے میں سانپ بسیر انہیں کرتے۔ پھر ان کی رولز رائس کا رکی کا لکل ٹھیک ٹھاک بریکیں یعنی سفر کے دوران جواب دے گئیں۔ ڈرائیور اگر یعنی وقت پر اپنے حواس درست نہ رکھتا تو بڑا حادثہ ہو سکتا تھا۔ پھر نواب صاحب کے چھت کی بالکنی سے ایک وزنی گملہ ٹھیک اسی وقت نیچے گر گیا جب نواب صاحب کی چہل قدمی کا وقت تھا۔ ایک آدھ بار کھانے میں بھی کچھ زہری لی چیز کی آمیزش پانی گئی لیکن محتاط ہونے کی وجہ سے پہلے ہی لقے کے بعد نواب صاحب نے سب کو کھانا کھانے سے روک دیا۔ غرض ہر واقعہ پہلے حادثے سے زیادہ گھمیر اور منصوبہ پہلے سے زیادہ پختہ محسوس ہوتا تھا۔ نواب صاحب اسی بارے میں سارنگا کی مدد کے طالب تھے۔

سارنگا نے ساری بات سن کر لبی ہی ہونہہ کی ”تو پھر آپ کے ساتھ اپنا کوئی حرام خور لگا دیویں..... جو آپ کی حفاظت کرے..... ”

”جی محافظ تو پہلے بھی کچھ ہیں برائے نام گھر میں..... لیکن میں چاہتا ہوں کہ میں بات کی تہہ تک پہنچ کر اس دشمن کو رنگے ہاتھوں پکڑ سکوں..... وہ جو کوئی بھی ہے حوالی کے اندر ہی کا ہے..... لہذا گھر کی بات باہر نکلنے کا بھی ڈر ہے مجھے..... کوئی ایسا طریقہ ہو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے.....“

رنگا گھری سوچ میں گم ہو گیا، اور پھر کچھ دیر بعد اس نے سراٹھا یا۔ ”ٹھیک ہے نواب صاحب..... آپ میرے کو کچھ وقت دے دو..... تب تک آپ کی کوئی بھی کے باہر ہم اپنا پہرہ ڈال دیں گے..... کچھ بات سمجھ میں آئی تو آپ سے رابطہ کریں گے..... رب بھلی کرے گا.....“

پاشا اور نواب دیپر شکر یہ ادا کر کے جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ جاتے جاتے نواب نے بتایا کہ اس نے اپنی یہاں آمد کو بے حد خفیر کھا ہے کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ اس کا دشمن ہوشیار ہو جائے۔ موی نے برستیل تذکرہ نواب صاحب سے پوچھ لیا کہ کہیں مستقبل قریب میں اس کا سیاست وغیرہ میں حصہ لینے کا کوئی ارادہ تو نہیں۔ نواب دیپر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”ہاں..... مگر آپ کو کیسے پتہ چلا؟“ - موی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”انسان کا سب سے بڑا دشمن اس کا پیسہ اور اس کا اقتدار ہوتا ہے۔ آپ جدی پشتو نواب ہو لہذا اپنی دشمنی آپ کے پرکھوں سے نکال چکا ہو گا۔ اب تو صرف کوئی ذاتی دشمنی یا اقتدار کی دشمنی ہی باقی رہ جاتی ہے۔ اس لیے آج رات جب آپ سونے کو جاؤ تو بستر پر لیٹ کر اپنے ذاتی دشمنوں کی فہرست بھی بنالینا۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی آپ سے پرانی دشمنی کا حساب چکار ہا ہو۔ ویسے وھیان رہے کہ آپ کامل ہمارے علاقے سے باہر ہے.....“

نواب نے سر ہلا کیا۔ ”میں اس جانب بھی پورا اطمینان کر چکا ہوں مگر مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میری کسی سے کوئی ذاتی پر خاش ہو، بہر حال آپ کہتے ہیں تو آج دوبارہ سوچتا ہوں۔“ پاشا اور نواب ہم سب سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔ میں اس رات اپنے بستر پر لیٹا یہ سوچتا ہا کہ یہاں ہر دیوار کے پیچھے ایک نئی کہانی بنتی اور ایک نیافسانہ جڑتا ہے لیکن بظاہر دیکھنے میں یہ سب درود یوار، محل یہ مکان اور یہ شہر اور پر سے کتنا پر سکون لگتا ہے۔

اگلی صبح پھر سے رنگا کی سرکار کا دفتر لگا اور دو پہر تک لوگوں کے مسائل کا انبار سمیٹا جاتا رہا۔ سہ پہر کی چائے کے بعد اس اعیل نے ناہید کی طرف جانے کے لیے گاڑی تیار کر لی۔ میرا رادہ تھا کہ آج میں شیخ صاحب اور ستارہ کو بھی ناہید کی طرف لے جاؤں گا تاکہ ان کے ذہن اور دل سے ججھک دور ہو سکے۔

اس اعیل نے گاڑی مرکزی گیٹ سے باہر نکالی تو در بان کو کسی سے بحث کرتے پایا۔ وہ زور زور سے کسی کو اندر جانے سے منع کر رہا تھا کہ رنگا بھائی سے اجازت لیے بغیر وہ کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ میں نے بے خیالی میں گیٹ کے باہر کھڑے افراد پر نظر ڈالی اور پھر میرے منہ سے بے اختیار لکلا ”گاڑی روکو.....“

اس اعیل نے گھبرا کر جلدی سے بریک لگائی۔ گیٹ کے باہر ابا اور ریحان کھڑے ہوئے تھے۔ میں تیزی سے گاڑی سے اترًا۔ اپنے خیالوں میں گم کھڑے ابا کی نظر مجھ پر پڑی۔



## باب 15

## کتاب گھر کی پیشکش

ابا کی آنکھوں میں حیرت اور دکھ کی ایک لہری ابھری جس نے پل بھر میں ہی شدید غصے اور قہر کے طوفان میں جذب ہو کر ان کے اندر اٹھتے طوفانوں کی خبر دے دی۔ وہ بولے تو ان کی آواز آس پاس لوگوں کی وجہ سے دھیمی تھی مگر ان کے لجھے میں چھپا آتش فشاں میں خوب جانتا تھا۔

”خوب..... جب اے ایس پی بلاں نے مجھے بتایا کہ میرا سپوت باقاعدہ غنڈہ بن گیا ہے تو میرے اندر شک کی ایک ہلکی سی رمق باقی تھی کہ شاید میرا خون ابھی اتنا سفید نہ ہوا ہو لیکن آج یہ آخری بھرم بھی توڑ دیا تم نے..... آیاں تم اس حد تک چلے جاؤ گے..... یہ میں نے بھی نہیں سوچا تھا.....“ اساعیل پریشانی سے باپ بیٹے کے درمیان گھری ہوتی اس خلیج کو دیکھ رہا تھا۔ میں چپ رہا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اے ایس پی واپس جا کر اتنی جلدی ابا کو یہ خبر پہنچا دے گا۔ میرا رادہ تھا کہ کسی مناسب موقع پر پہلے ریحان کو یہ بات بتاؤں گا تاکہ ایسی کسی صورت حال میں وہ بات بگڑنے سے بچا سکے، لیکن کہتے ہیں کہ تقدیر ہمیشہ تدبیر سے وقدم آگے چلتی ہے۔

ریحان خاموش کھڑا رہا کیونکہ اس کے پاس کہنے کے لیے شاید کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ اس نے ابا کو سنبھالنے کی کوشش کی ”آپ کی طبیعت پہلے ہی کچھ ٹھیک نہیں ہے ابا..... آپ خود پر مزید بوجھنے ڈالیں۔ میں آیاں سے بات کروں گا۔“ ابا کی آواز اب بھی کافی رہی تھی۔ ”نہیں..... یہ سب جانتا ہے۔ یہ صرف مجھے آزار پہنچانے کے لیے یہ سب کرتا ہے۔ ریحان مجھے یہاں سے لے چلو۔ میں اب اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ آج سے میرا صرف ایک ہی بیٹا ہے۔ چلو یہاں سے.....“ ابا تیزی سے پلٹے اور چل دیے۔ ریحان نے بے بسی سے میری جانب دیکھا اور تیزی سے لڑکھراتے ابا کو سہارا دے کر قریب سے گزرتے ایک رکشہ کو ہاتھ دے کر روک لیا۔ ریحان ابا کو لے کر وہاں سے چلا گیا اور میں وہیں گیٹ کے سامنے لٹا پاسا کھڑا رہ گیا۔ اساعیل نے مجھے بہت سنبھالنے کی کوشش کی لیکن میرے دو بے تاب اور بہت دیر سے رکے آنسو میری آنکھوں سے چھلک ہی پڑے۔ ٹھیک اسی لمحے سارنگا کی وین گیٹ سے باہر نکلی اور شاید سارنگا نے مجھے رو تے اور اساعیل کو مجھے سنبھالتے دیکھ لیا۔ وہ ہڑ بڑا یا سا گاڑی سے باہر نکل کر میری جانب لپکا۔ تب تک میں اپنی آنکھوں کو زور سے مسل چکا تھا ”کیا ہوا شہزادے..... سب خیر تو ہے نا.....“ مجھے سے کچھ بولا نہیں گیا لیکن اساعیل نے اسے ابا کی آمد سے لے کر واپسی تک کا سارا قصہ مختصر ابیان کر دیا۔ سارنگا کچھ بے چین سا ہو گیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک جانب لے گیا ”تیرا من تو اندر سے بڑا کوٹل ہے ساجن..... پریا درکھ..... یہ دنیارونے والے کے ساتھ نہیں، بلکہ رلانے والے کے ساتھ ہوتی ہے۔ تو کہے تو ہم ابھی تیرے باوا کے گھر چلتے ہیں۔ میں خود پر پکڑ لوں گا ان کے..... پرتو خود کو یوں نہ حال نہ کر..... رنگا سے دیکھا نہیں جائے گا.....“

میں نے رنگا کو تسلی دی کہ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس ابا کی حالت دیکھ کر من بھرا آیا تھا۔ مجھے ان کی ڈاٹ کا کوئی ملال نہیں ہے۔ سارنگا کے چہرے پر فکر کی پر چھائیاں کچھ کم ہو میں تو اسے وہ ضروری کام یاد آیا جس کے لیے وہ گھر سے نکل رہا تھا لیکن آج خلاف معمول موئی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ رنگا کے جانے کے بعد میں بھی اساعیل کی گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ اساعیل نے گاڑی شارت کرنے سے پہلے مجھے سے پوچھا ”تم

کہو تو آج کی پڑھائی رہنے دیتے ہیں۔ میں ناہید بٹیا کو جا کر پیغام دے آؤں گا۔ تم آج گھر پر ہی آرام کرلو۔“

”نہیں..... میں ٹھیک ہوں ..... یہاں تھائی میں پڑا رہا تو ضرور کچھ ہو جائے گا مجھے۔ تم شیخ صاحب کے ہاں چلو ..... آج انہیں بھی اپنے ساتھ لے کر جانا ہے ہم نے .....“

ہم سادات محلے پنجے تو پھر سے گلی میں موجود لوگوں کی نظریں اس بڑی گاڑی پر جم گئیں انسان ہمیشہ سے اپنے معمول کا کس قدر پابند رہا ہے کہ کوئی بھی غیر معمولی روایہ اس کے ماحول کی تمام جزئیات بدل کر اسے چونکنے پر مجبور کر ہی دیتا ہے۔ شاید ہم سب اپنے اپنے معمول کے غلام ہوتے ہیں۔

آج شیخ صاحب نے اسماعیل کو بھی اندر بیٹھک میں ہی بلا لیا مگر وہ ابھی تک کسی شدید انجمن کا شکار نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف ان کی اڈلی مگر غم زدہ یوہ بیٹی کی فرمائش تھی تو دوسرا جانب ان کے اپنے خدشات، کاش ناہید کو یہاں لانے میں اتنی مشکلات در پیش نہ ہوتیں تو میں خود سے اپنی نگرانی میں روزانہ یہاں لے کر آ جایا کرتا..... کچھ ہی دیر میں اندر سے چائے کے لوازمات آگئے تو شیخ صاحب نے مجھ سے کہا ”آیاں شیخانی جی تم سے کوئی بات کرنا چاہتی ہیں۔ تم میرے ساتھ چل کر ذرا ان کی بات سن لو۔“ میں کچھ حیرت زدہ سا ان کے ساتھ چل پڑا۔ اسماعیل سے انہوں نے دو گھنٹی کے لیے معدورت چاہی کہ بس ابھی دوبارہ حاضر ہوتے ہیں۔ میرا دل پھر سے اپنی پوری قوت کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ جانے یہ اچانک بیٹھے بیٹھے اس دل کو کیا ہو جاتا تھا۔ میں آج چہلی بار شیخ صاحب کے ساتھ بیٹھک سے ملحق درمیانی کر رہے میں آیا تھا جس کے روازے کے پردے کے پیچھے کھڑے ہو کر ستارہ اور گہنا مجھ سے بات کیا کرتی تھیں۔ سادہ سافر نچپر کتابوں کے چند ریک اور ان سے جزوی میز کری یہ بتارہی تھی کہ یہ تنوری کے پڑھنے کا کمرہ تھا۔ شاید گہنا بھی بیہیں بیٹھ کر پڑھتی ہو گی کمرے کے وسط میں بید کی لکڑی سے بنی چند ملکی چھکلکی کر سیاں اور میز بھی پڑی تھی۔ شیخ صاحب نے مجھے وہاں بیٹھنے کا اشارہ کر کے باہر کی جانب آواز لگائی۔ ”اجی سنتی ہیں..... آیاں میاں آئے ہیں.....“ باہر سے شیخانی جی اور ستارہ اندر کمرے میں آگئے۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر سلام کیا اور دعا لی۔ شیخ صاحب نے مجھ سے کہا ”انو میاں..... تم ان کی بات سنو..... میں اسماعیل صاحب کے پاس بیٹھتا ہوں۔ وہ تھنا بیٹھے ہیں وہاں.....“ شیخ صاحب کے جانے کے بعد میں نے سوالیہ نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ستارہ کچھا بھی سی تھی ”در اصل اباینے مجھا جازت تو دے دی ہے لیکن وہ اندر سے بہت پریشان ہیں۔ خاص طور پر اس گھرانے کے بارے میں جان کر۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اس بات پر بھی شرمندہ ہیں کہ میری خاطر آپ نے اتنا کچھ کیا مگر اب اگر میں نے انکار کر دیا تو آپ کی کتنی دل آزاری ہو گی۔ انہوں نے بر سبیل تذکرہ ٹیلی فون پر حمید بھائی سے بھی ان کی رائے لی تھی کل شام وہ خاص طور پر ڈاک خانے گئے تھے سرکاری فون پر بات کرنے، مگر حمید بھائی نے بھی انہیں سختی سے منع کر دیا تھا۔“ ستارہ کی پیشانی پر سینے کے چند ننھے موتو سے جھملانا لگے تھے، صاف لگ رہا تھا کہ وہ اندر سے کتنی شدید کش مکش کا شکار ہے۔ میں نے اس کی ابھیں دور کرنے کی کوشش کی ”ٹھیک ہے..... اس میں ایسی پریشانی والی بھی کوئی بات نہیں..... اگر وہ مناسب نہیں سمجھتے تو آپ کو انہی کی بات ماننا چاہئے.....“ اتنے میں برآمدے سے آواز آئی ”پریشانی ہی کی توبات ہے آیاں صاحب..... آپ کو بھی تو ذرا راستی بات رغصہ آ جاتا ہے..... اب ہم لے جارے تو آپ کے غصے سے بھی ڈرتے ہیں ناں.....“ وہ شریسی آواز

گھنا کی ہی تھی۔ اگلے ہی لمحہ وہ اندر آچکی تھی۔ شیخانی جی نے اسے گھورا ”گھنا۔۔۔ کتنی بار کہا ہے تم سے کہ بڑوں کی باتوں میں نہیں بولا کرتے“ وہ گلابی کرتے اور سفید دوپٹے میں کوئی پری محسوس ہو رہی تھی۔ جانے یہ اس کے عارض کا گال تھا جو اس کے کرتے کو گلابی کر رہا تھا یا پھر اس کی پوشاک کا گلابی پن تھا جس نے اس کے چہرے پر گال بکھیر رہا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی سلام کر کے اپنی ماں کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ چند لمحوں کے لیے میں اپنے سارے لفظ، اپنی پوری لفظت ہی بھلا بیٹھا۔۔۔ پھر زبردستی بات جوڑنے کی خاطر میں نے کچھ بے ربط سے لفظ منہ سے نکالے ”نہیں۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔۔۔ جیسا آپ سب کو مناسب لگے وہ ٹھیک ہو گا۔۔۔“ مگر ستارہ اب بھی پریشان تھی۔۔۔ ”لیکن آپ نے توان لوگوں سے ساری بات بھی طے کر لی ہے۔ وہ لوگ بر امان جائیں گے۔“

”ان کی آپ فکر نہ کریں۔ ناہید میری چھوٹی بہن جیسی ہے۔ اسے اپنے بھائی کی کوئی بات بری نہیں لگ سکتی۔۔۔ آپ دل پر کوئی بوجھنہ رکھیں۔۔۔“ گھنا پھر بول پڑی ”ارے۔۔۔ چھوٹی بہن سے یاد آیا۔ ہم کل محلے کی تیسری گلی میں کسی تقریب میں گئے تھے۔ وہاں ہماری ملاقات رافعہ سے ہوئی تھی۔۔۔“ مجھے خوشنگوار حیرت کا جھنکا گا۔ ”واقعی۔۔۔؟۔۔۔ کمال۔۔۔ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔۔۔ کیسی تھی وہ۔۔۔ اور آپ کو کیسے پتہ چلا کہ وہ رافعہ ہے۔۔۔؟“ میں جوش میں بیک وقت کئی سوال کر گیا اور پھر مجھے احساس ہوا کہ میں نے خود ہی اپنارازکھوں دیا ہے۔ شیخانی جی نے مجھ سے گلہ کیا ”آیاں بیٹا تم نے گھر چھوڑ دیا اور ہمیں بتایا بھی نہیں۔۔۔ وہ تو کل جب تمہاری بہن سے ستارہ اور گھنا کی ملاقات ہوئی اور سارا واقعہ کھلا تو ہمیں پتہ چلا۔۔۔؟“

شاید شیخ صاحب نے ابھی تک گھر میں ذکر نہیں کیا تھا۔ میں نے شیخانی جی کو بتایا کہ میں نے شیخ صاحب سے ذکر کیا تھا۔ ستارہ کی آواز میں بھی گلہ تھا ”آپ نے اپنے گھروں کو پوری بات کیوں نہیں بتائی تھی کہ آپ ابا کو بچاتے ہوئے اس جھگڑے میں ملوث ہو گئے تھے، بلکہ آپ کو چاہئے تھا کہ اپنے ابا کو ہمارے ہاں لے آتے تاکہ وہ خود اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیتے اور ہمارے ابا سے مل کر ان کی ناراضگی بھی ختم ہو جاتی، لیکن آپ نے یہ سب اپنے گھروں کو نہ بتا کر اچھا نہیں کیا۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، اور یہ سب کچھ ہمارے خاندان کی وجہ سے ہوا۔“ میں نے جلدی سے وضاحت کی ”نہیں نہیں۔۔۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم پہلے سے ہی ان اڑکوں کو اپنے علاقے میں غنڈہ گردی کرنے سے روکنا چاہتے تھے۔ شیخ صاحب کا قصہ درمیان میں نہ بھی آتا تو یہ سب کچھ ہونا ہی تھا۔ ان کی وجہ سے کوئی بات نہیں بگڑی۔۔۔“ گھنا نے براہ راست مجھ سے پوچھا ”لیکن آپ کو یہ سب کچھ برا نہیں لگتا۔۔۔ میرا مطلب ہے ایسے گھٹیا غنڈوں اور اچکوں کے لیے قانون موجود ہے۔ آپ نے ان سب کو قانون کے حوالے کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ سچ بتاؤں تو مجھے یہ غنڈہ گردی اور یہ سب ہنگامے بہت بڑے لگتے ہیں۔۔۔ ہمیں ان کی وجہ سے ان جیسا تو نہیں بن جانا چاہئے نا۔۔۔ کل تقریب میں بھی سب لوگ آپ اور آپ کے دوستوں کے بارے میں بات کر رہے تھے۔۔۔ سنیں۔۔۔ آپ یہاں وہاں بھیکنے کے بجائے سی الیس کیوں نہیں کر رہتے۔۔۔؟“

میں نے حیرت سے اس نازک اندام کی طرف دیکھا جو آج پہلی مرتبہ مجھ سے اتنا کھل کر بات کر رہی تھی ”کیوں۔۔۔؟۔۔۔ کیا میرے سی الیس کرنے سے ملک کے تمام معاملات سدھ رہ جائیں گے۔۔۔“ میرے جواب پر ستارہ اور شیخانی جی مسکرا گئیں۔۔۔ گھنا نے ضد کی ” بتا گئیں۔۔۔ آپ مقابلے کے امتحان میں کیوں نہیں بیٹھ جاتے۔۔۔“

”کیونکہ میری طبیعت کسی بھی سرکاری نوکری کی طرف مائل نہیں ہوتی۔ مجھے یہ افسری بھی بڑی غلامی لگتی ہے.....“ گہنا حیران ہوئی ”اچھا۔ حرمت ہے.....؟ بھی مجھے تو یہی ایسی پی افسران بڑے کمال لگتے ہیں۔ سوت بوت، نالی شائی، نکھرے نکھرے سے، سب پر حکم چلاتے ہوئے افسر..... ویسٹ کوٹ میں تو اور بھی شاندار نظر آتے ہیں اور اگر وردی میں ہوں تو پھر تو کیا ہی بات ہے..... میں نے سوچ لیا ہے کہ میں بھی مقابلے کا امتحان پاس کر کے سی ایسی پی بنوں گی پھر آپ اور ستارہ آپی آنا میرے پاس..... ان سب غنڈوں کی چھٹی نہ کر دی تو گہنا نام نہیں ہے میرا.....“

انتہے میں بیٹھ کی جانب سے شیخ صاحب کے کھانے کی آواز سن کر گہنا کی پھول جڑتی زبان کو فوراً ہی جیسے بریک سی لگ گئی۔ ستارہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شیخ صاحب اندر داخل ہوئے۔ ”ہاں بھی..... کیا فیصلہ ہوا.....“ میں نے انہیں اطمینان دلایا۔ ”آپ نے خود کو اتنے جو حکم میں کیوں ڈالے رکھا..... آپ مجھے خود منع کر دیتے تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔ بہر حال اب اس قسم کو ختم کیجئے۔ آپ کے اطمینان میں ہی ہم سب کا اطمینان ہے۔“ شیخ صاحب نے گہری سانس لی ”جس تو یہ ہے آیاں میاں کہ ستارہ مجھے کہیں زیادہ پریشان تھی کیونکہ تم نے واقعی سچے دل سے اس کے لیے یہ سب کچھ کیا ہے۔“ میں نے بات ٹالنے کے لیے ادھراً درکی چند باتیں کیں اور شیخ صاحب سے اجازت چاہی کہ ناہید ہمارا انتظار کرتی ہوگی لہذا اب مجھے چلانا چاہئے۔ اچانک شیخ صاحب کے ذہن میں کوئی بات آئی ”آیاں میاں..... اگر تم مناسب سمجھو تو آج میں اور ستارہ خود تمہارے ساتھ چل کر ناہید بیٹھا کو اپنی مجبوری سے آگاہ کر آئیں میں جانتا ہوں کہ اس کی ضرورت نہیں مگر ہم دونوں کے دل کا بوجھ بہت ہلکا ہو جائے گا کہ ہماری وجہ سے تمہیں اس شرمندگی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔“ میں نے ان کا دل رکھنے کے لیے ہائی بھر لی ”ٹھیک ہے..... جیسے آپ کی مرضی۔ ناہید بہت مختلف لڑکی ہے، لیکن اگر آپ کا دل ہلکا ہوتا ہے تو آپ دونوں ضرور چلیے اسی بہانے ناہید کو بھی ایک نئی نیکی سے ملاقات کا موقع مل جائے گا۔“

ستارہ کے چہرے پر بھی شیخ صاحب کی یہ تجویز سن کر روشنی ہی آگئی۔ کچھ ہی دیر میں ہم گھر سے نکلنے لگے تو گہنا نے اپنی اماں کے عقب سے حرب معمول شرارت کی ”آپ نے ستارہ آپی کی تو بڑے جی جان سے مدد کر دی لیکن اگر بھی مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہوئی تو مکر تو نہیں جائیں گے.....؟“ شیخ صاحب اندر شیر و انی بدلنے لگے ہوئے تھے میں نے اسے اطمینان دلایا ”چلیں آج آپ کی امی کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ جب کبھی آپ کو ضرورت ہوئی..... میں اتنی ہی جی جان سے حاضر ہوں گا۔“ شیخانی جی اور ستارہ نے بڑی مشکل سے اسے گھور گھور کر چپ رہنے کے اشارے کئے، اور ہم سب گھر سے نکل پڑے۔ ناہید واقعی بڑی بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہی تھی، اور ستارہ کو دیکھ کر تو اس کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی ”آیاں بھیا..... اتنی پیاری استاد کو اتنے دن مجھ سے دور کیوں رکھا.....“ شیخ صاحب اور میں مردانے کی طرف بڑھ گئے اور بوانے جھٹ پٹ ہمارے لیے چائے کے ساتھ بہت کچھ بھوادیا۔ شیخ صاحب حرمت سے حوصلی کے درود یوار کو دیکھتے رہے اور اس کی سجاوٹ اور نفاست کی داد دیتے رہے۔ تقریباً گھنٹے بعد ستارہ کی طرف سے واپسی کا پیغام آگیا۔ ہم مردانے سے نکلے تو بوا، ناہید اور ستارہ برآمدے میں ہی کھڑی تھیں۔ ستارہ ناہید کو اپنی مجبوری شاید بہت اچھی طرح سمجھا چکی تھی اسی لیے ناہید کے چہرے پر ملاں کی کوئی پرچھائی نظر نہیں آرہی تھی۔ میری توقع کے عین مطابق اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا ”آیاں بھیا..... یو آر گریٹ..... آپ نے مجھے اتنی اچھی دوست سے ملوادیا..... اب یہ دوستی کبھی ختم نہیں ہوگی..... میں نے ستارہ آپی سے وعدہ لیا ہے کہ وہ گہنا کو بھی ضرور لے کر آئیں گی کسی دن.....“

ناہید نے بڑی محبت سے ستارہ کو رخصت کیا۔ شیخ صاحب نے بڑھ کر ناہید کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی ”جیتی رہو“۔ میں اسماعیل کے ساتھ ستارہ اور شیخ صاحب کو ان کے گھر چھوڑنے کے لیے ان کی گلی میں پہنچا تو شامِ داخل رہی تھی۔ شیخ صاحب نے بہت اصرار کیا کہ ہم بھی کچھ دیر کے لیے اندر چلیں لیکن میں نے مغدرت کر دی۔ کبھی کبھی ہمیں دل کے بہت خلاف جا کر بھی دنیا کی ریت روانج نہانے کے لیے کچھ فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔

ستارہ نے اترتے ہوئے دھیرے سے کہا ”آپ کا بہت شکریہ آیا۔ خدا حافظ“، ہم واپس یعقوب مینشن پہنچے تو سارے نگاہیں واپس نہیں لوٹا تھا اور موی آج تہائی مشق اور زور کی گمراہی کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے دور سے ہاتھ ہلایا، اور میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ آج نہ جانے میرا دل تہائی کیوں ڈھونڈ رہا تھا۔ شاید وہ بھی مجھ سے آج تلی ڈھیر ساری خوشی بانٹا چاہتا تھا۔ آج وہ تمام جواب بالائے طاق رکھ کر مجھ سے محو گنتگو تھی۔ اس سے بڑی خوشی کی بات بھلا اور کیا ہو سکتی ہے؟ اور جب ہمیں بہت زیادہ خوشی ملتی ہے تو باقی سب لوگوں سے پہلے ہمارا دل ہم سے اسے باشنا چاہتا ہے۔ کیونکہ بھیڑ میں تو ہم دل کی سن ہی نہیں پاتے۔ دل سے باقی تو صرف تہائی میں ہی ہوتی ہیں۔ سواں رات میں اور میرا دل بھی بہت دیر تک باقی کرتے رہے۔ اگلی صبح میرا وجود بہت بڑا پھلا کتا تھا۔ میں نے گہنا سے اپنے دل کی بات کہنے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن کب اور کیسے؟... بس یہی طے ہونا باتی رہ گیا تھا۔ دل کے راز بہت عرصہ دل میں رہیں تو ناسور بننے لگتے ہیں، اور میں نے ایسے کسی بھی ناسور کو دل میں نہ پالنے کا وعدہ کر لیا تھا۔

صحیح ساز ہے دس بجے کے قریب اسماعیل نے مجھے بتایا کہ میرا بڑا بھائی مجھ سے ملنے کے لیے گیٹ پر آیا ہے مگر اندر آنے سے بچکار ہاہے۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ”ریحان۔۔۔ یہاں۔۔۔ خدا خیر کرے۔۔۔“ میں تقریباً دوڑتا ہوا باہر احاطے میں نکلا۔ تب تک موی ضد کر کے ریحان کو اندر باعیچے میں لا کر سامنے پڑے صوفوں میں سے ایک پر بیٹھا چکا تھا۔ میں تیزی سے ریحان کی جانب پکا ”تم۔۔۔ یہاں۔۔۔ سب ٹھیک تو ہے نا۔۔۔“ ”ہاں۔۔۔ سب ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن تم سب ٹھیک رہنے کب دیتے ہو۔۔۔ ابا کی طبیعت تہاری وجہ سے کل شدید بگڑ گئی تھی۔۔۔ رات بھر ہم سب ان کے سرہانے کھڑے رہے۔۔۔ صبح نماز کے بعد کچھ آرام آیا تو سوئے ہیں۔۔۔ ڈاکڑ بھی آیا تھا۔۔۔ کہہ رہا تھا کہ ہائی بلڈ پریشر ہے۔۔۔“

میں نے ریحان سے شکوہ کیا۔۔۔ ”تمہیں ابا کو یہاں نہیں لانا چاہئے تھا۔۔۔“ میرے روکنے سے وہ بھلا کب رکنے والے تھے۔ میں ساتھ نہ بھی آتا تو وہ خود چلے آتے۔۔۔ اے ایس پی نے خبر ہی ایسی دی تھی کہ ہم سب کے تو حواس ہی معطل ہو گئے تھے۔۔۔ تم چلو یہاں سے۔۔۔ میں نے یونیورسٹی کے ہائل میں ایک دوست سے کہہ لے لیا ہے چند دنوں کے لیے۔۔۔ جب تک ابا کا غصہ اترنہیں جاتا۔۔۔ تم وہیں رہ لیتا۔۔۔“ ”نہیں۔۔۔ میں اب کہیں نہیں جاؤں گا۔۔۔ اور یہ تم سب نے اس جگہ کا اس قدر ہوا کیوں کھڑا کر رکھا ہے۔۔۔ یہاں بھی انسان بنتے ہیں اور وہ بھی ہماری طرح اچھے یا بے ہیں۔۔۔“

ریحان نے غور سے میری جانب دیکھا ”ہاں۔۔۔ وہ تو میں دیکھتی رہا ہوں کہ تم پر یہ جگہ کتنی اثر انداز ہو رہی ہے۔۔۔ تم سیدھی طرح چلتے ہو یا میں تمہیں زبردستی کھینچ کر لے جاؤں۔۔۔“ میں نے دکھ سے اپنے مخصوص بھائی کی طرف دیکھا۔۔۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کبھی کبھی وقت ہمیں کچھ اس طرح

سے زمین میں گاڑ دیتا ہے کہ پھر کوئی بندھن نہیں اپنی جگہ سے ہلانہیں پاتا۔ میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا ”ٹھیک ہے چلا جاؤں گا، مگر ان لوگوں کے مجھ پر بہت سے احسانات ہیں..... میں یوں منہ اٹھا کر تو نہیں چل سکتا نا۔..... کچھ وقت دو مجھے.....“ ریحان کے چہرے پر سکون کے آثار پیدا ہوئے..... ”اچھا ٹھیک ہے..... مگر جلدی کرنا۔ ویسے مجھے بالے اور راجہ نے ان کے بارے میں کافی کچھ بتا دیا ہے لیکن پھر بھی ہماری اور ان کی دنیا بہت الگ ہے۔ ہاں تم چاہو تو اس لڑکی کو شیوشن پڑھاتے رہنا.....“

میں خاموشی سے ریحان کو دیکھتا رہا۔ خدا کسی کو اتنا بھولا بھالا اور سیدھا بھائی بھی نہ دے۔ اچانک میرے ذہن میں ایک جھما کا ہوا۔ جو بات میں گھنا سے پوچھنا چاہتا تھا اب وہ بات رافعہ بھی تو پوچھ سکتی تھی۔ وہ گھنا سے مل چکی تھی اور ضرور اس نے حسب عادت اسے اپنی ”سب سے گھری سیکلی بھی بنالیا ہوگا۔ میں نے ریحان کو چند منٹ انتظار کرنے کا کہا اور جلدی سے ایک کاغذ پر ساری تفصیل لکھ کر رافعہ کوختی سے تاکید کی کہ وہ ریحان کے ہاتھ ہی جلد از جلد جواب بھجوادے۔

میں نے خطر ریحان کے حوالے کیا کہ وہ اسے چھوٹی کو دے آئے اور جیسے ہی وہ جواب دے فوراً مجھ تک واپس پہنچا دے۔ ریحان کو میرے اور چھوٹی کے یہ جاسوی رابطے ہمیشہ سے بہت برے لگتے تھے مگر آج اس نے بنا چوں چراکیے خط لے لیا، اور چلا گیا، لیکن میں انتظار کی سولی پر شنگار ہا، اور پھر ٹھیک تیرے دن مجھے اسماعیل نے ایک اتفاقہ لا کر دیا ”صح سویرے تمہارا بھائی گیٹ پر دے گیا تھا۔ تم سورہ ہے تھے اس وقت.....“ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اتفاقہ پکڑا۔ اس پر چھوٹی کے ہاتھ کی لکھائی نظر آ رہی تھی۔

**کتاب گھر کی پیشکش**

<http://kitaabghar.com>

## حاصل

**کتاب گھر کی پیشکش**

**حاصل** آپ کی پسندیدہ مصنفہ عصیرہ احمد کے حاس قلم کی تخلیق ہے۔ یہ ناول عصیرہ احمد کے ابتدائی دور کی یادگار تحریر ہے۔ بعد میں انہوں نے اسی طرز پر اپنا ایک اور ناول ”لا حاصل“ بھی تحریر کیا تھا جو کہ بہت پسند کیا گیا۔ حاصل کہانی ہے ایک نوجوان کی جو چੋچ مذہب اور وہنی سکون کی تلاش میں ہے اور اپنی اس تلاش میں وہ مسلمان سے عیسائی مذہب اختیار کرنا چاہتا ہے اور یہ کہانی ہے ایک نوجوان لڑکی جسے تلاشی ہے آفاتی مذہب کی اور دلی سکون کی اور اس کی یہ تلاش اُسے عیسائیت سے متفرگ کر کے اسلام کی راہ پر لے آتی ہے۔ ہمیں امید کے کہ عصیرہ احمد کے مداح اس ناول کو پسند کرے گے۔ ”حاصل“ کتاب گھر پرستیاب ہے جسے **ناول سیکشن** کے معاشرتی رومانی ناول میں دیکھا جا سکتا ہے۔

## باب 16 کتاب گھر کی پیشکش

میری حالت اس وقت اس پیام بر جیسی تھی جو اپنے محبوب کو خط روانہ تو کر دیتا ہے مگر پھر سارا وقت یہی سوچ کر خود کو ہی نوچتا رہتا ہے کہ کاش وہ یہ سندیسرنہ ہی بھیجا تاوا چھاتھا۔ خود ہی دل کی بات چٹپی میں لکھ بھیجتا ہے اور پھر خود ہی پشمیان ہوتا ہے کہ کاش وہ ڈائیکے کو روک لیتا۔ تو بہتر ہوتا کہ کہیں اس کا محبوب اس کے کسی لفظ سے، کسی شکوئے سے آزدہ نہ ہو جائے۔ لفظ لکھے ہوں تو سب کچھ بول نہیں پاتے..... کاش وہ خود ہی جا کر اپنا مدعی بیان کرتا تو یہ ملال تو نہ رہتا۔

میں بھی رافعہ کا خط ملنے تک اسی شش وغیرہ کا شکار رہا۔ جانے چھوٹی میری بات ٹھیک طرح سے گہنا تک پہنچا بھی سکے گی یا نہیں..... کہیں گہنا کسی بات کا کوئی غلط مطلب نہ لے..... مجھے خود جا کر اس سے بات کرنی چاہئے تھی..... اس جلد بازی کا انجام کہیں براہ رہ۔ غرض ایسی ہزار سوچوں کے تیر میرا وجود تین دن تک چھلانی کرتے رہے اور جب خدا خدا کر کے تین دن بعد مجھے میری سوچوں کا جواب ملا تو میں گھنٹوں چھوٹی کا خط لیے بیٹھا سے کھولنے سے ڈرتا رہا جیسے وہ خط نہ ہو، کسی سپیرے کی پثاری ہو۔ جسے کھولتے ہی کوئی ناگ مجھے ڈس لے گا۔ پھر بہت دیر بعد جب میں نے وہ خط کھولا تو اس میں لکھی حقیقت کا زہر کسی زہر میں ناگن کے زہر سے زیادہ تیزی کے ساتھ میری نسوان میں پھیلتا گیا۔

میں نے اپنے خط میں چھوٹی کو لکھا تھا کہ وہ کسی طرح گہنا سے میرے بارے میں اس کی رائے پوچھ کر مجھے بتائے۔ رافعہ نے خط کے شروع میں تو مجھے سے حسب معمول خوب جھگڑا کیا تھا کہ میں اگر فوراً سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر واپس نہ لوٹا تو وہ مجھے سے پھر کبھی نہیں بولے گی، اور مجھے کسی بڑی آپی کی طرح بہت سی نصیحتیں لکھ بھیجی تھیں کہ بڑے تو چھوٹوں پر اپنا غصہ نکالتے ہی رہتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ چھوٹے روٹھ کر ہی بیٹھ جائیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن مجھے جن لفظوں کا شدت سے انتظار تھا وہ آخری صفحے پر چکے مگر میری تقدیر کا ستارہ سدا کے لیے بجھا گئے۔ حالانکہ چھوٹی نے میری دل آزاری کو دھیان میں رکھتے ہوئے بہت مناسب الفاظ کا استعمال کیا تھا مگر خیز کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو، اور اس کی دھار شکار کی اذیت کم کرنے کے لیے کتنی بھی تیز کیوں نہ کر لی جائے..... اس کا وارہمیشہ نازک ریشوں کو چیر کر جسم کے آرپار ہو جاتا ہے۔ ٹھیک میرے ساتھ بھی ویسا ہی ہوا۔ رافعہ کی تحریر پر میری نظریں پھسلتی گئیں۔ انوبھیا میری پہلے دن بھی گہنا سے آپ کے بارے میں بہت تفصیل کے ساتھ بات ہوئی تھی مگر آپ کے کہنے پر ابا سے بہانہ کر کے میں خاص طور پر سادات محلے ان کے گھر گئی۔ ماشا اللہ بڑی تہذیب اور رکھرکھاؤ والے لوگ ہیں۔ گہنا کی اماں تو بچھی بچھی جاتی تھیں۔ ستارہ آپی بھی گہنا ہی کی طرح بہت پیار کرنے والی ہیں۔ مجھے وہاں دیکھ کر وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ بڑی مشکل سے مجھے گہنا سے تھا اسی میں بات کرنے کا موقع ملا۔ مگر بھائی..... وہ کچھ اور خیالات کی لڑکی ہے۔ اس کے سپنوں کا شہزادہ کوئی غریب معمولی لڑکا نہیں بلکہ کوئی سی ایس پی آفیر ہے۔ میں نے طریقے سے اس سے پوچھا کہ آپ کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے تو جھٹ سے بولی کرایے مغلض انسان اس دور

میں شاید کچھ ہی بچے ہوں مگر اسے آپ کے رہن سہن اور مصروفیات سے بہت اختلاف تھا۔ کہنے لگی کہ آپ کو ان غنڈے بدمعاشوں کا پیچھا چھوڑ کر اپنی تعلیم کامل کرنی چاہئے۔ پھر میں نے کسی اور طریقے سے بات بدل کر اس سے اس کے مستقبل اور شادی وغیرہ کے بارے میں بات کی تو گہنا ہنتے ہوئے بولی کہ اس نے تو پہلے ہی اپنی اماں اور آپی کو خود ادا کر رکھا ہے کہ کسی سی ایس پی افسر کے علاوہ کہیں ہاں نہ کریں۔

آیاں بھائی جانے مجھے اس کی باتوں سے ایسا کیوں محسوس ہوا کہ وہ آپ کی دل چھپی ستارہ آپی میں سمجھتی ہے اور شاید اسی رشتے سے وہ آپ سے چھیڑ خانی بھی کرتی رہتی ہے اور ستارہ آپی ..... وہ تو آپ کی اتنی منون ہیں کہ بس کیا بتاؤں۔ جتنی دیر میں وہاں رہی، وہ آپ کے ہی گن گاتی رہیں اگر آپ نے خود مجھے گہنا کی مرضی معلوم نہ کرنے کا کہا ہوتا تو میں بھی ضرور کسی غلط فہمی کا شکار ہو جاتی۔ بہر حال میرے پیارے اور معصوم سے بھی..... آپ گہنا کا خیال دل سے نکال دیں کیونکہ اس کے خوابوں کی تعبیر کچھ اور ہے.....

چھوٹی نے اس کے بعد بھی کچھ لکھا تھا لیکن میری آنکھوں کی ضیاء توانا ہی پڑھ کر عدم ہو چکی تھی۔ خط کے صفحے میرے ہاتھوں سے پھسل کر گرے اور کھڑکی سے اندر آتی تیز ہوا کے ساتھ کمرے میں یہاں وہاں بکھر گئے۔ بالکل اس طرح جیسے میرے خزانہ دل کی شاخوں کے سوکھے پتے اس وقت میرے وجود کے اندر بکھرے پڑے تھے۔

تو گویا گہنا بھی مجھے ایک غنڈے اور بدمعاش سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتی تھی۔ ایک ایسا غنڈہ جوان جانے میں اس کے گھروالوں کی کچھ مدد کر گیا تھا۔ مگر مگرے تو سداہرے ہی ہوتے ہیں۔ چاہے وہ کچھ پل کے لیے کسی کی مدد ہی کیوں نہ کر جائیں۔ میرے اندر بیک وقت بہت سے چھنا کے ہوئے کون کہتا ہے کہ دل ٹوٹنے کی آواز نہیں آتی۔ کاش کوئی اس وقت میرے قریب ہوتا تو اسے میرے روئیں روئیں سے یہ جن و پکار سنائی دے جاتی میں اس کے تکلف کو بھی اخلاص سمجھتا رہا جب کہ وہ تو بھی میرے دل کی شناسا ہی نہ تھی اور پھر اس روز اس نے کھل لفظوں میں اپنی پسندنا پسند بھی تو سب کے سامنے مجھے بتا دی تھی۔ شاید وہ یہ سب مجھی کو نانا چاہتی تھی۔ میں پھر بھی کیوں نہ سمجھ پایا؟ اور پھر یہ تو ہے۔ گلیوں بازاروں میں بجکتے ایک آوارہ کو کون اچھا سمجھے گا۔ جسے خود اس کے اپنے بھی دھنکار چکے ہوں اسے گھر بدر کر دیا گیا ہو، اور زمانے بھر کے الزام اور بدنامی اس کے ماتھے کا ٹینکہ ہوں۔ ایسے بے گھر بخارے کو کوئی ناز نہیں اپنے دل کا محروم بھلا کیوں بنائے گی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور جھما کا ہوا۔ اس روز گھر سے رخصت ہوتے وقت تنوری نے گلی میں مجھے بتایا تھا کہ وہ بھی سی ایس ایس کی تیاری کر رہا ہے۔ اوہ..... اس کا مطلب وہ بھی گہنا ہی کی خاطر یہ معزکہ سر کرنا چاہتا ہے۔ یا شاید گہنا نے ہی اسے یہ مشورہ دیا ہو۔ میرے ذہن میں خیال آتے چلے گئے اور میرے دل میں پہلی بار رقبابت نام کے سپولے نے جنم لیا۔ اس روز مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ رقبہ لفظی سے دل کی شریانوں میں کتنا کڑواز ہر پھیل جاتا ہے کہ جس کا ذائقہ ہمیں اپنے پینے والے پانی میں بھی محسوس ہونے لگتا ہے۔ میں نے بھی ایک گھونٹ پی کر باقی پانی زمین پر پھینک دیا۔ آج مجھے ہر چیز کڑوی الگ رہی تھی۔

تو گویا ستارہ کے نام پر وہ چھیڑ چھاڑ صرف دل گلی کی خاطر تھی، اور اس نے آخر یہ کیسے سوچ لیا کہ میری توجہ کا محور ستارہ ہو سکتی ہے.....؟..... ہاں یہ تھیک ہے کہ میں نے اس پاکیزہ ہستی کے لیے ہمیشہ اچھا سوچا اور کسی نہ کسی طور اس کے دکھوں کے مداوے کی کوشش بھی کی مگر اس میں میرے کسی ذاتی غرض کو کب دل حاصل تھا؟ اس ستارہ کی پلکوں کی نبی مٹانے کے لیے تو کچھ بھی کیا جا سکتا تھا۔ مگر گہنا نے میرے ستارہ سے

اس بے غرض اور عقیدت بھرے الفاظ کو اتنا غلط کیسے سمجھ لیا۔ دفعۃ میرے ذہن میں ایک اور شک نے سرا جھارا۔ ”کہیں خود ستارہ کو بھی تو ایسا نہیں لگتا ہو گا؟..... نہیں نہیں..... وہ ایک سمجھدار لڑکی ہے اور زمانے کے سرد و گرم سے خوب آشنا ہے۔ وہ بھی میرے بارے میں ایسا کوئی غلط اندازہ نہیں لگا سکتی۔ لیکن گھنا..... آخر وہ کیوں میری نظر کا مطلب نہیں سمجھ پائی؟؟ کیا میری نظر اسی قدر بے زبان تھی کہ وہ اپنا مفہوم بھی گھنا تک نہیں پہنچا سکی۔ کون کہتا ہے کہ نگاہوں کی زبان ہوتی ہے۔ میری بصارت تو گویا میں سے محروم ثابت ہوئی تھی۔ میں جتنا سوچتا گیا، اتنا ہی الجھتا چلا گیا۔ کہتے ہیں من کی گریں ذہن و دل میں بہت زیادہ الجھ جائیں تو نتیجہ جسم کو بھلتنا پڑتا ہے میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا اور شام سے پہلے ہی میرا بدن تیز بخار میں چکنے لگا۔ اسماعیل کسی کام سے میرے کمرے میں آیا تو مجھے یوں آڑھا تر چھا بستر پر پڑا دیکھ کر گھبر اسا گیا اور پھر میرا ما تھا چھوتے ہی وہ باہر کی طرف لپکا۔

## کتاب گھر کی پیشکش

کچھ ہی دری بعد علاقے کا مشہور ڈاکٹر اپنے نائب کے ساتھ میرے سرہانے موجود تھا۔ اس نے حرارت تشخیص کی اور مکمل آرام تجویز کیا لیکن کیا صرف جسم کو آرام دینے سے دل کے سب درد دور ہو جاتے ہیں؟ مجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ یہ ظاہری سکون ہمارے اندر کی بے تابی کو اور بڑھا دیتا ہے۔ انسان چلتا پھرتا رہے اور دھیان کسی طرف بٹا ہو تو بڑی غنیمت ہے ورنہ خالی ذہن کے ساتھ یوں کسی بند کمرے میں پڑے رہنے سے تو اندر کے طوفان اور سوا ہو جاتے ہیں۔ آدھی رات کے قریب میں بھی اپنے اندر کی اس جنگ سے چھنجلا کر باہر صحن میں نکل آیا۔ میں نے اپنے جسم پر وہی بستر پر اکھیں لپیٹ لیا تھا۔ باہر صحن کے آسان پر میرے سارے دوست چمک رہے تھے۔ ان میں سے ایک چمکیلا تارہ بولا۔ ہم نے کہا تھا نا..... ہمارے سوا کسی سے دل نہ لگانا..... یہ انسان بڑے بے مرود ہوتے ہیں۔ یہ بھلا تمہاری محبت کی قدر کیا جائیں۔ چلو بھول جاؤ سب..... اور پھر سے ہمارے دوست بن جاؤ..... ”کاش انسان کا حافظہ ہی اس کے اختیار میں ہوتا تو شاید باقی کسی مزید اختیار کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ مگر انسان تو سدا کا ”محبوب“ ہے۔ میں بھی انہی لاچاروں میں سے ایک تھا جو اس حافظے کے عذاب کے ساتھ صحن میں حوض کے قریب بنے چو بارے پر بیٹھا خود سے لڑ رہا تھا۔

کچھ ہی دری گزری ہو گی کہ بڑے احاطے سے صحن کی طرف آنے والے راستے پر کوئی آہٹی ہوئی اور کسی نے گڑ کدار آواز میں پوچھا ”کون ہے وہاں.....“ میں نے جواب دیا ”آیاں“ آواز دینے والا اندر ہیری ڈیوڑھی سے صحن کی تاروں بھری روشنی میں آگیا۔ وہ مویٰ تھا ”اوے شہزادے..... سب خیر تو ہے نا..... اسماعیل تو بتا رہا تھا کہ تجھے سخت بخار ہے پھر تو یہاں صحن میں کیا کر رہا ہے اس وقت۔“ مویٰ میری جانب چلا آیا۔ ”بس اندر کمرے میں دم گھٹ رہا تھا..... اس لیے باہر کھلی ہوا میں آ کر بیٹھ گیا۔“ مویٰ نے میرا ما تھا چھوا..... ”بخار تواب بھی ہے۔ یہ کون کون سے روگ لگا رکھے ہیں تو نے اپنی جوانی کے ساتھ.....؟“ مویٰ میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ میں نے دھیرے سے کہا ”ساری زندگی ہی روگ ہے شاید..... تم آدھی رات کو کیا کر رہے تھے یہاں.....“

مویٰ نے لمبی سانس بھری ”یہاں دن سے زیادہ رات کو ہوشیار رہنا پڑتا ہے شہزادے..... گھات لگانے کے لیے دن سے زیادہ رات مددگار ہوتی ہے..... رات ہمیشہ دشمن کی دوست ہوتی ہے.....“ میں نے چاروں طرف چھائے اندر ہیرے کو دیکھ کر کہا ”ٹھیک کہا تم نے..... رات سے بڑا

دشمن شاید اور کوئی نہیں.....” موی نے غور سے میری جانب دیکھا۔

”جی بتا..... تجھے کسی سے عشق تو نہیں ہو گیا.....؟ ..... تیری آنکھیں بولتی ہیں کہ تو اپنا سب کچھ ہار چکا ہے.....؟“

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی ”کیوں ..... کیا چاقو بازی کی طرح اس میدان کے بھی کھلاڑی رہے ہو بھی .....؟ تو بتاؤ پھر کیسا تجربہ

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

رہا.....؟“

موی بھی مسکرا دیا ”چاقو کی دھار تو پھر بھی نظر آ جاتی ہے پیارے لیکن اس بے بخت عشق کی دھار کا تو اندازہ بھی نہیں لگا پاتا انسان اور اگلے لمحے زمین پر پڑا اپنے ہی خون میں تڑپ رہا ہوتا ہے ..... اسی تڑپ سے گزرنے کے بعد ہی تو چاقو اٹھایا تھا میں نے .....“

موی کی آہنے ہی مجھے اس حقیقت سے آشنا کر دیا تھا کہ وہ بھی محبت کی اس دودھاری تلوار سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے۔ میں نے ٹوہ لینے کے لیے اس سے پوچھا ”اس دھار کی کمک کچھ کم ہوئی یا بھی باقی ہے .....؟“ موی کہیں دور خلاف میں دیکھتا رہا ”نہیں شہزادے ..... شروع شروع میں تو میں بھی یہی سمجھا تھا کہ شاید وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ زخم بھی بھر ہی جائیں گے مگر میں غلط تھا۔ عشق کا ناسور ہرگز رتے لمحے کے ساتھ مزید لا علاج ہوتا جاتا ہے ..... اور ظلم تو یہ ہے کہ نہ یہ انسان کو پوری موت دیتا ہے اور نہ یہی مکمل زندگی ..... بس انسان ساری عمر بزرخ میں ہی گزار دیتا ہے .....؟“

میں حیرت سے موی کو دیکھتا رہا۔ بظاہر اوپر سے فولاد نظر آنے والا یہ انسان اندر سے کتنا پکھل چکا تھا، لیکن اب بھی دن رات جل رہا تھا۔ پھر اچانک موی جیسے ہوش میں آ گیا۔ ”میری ایک بات مانے گا شہزادے .....؟“

”ہاں ..... بولو .....“ موی نے میرا باتھ تھام لیا ”تو اپنے گھر واپس چلا جا ..... یہ جگہ تیرے لیے نہیں بنی ہے۔ میری اور زنگا بھائی کی زندگی کا کچھ پختہ نہیں، چاروں طرف گدھ منڈلاتے پھرتے ہیں ..... ابھی وقت ہے تیری واپسی کا ..... ورنہ پھر عمر بھر کے لیے خوار ہو جائے گا ..... تیرا باپ بڑا شریف انسان ہے ..... اس کے غصے کا برانہ منایا کر .....“ میں نے موی کا باتھ تھپتھپایا ”کچھ فیصلے انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتے موی بھائی ..... میرا خیر اس گھر سے کہیں پرے اٹھایا گیا ہے ..... میں جانتا ہوں کہ گھر چھوڑ کر میں نے اچھا نہیں کیا ..... لیکن وہاں رہتا بھی تو ہر روز انہیں کوئی درد یا تکلیف دیتا رہتا ..... تو پھر کیوں نا ایک ہی بار یہ جھنجھٹ ختم کر دیا جائے ..... میرے ابا جو مجھ سے چاہتے ہیں وہ میں چاہ کر بھی نہیں کر پاتا۔ ان کے دکھاوے کے لیے دو چاروں ویساں بھی جاؤں تو پانچویں دن ضرور خود سے ہی کلکرا جاتا ہوں ..... کاش میرے اندر خود کو تبدیل کرنے کی صلاحیت ہوتی .....؟“

موی میری بات سن کر سر ہلاتا رہا جیسے اسے آدمی بات سمجھ میں آئی ہوا اور آدمی نہیں۔ میں نے بات کا رخ موزنے کے لیے اس سے پوچھا ”اسا عمل بیمار ہاتھا کہ یہاں باقاعدہ چاقو بازی کی مشق سکھنے کے لیے شاگردی اختیار کرنا ضروری ہے ..... کیا تم مجھے اپنی شاگردی میں لوگے ..... مجھے یہ فن سکھا دو گے .....؟“ موی کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی ”ہاں ..... باقاعدہ شاگرد بننا ہے تو ضروری ..... پر تم کیوں سیکھنا چاہتے ہو یہ سب ..... ہماری دنیا سے باہر اس ہنر کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہاں مرنے والے اور مارنے والے دونوں کو بڑی جلدی ہوتی ہے۔ بس ایک گولی چلتی ہے چالیس، پچاس روپے والی ..... اور کھلیل ختم .....؟“

”تم نے ابھی کہا تھا نا کہ تم بھی کسی دوسرے درد کی دھار مٹانے کے لیے چاقو کی دھار کی طرف آئے تھے، تو بس یوں سمجھ لو کہ میرا بھی کچھ

ایسا ہی معاملہ ہے۔ مجھے بھی ایک زہر کی کاٹ ختم کرنے کے لیے دوسرا زہر پینا ہے۔ کیا تم اس میں میرا ساتھ دو گے، لیکن میں چاہتا ہوں کہ میری تربیت مکمل ہونے تک یہ بات راز میں ہی رہے تو بہتر ہے۔“ موی نے میرا ہاتھ مضبوطی سے کپڑا لیا۔ ”اگر ایسی بات ہے تو پھر موی حاضر ہے۔ لیکن راز رکھنے کے لیے ہمیں بڑے احاطے سے دور رہنا ہوگا۔ میں روزانہ تمہیں اس صحن میں آ کر سبق دے جایا کروں گا۔ یہاں سب میرے اپنے اعتماد کے لوگ ہوتے ہیں۔ بات باہر نہیں جائے گی۔ تم فکر نہ کرو۔ اور ہاں۔۔۔ تمہاری بآ قاعدہ شاگردی کا اعلان بھی اب اسی وقت ہو گا جب تم اپنی تربیت مکمل کر لو گے۔ میں خود رنگا بھائی سے کہہ کر تمہاری کلائی پر دھا گا بندھواوں گا۔“ موی میرا سر سہلا کرو ہاں سے انھ کر چل دیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اپنے جسم کو روزانہ اس قدر تھکا دوں گا کہ اس کے ریشے ریشے سے ٹوٹنے کی الگ آواز سنائی دےتا کہ میرے ذہن کو کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ ملے۔ حافظ اگر خود سے چھینا نہیں جا سکتا تو کیا ہوا۔۔۔ اس پر شدید تحکم سے ٹوٹنے جسم کا غلاف توڑا جا سکتا ہے۔

موی نے میری تربیت کا وقت صحیح نظر کے بعد کا چنان تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت آس پاس برائے نام چھل پہل ہوتی تھی اور دس بجے سارنگا کا دفتر تک بمشکل ہی کوئی اس صحن کی طرف آتا تھا۔ اس اعیل پہلے ہی دن سے ہمارا رازدار تھا اور صحن کی جانب کے کارندوں اور نوکروں کو موی نے اپنی خاص زبان میں سختی سے منع کر رکھا تھا کہ کسی کو اس طرف ہوتی کارروائی کی بھنک نہیں پڑنی چاہئے۔ میں نے احتیاطاً اس اعیل کے ہاتھ ایک رقعت میں راجہ کو لکھ بھیجا تھا کہ میں چند دن تک شاید ان سے رابطہ نہ کر پاؤں اس لیے وہ پریشان نہ ہوں۔ میں نے اسے سہی بات طریقے سے ریحان کو بھی منتقل کرنے کی ہدایت کرو یہی تھی کہ وہ چھوٹی اور امی کو میری طرف سے اطمینان دلادے کہ میں ٹھیک ہوں اور بابا کی شرط کے مطابق کچھ ”بننے“ کی کوشش میں ہوں لہذا وہ لوگ میری جانب سے خود کو ہلکا نہ کریں۔ ناہید کی ٹیوشن کا سلسلہ البتہ جاری رہا، لیکن میں نے ٹیوشن کا وقت بدل دیا تھا۔ اب میں مغرب کے اندر ہیرے میں یعقوب میشن سے نکلتا اور رات نوبجے تک واپس لوٹ آتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بھی مجھے دن کی روشنی میں باہر دیکھے۔ یا شاید میں اپنے آپ سے چھپنے کے لیے اس اندر ہیرے کا سہارا لے رہا تھا۔

شروع شروع میں موی نے مجھے خود میری کلائی پر قابو پانے کے طریقے کی مشق کروائی۔ کلائی کا کون سا پٹھا اور کون سی رُگ کب اور کس طرح خود اپنی مرضی سے حرکت میں لائی جاسکتی ہے۔۔۔ اس کی خصوصی تربیت کے بعد ہی بات آگے بڑھ سکتی تھی۔ ابتدائی چار پانچ دنوں تک تو چند منٹ کے اندر ہی میرے بازوؤں کے پٹھے کھنپے اور رگیں یوں تڑخنے لگتی تھیں کہ میں بمشکل اپنی چینوں کا گلا گھونٹ پاتا تھا۔ واقعی موی ایک ماہراستاد تھا اور اس نے دل و جان سے اپنا سارا اٹاٹا شدن بدن میری جانب منتقل کرنے کی ٹھان لی تھی۔ مشق کے بعد میری حالت کچھ اتنی ابتر ہو جاتی تھی کہ گھنٹوں مجھے اپنی دونوں کلائیوں کے ساتھ لکڑی کی پتلی کھیاں باندھ کر درد پر قابو کھانا پڑتا تھا۔ شام کے اوقات میں موی وقت نکال کر مجھے چاقو بازی کی دوسری جزیئات کے بارے میں بتاتا رہتا، مثلاً نظر رکھنے کا فن، قدموں کو کس توازن سے کب اور کس طرف جھکانا ہے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں چاقو منتقل کرتے وقت حریف کی کس کس حرکت کو جانچنا پڑتا ہے۔ چاقو پر کب اور کتنی مضبوط گرفت رکھنا ضروری ہے۔ وغیرہ وغیرہ غرض اب میں اور موی چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے جب بھی وقت ملتا صرف ایک ہی موضوع پر بات کرتے تھے اور وہ تھا صرف اور صرف موی کا یہ فن۔ دوسرے ہفتے کے اختتام پر موی نے مجھے مختلف زخموں کی اقسام کے بارے میں سبق دینا شروع کر دیا کہ کس زخم کے لیے کتنی دھماکہ اور گہرائی کی ضرورت ہوتی

ہے اور پل بھر میں ہی صرف چاقو کی پانچ سنٹی میٹر کی نوک سے مخالف کے جسم پر کتنے نقش و نگار بنائے جاسکتے ہیں۔ موئی ہر بار مجھ سے بھی کہتا کہ جس کے ہاتھ میں چاقو ہوا اور اگروہ "اصیل" ہو تو پھر اس کی بڑی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس فن کی حرمت کا پاس رکھے اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے کہ جس سے دوسرے چاقو بازوں کی عزت پر کوئی حرف آجائے۔

شاید وہ میری تربیت کا سلوہواں دن تھا۔ موئی مجھے بتا رہا تھا کہ چاقو پر ہتھیلی کا دباؤ کب اور کتنا رکھا جائے کہ جس سے مخالف کو دار بھٹکنے میں دشواری ہو۔ ہم اب صحن کے احاطے میں ایک کچی جگہ پر باقاعدہ کچی مٹی اور ریت میں دائرہ ڈال کر ایک دوسرے کے مقابل آ کر وار کرتے ہوئے یہ مشق کرتے تھے۔ اچاک صحن کے بڑے دروازے پر زور کی دستک ہوئی اور موئی کا وار چوک گیا۔ مجھے یوں لگا کہ میرے بائیں شانے میں انگارے سے بھر گئے ہیں۔

## کتاب گھر کی پیشکش

### مائند بلاسٹر

**مائند بلاسٹر**، مظہر کلیم کی عمران سیریز کا ایک اور تیز رفتار اور ایکشن سے بھرپور سائنسی ناول ہے۔ اس ناول میں ایک ایسی ہی سائنسی آئل کا استعمال پاکیشیا کے فوجی کمانڈروں کے خلاف کیا گیا جو ہبہت، ساخت اور کام کے لحاظ سے صرف عام سائنسدانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ عمران کے لئے بھی بالکل نیا تھا۔ پاکیشیا کے ذیڑھ سو کمانڈوز کو جیتے جا گئے ہلاک کر دیا گیا اور وہ ہاتھ تک نہ ہلا کے جبکہ انہیں کسی گیس یا ریز سے بے ہوش یا بے حس و حرکت بھی نہ کیا گیا تھا بلکہ ان کو صوتی لہروں کی مدد سے گہری نیند سلا یا گیا تھا، ایسی نیند جوان کے مرنے کے بعد بھی قائم رہی۔ پھر پاکیشیا کے ایسی تیصیبات پر ان صوتی لہروں سے حملہ کیا گیا اور پاکیشیا کی ایسی تیصیبات کے تمام سائنسدان بہتر گھنٹوں تک باوجود سر توڑ کو ششوں کے نیند سے نہ جاگ سکے۔

کیا پاکیشیا کی ایسی تیصیبات جن کی حفاظت کے لئے پاکیشیائی حکومت ہر سال کروڑوں ڈالر خرچ کرتی ہے کا دفاعی نظام اس قدر کمزور تھا؟ اس پورے کھیل میں عمران اور پاکیشیا سکرٹ سروس صرف ناپتھر گئے اور دشمن مسلسل پاکیشیا کو نقصان پہنچاتا رہا۔ پھر جب عمران کو دشمن اور اس آئل مائند بلاسٹر کا پتہ چلا تو عمران اور اس کے ساتھی دیوانہ وار اس آئل کو ختم کرنے اور دشمن ملک سے انتقام لینے کے لئے میدان میں کو دپڑے۔ یہ انتقام تھا پاکیشیا کے ذیڑھ سو کمانڈوز کے خون کا انتقام۔ اور جب عمران انتقام پر آجائے تو کیا ہوتا ہے اس کے بارے میں جانے کے لئے پڑھیئے ناول "مائند بلاسٹر"۔

"مائند بلاسٹر" کتاب گھر پر دستیاب ہے۔ جسے **ناول سیکشن** میں دیکھا جاسکتا ہے۔

## باب 17 کتاب گھر کی پیشکش

در اصل غلطی موی کی نہیں تھی۔ میں خود ہی وستک کی تیز آوازن کر کچھ ایسا چونکا کہ موی کے اشارہ کرنے کے باوجود اپنا قدم پیچھے نہ لے سکا اور چاقو کی زد میں آگیا۔ پل بھر میں میرا سفید کرتاشانے کی جانب سے سرخ ہونا شروع ہو گیا۔ موی نے گھبرا کر دروازے کی جانب دیکھا اور اسماعیل کو اشارہ کیا کہ آنے والے کو سنبھالے جب کہ مجھے براہمے میں لے جا کر اس نے شانے کی جانب سے میرا کرتا چھاڑ کر جلدی سے زخم کا جائزہ لیا۔ ”شگر ہے زخم زیادہ گھر انہیں ہے شہزادے۔ لیکن مرہم پئی ضروری ہے۔۔۔“ کچھ ہی دیر میں حولی کا ہی ایک نوکر جوڈ پندرہ کا کورس بھی کر چکا تھا میری مرہم پئی کر رہا تھا۔ دروازے پر زنگا کا ہی کوئی خاص کارندہ تھا جس نے موی کو بتایا کہ پاہر دروازے پر پوٹس آئی ہے۔ موی معاملہ دیکھنے چلا گیا اور میں اپنے کمرے میں آکر تکینے سے سرناکا کر لیٹ گیا اور جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ شاید یہ اس مسکن دوا کا اثر تھا جو مرہم پئی کرنے والے نے مجھے در دور کرنے کے لیے چند گولیوں کی صورت میں دی تھی۔

میری آنکھ پھر دوپھر کو ہی کھلی جب اسماعیل میرے لیے کھانا لے کر آیا ”اب کیسی طبیعت ہے۔۔۔“ میں نے انھوں کو سمجھے سے نیک لگایا۔“ بہتر ہوں۔۔۔ معمولی زخم ہے۔۔۔ بھر جائے گا۔۔۔“ اسماعیل نے ہمدردی سے میری جانب دیکھا ”کیوں خود کو تباہ کان کرتے ہو۔۔۔ کیا شیخ صاحب کے گھروں سے کوئی ان بن ہو گئی ہے۔۔۔؟“ مجھے حیرت کا ایک جھٹکا گا۔ اسماعیل کو میرے اندر کی خبر کسے ہو گئی۔۔۔ ”کیوں۔۔۔؟۔۔۔ تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو۔۔۔؟“ اسماعیل نے کھانا چنتے ہوئے جواب دیا ”تم بہت دنوں سے ان کی طرف گئے جو نہیں۔۔۔ ان کی بڑی بیٹی نے تاہید بٹیا کی طرف تمہارے لیے پیغام بھی بھجوایا تھا مگر تم پھر بھی نہیں گئے۔۔۔“

دوروز پہلے ہی میں کسی وجہ سے تاہید کے ہاں نہیں جا پایا تو میں نے اسماعیل کو پیغام دینے کے لیے کھلا بھیجا تھا۔ اسی روز تاہید نے اسماعیل کو یہ بتایا تھا کہ ستارہ نے شیخ صاحب کے ذریعے پیغام بھجوایا ہے کہ وہ سب میری اتنی بھی غیر حاضری سے بہت پریشان ہیں لہذا میں پیغام ملتے ہی ضرور شیخ صاحب کے ہاں ہواؤں، لیکن میں نے اسماعیل کی سنی ان سنی کرتے ہوئے تاہید کو بھی صرف ہوں ہاں کر کے ہی نال دیا تھا کہ ”کچھ مصروفیت ہے وقت ملتے ہی چلا جاؤں گا۔“ تاہید کو تو اندازہ بھی نہیں تھا کہ میں کتنے دنوں سے خود کو مجبوس کیے بیٹھا ہوں۔ کھانا کھانے کے دوران بھی اسماعیل مجھے غور سے دیکھتا رہا ”صرف یہی بات نہیں ہے بابو۔۔۔ بات کچھ اور بھی ہے جو تم اسماعیل کو بتانا نہیں چاہتے۔۔۔“

میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا ”اور بھلا کیا بات ہو سکتی ہے۔۔۔ تم جانتے تو ہو کہ صبح دو گھنٹے کی یہ سخت تربیت کیسے میرا جوڑ جوڑ بھا دیتی ہے۔۔۔ پھر دن بھر کہیں جانے کے قابل ہی کب رہتا ہے انسان۔۔۔؟۔۔۔“

اسماعیل نے میرے لیے پانی جگ سے گلاں میں ڈالا ”نہیں بابو۔۔۔ جب تم شیخ صاحب کے گھر سے ہو کر آتے تھے تو تمہارے چہرے پر ایک خاص روشنی ہوتی تھی۔۔۔ ایک میٹھی می مسکراہٹ۔۔۔ پورے بابو لگتے تھے تم۔۔۔“

مجھے ہنسی آگئی..... ”تو اب کیا آدھارہ گیا ہوں .....“ اسماعیل کی آواز میں درد تھا ”کاش آدھے ہی رہ جاتے ..... پر تم تو خود کو پورا ختم کرنے کے دریے ہو ..... خود کو اتنا آزار نہ دو ..... مر جاؤ گے .....“

میں چپ رہا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ عشق نامی یہماری اپنے ساتھ کچھ ایسی مہریں بھی ہماری پیشانیوں پر چھاپ جاتی ہے کہ پھر سارا زمانہ انہیں ہماری جبینیوں پر جگمگاتے دیکھ کر ہمارے اندر کے حال سے واقف ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لیے یہ محبت یہماری کم اور بدنامی زیادہ کہلاتی ہے۔

شام تک دوبارہ موی بھی میرا حال احوال پوچھنے کے لیے چھوٹے صحن کی طرف چکر لگا گیا تھا۔ میں نے اس سے پولیس کے معاملے کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ بازار میں سینڈوکی کسی سے ہاتھ پائی ہو گئی تھی اور جلدی میں چاقو غلط چل جانے کی وجہ سے مخالف کچھ زیادہ گھائل

ہو گیا تھا۔ لہذا سینڈوکو وہاں سے نکلا پڑا۔ پولیس اسی کی تفتیش کے لیے یعقوب میشن کے دروازے تک آئی تھی پر سینڈوکی حمانت قبل از گرفتاری کے کاغذ دیکھ کر واپس چلی گئی۔ یہ وہی سینڈوک تھا جس نے اس روز مجھے پنج باری کے مقابلے میں شکست دی تھی۔ کھلے دل کا لڑکا تھا اور بعد میں جتنی پار بھی

میرا اور اس کا بڑے احاطے میں آمنا سامنا ہوا اس نے بڑی خنده پیشانی کے ساتھ میرا حال احوال پوچھا تھا۔ درمیان میں سارنگا نے بھی ایک آدھ بار آتے جاتے مجھے ٹوکا تھا کہ آج کل میں کہاں غائب رہتا ہوں کہ میری کچھ خبری نہیں ملتی، لیکن ہر بار میں کوئی بہانہ بنانے میں کامیاب ہو ہی جاتا

تھا۔ ویے بھی ان دونوں سارنگا اس نواب دہیر کے مسئلے میں بری طرح الجھا ہوا تھا جو کچھ روز پہلے اپنے ان جان دشمن کی کھونج لگانے میں سارنگا کی مدد لئے آتا تھا۔ اس اعلیٰ نے مجھے بتایا کہ اب تک سارنگا کو اس معاملے میں اس لئے بھی کامیابی نہیں مل سکی تھی کیونکہ نواب دہیر کی ”زمرد جو ملی“ کالی کے

علاقے میں پڑتی تھی۔ وہی کالی دادا جسے سارنگا نے ٹکر دے کر اس سے یہ علاقہ چھینا تھا جس پر آج کل سارنگا کا راج تھا۔ میں نے اسماعیل سے کالی کے مارے میں تفصیل لوچھی تو اس نے بتا کہ اس کے اوپر سارنگا کے درمان ہمیشہ سے ہی کانٹے کی ٹکر رہی ہے۔ دونوں میں کسی نہ کسی بات رسمیتی ہی۔

رہتی ہے اور آج کل وجہ تنازع عنوان دیپر کی زمرہ حوالی ہے، کیونکہ زیریز میں دنیا کے اصول کے مطابق کوئی بھی دوسرے کے علاقے اور سرکار میں۔

مذاقلت نہیں کر سکتا، لیکن سارے نگاہیے محسن ابراہیم کے بھیجے ہوئے سائل کو پوری خالیہ اساتھ بھی تو نہیں لوٹا سکتا۔ لہذا امعاہله گھسیس ہوتا جا رہے۔

ابراہیم وہ شخص تھا جس نے سارنگا کی تب مدد کی تھی جب وہ صرف یعقوب فور میں تھا اور اپنی خون پسینے کی کمائی لوٹنے والوں سے حساب کرتے رہے۔ اس نے ملک پہنچا تھا تب ابراہیم نے یعقوب کو اس وقت شاہزادہ کا تھوڑا جس سارا دن اس کے خلاف ہو چکا تھا۔ نصراف

یہ بلکہ ابراہیم جو خود بھی اس وقت اس علاقے کا نامور استاد تھا اس نے یعقوب کو اپنے وقاردار بھی فراہم کیے تھے جنہوں نے یعقوب کو اس کا حق دلانے میں بھی بڑا کام کیا تھا۔ ابراہیم بھت تعریض قابل شہر جو گھٹ جھاڑ کر آئا تھا، میں رسمکان کی زندگی کا گزینہ راتھاولیاں، زندگی میں پہلے اسکی کام

سفارش کی تھی، تو پھر ایسے میں سارنگا اپنے محسن کے سفارش کردہ شخص کی مدد سے کیسے دست بردار ہو جاتا۔ اسی لیے وہ دن رات نواب دیر کے معاملے میں بیچاتا تھا۔

شام تک میرے درد کو کافی آرام آچکا تھا لیکن اسما عیل پھر بھی خد کر کے مجھے پئی بدلنے کے لیے قربی کلینک تک لے گیا۔ مقصد کچھ دیر کے لئے مجھ کم رکھ لئے تھے اور احمد، سے نکلا نا بھجو تھا کہ ایک نکتہ نکلتے۔ اٹھا جنہیں حکم تھے نامہ سوتھوا، سے محمد شاہ کو کہا تھا کہ

ہے..... بس اب دعا کریں کہ وہ بہت اچھے نمبروں سے کامیاب ہو کر جلدی سے افسرگ جائیں..... ”میں نے غور سے اس کی جانب دیکھا“ میری دعا میں آپ کے ساتھ ہیں..... اور اس کے ساتھ بھی جس کے لیے آپ مجھے دعا کرنے کا کہہ رہی ہیں..... ”  
کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں نے تاہید سے واپسی کی اجازت طلب کی ”کچھ دیر تو بیٹھیں آیاں بھائی، ستارہ اور گھنا جائیں تو چلے جائیے گا۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

ان کے ابا نہیں لینے کے لیے بس آتے ہی ہوں گے..... ”میں بات

”نہیں مجھے اس اعمال کے ساتھ کسی ضروری کام سے جانتا ہے..... وہاں میشن میں بھی میرا منتظر ہو رہا ہو گا..... پھر ملاقات ہو گی..... ” میں بات

ختم کر کے سلام کرتے ہوئے کمرے سے نکل آیا۔ برآمدے میں آکر میرا جی چاہا کہ ایک بار اور اسے جی بھر کے دیکھ لیتا تو کیا تھا لیکن پھر میں نے خود ہی اپنے دل کی اس معمومی خواہش کو بری طرح کچل ڈالا۔ یہی چھوٹی چھوٹی اور بظاہر معمومی خواہشیں ہیں آس اور آرزوؤں کے کھنے جنگل میں اس پتلی گپٹ نڑی تک لے جاتی ہیں۔ جس کا اختتام بالآخر عشق کی اس اندر ہی اور گھری کھائی میں ہوتا ہے جہاں گرنے کے بعد آج تک کوئی عاشق سلامت واپس نہیں آیا۔ میں برآمدے میں چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ پیچھے سے ستارہ کی ملائم آواز نے میرے قدم روک لیے ”سینے.....“ میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

وہ خود ہی قدم بڑھاتی میرے قریب چلی آئی، اس کا سر جھکا ہوا اور ہونٹ لرز رہے تھے۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اگر ان دو بہنوں کو ایک جیسے کپڑے پہننا دیے جاتے تو شاید ان میں تمیز کرنا بہت مشکل ہو جاتا لیکن دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ یا پھر شاید ستارہ کی یہ سنجیدگی اس کی بیوگی کی دین تھی؟

اس نے حسب معمول اپنی سانس درست کرنے میں کچھ لمحے صرف کیے ”آیاں..... کیا آپ ہم لوگوں سے کچھ ناراض ہیں.....؟..... شاید ہم لوگوں سے انجانے میں کوئی خطأ ہو گئی ہے.....؟“

میں ہڑ بڑا سا گیا۔ ستارہ سے ایسے کسی سوال کی توقع ہرگز نہیں کر رہا تھا ”نہیں نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آپ کے دل میں ایسا خیال آیا کیسے.....“ اس نے نظریں اٹھائیں ”بس یونہی..... آپ اتنے دن سے گھر بھی نہیں آئے..... نہ ہی اپنی کوئی خیز خبر دی.....“

”بس مصروفیات ہی کچھ ایسی ہو گئی ہیں کہ یعقوب میشن سے نکلا ہی نہیں ہوتا، اور پھر سچ تو یہ ہے کہ میرا تعلق اب ایسی جگہ سے جڑ گیا ہے کہ جس کے نام کی کالک آپ کے آنگن سے دور ہی رہے تو بہتر ہے۔“

ستارہ نے تڑپ کر میری جانب دیکھا ”آپ ایسا کیوں کہتے ہیں۔ کوئی جگہ اچھی یا بُری نہیں ہوتی..... ہم اپنے رویوں سے اسے ایسا بنا تے ہیں..... آپ کا کردار کیا ہے یہ ہمارا پورا گھرانہ اچھی طرح جانتا ہے.....“

میرے منہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی نکل گیا..... ”لیکن شاید گھنا ایسا نہیں سمجھتی.....“ ستارہ میری بات سن کر کچھ دیر خاموش رہی۔ ”میں جانتی ہوں..... اس دن رافعہ نے آپ کے کہنے پر ہی گھنا سے آپ کے بارے میں اس کی رائے جانے کی کوشش کی تھی، لیکن آپ میرا یقین کریں۔ وہ ابھی بہت نادان ہے..... اسے زندگی کی بہت سی باتوں کی بالکل سمجھنہیں ابھی..... اور اس نے جو کچھ بھی کہا اس میں آپ کی جانب اس کا اشارہ ہرگز نہیں تھا۔ وہ بس ایک عمومی بات کر رہی تھی، ہاں البتہ شاید اس کے الفاظ کا چنان وہ کچھ غیر مناسب تھا۔ آپ میرا تو یقین کریں گے نا..... میں اس

اب میں صرف پڑھائی کے وقت ہی آتا ہوں اور بنا اس کے ہاتھ کی چائے پینے ہی ٹیوشن دے کرو اپس بھاگنے کی کرتا ہوں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ آج یعقوب میشن سے نکل ہی آئے ہیں تو ناہید کا یہ شکوہ بھی دور کر دوں۔ ویسے بھی اس کا کورس تقریباً مکمل ہو چکا تھا اور اگلے ہفتے سے اس کے سالانہ امتحانات بھی شروع ہونے والے تھے۔ لہذا یہ ٹیوشن کا سلسلہ بھی اب دوچار دن کا ہی مہمان تھا، لیکن شاید میں نے ناہید کے ہاتھ کی چائے پینے کے لیے اس روز جو وقت چنتا تھا۔ وہ میری قدریہ کے پھیرے کی طرح مجھ پر الثاپٹ نے والا تھا۔

میں جب ناہید کے گھر پہنچا تو برآمدے میں ہی مجھے اندر سے کسی کے ہنسنے بولنے کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ میں سمجھا حسب معمول بوا کی پرانی جان پہچان والیاں اس سے ملنے آئی ہوں گی مگر کاش میں کمرے میں داخل ہونے سے پہلے مہماںوں کے بارے میں تصدیق کر لیتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میرے قدم جم سے گئے۔ سامنے ناہید کے ساتھ ستارہ اور گھنٹہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے تو میرے سارے حواس ہی معطل ہو گئے اور میں نے غیر ارادی طور پر واپسی کے لیے قدم اٹھائے، مگر مجھے یوں تیزی سے پلتھے دیکھ کر ناہید بولی.....” ارے ارے..... آیاں بھیا۔ واپس کہاں چل دیے..... یہ کوئی غیر نہیں..... ستارہ اور گھنٹا ہیں۔“ تب تک ان دونوں کا چہرہ ناہید کی جانب تھا۔ میرا نام سن کر ان دونوں نے چونک کر مجھے پلٹ کر دیکھا۔ اب میرے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ گھنٹا نے شوخی سے کہا ”اچھا تو یہ جناب یہاں چھپے بیٹھے ہیں اور ہم پورے شہر میں ان کی گم شدگی کے ڈھنڈو رے پہنچتے ہیں..... کہاں تھے آپ اتنے دونوں .....؟“

”بس یونہی..... کچھ مصروفیت تھی.....“ گھنٹا نے فوراً ستارہ سے شکایت کی ”دیکھا آپی..... یہ ہم ہی ہیں جو ان کی فکر میں گھلے جا رہے ہیں انہیں تو ہماری کوئی فکر نہیں.....“ ستارہ نے بھی دبے لفظوں میں مجھ سے شکوہ کیا ”ابا بھی آپ کے لیے بہت پریشان ہیں..... آپ نے پھر دوبارہ ہمارے گھر کا چکر ہی نہیں لگایا.....“

ناہید کا خیال نہ ہوتا تو شاید میری زبان سے کوئی تلخ حقیقت بیان ہوئی جاتی کہ ”مجھے جیسے برے انسان کا ان کی گلی سے دور رہنا ہی بہتر تھا، کہیں میری بدناہی کے چھینٹے ان کے درپر نہ پڑ جائیں“..... لیکن میں چپ رہا۔ ستارہ میری خاموشی کو بھانپ گئی اور پھر آخر وقت تک وہ میرے چہرے پر نہ جانے کیا کھو جتی رہی۔ گھنٹا البتہ ویسے ہی گھنٹی اور بہانے بہانے سے مجھے چھیڑتی رہی۔ وہ آج آسمانی کرتا شلوار اور سیاہ شال میں ملبوس تھی۔ گویا آسمان نے سیاہ شال اور ڈھر کھی تھی۔ خیرہ کن اور نظر لگ جانے کی حد تک دل کش۔ مگر افسوس..... وہ آسمان میرانہ تھا۔

آخر ستارہ نے مجھ سے پوچھ ہی لیا ”آپ کچھ چپ چپ سے ہیں آج..... سب ٹھیک تو ہے نا.....“ میں چونک سا گیا ”جی..... جی بالکل..... بالکل ٹھیک ہوں..... آپ بتائیے..... نئی سیکلی کے ساتھ دل لگ گیا ہے آپ کا.....“ ناہید میرا اشارہ سمجھ کر نہس دی۔ ”آیاں بھیا، اب تو میری ایک نہیں..... دو دو سہیلیاں ہیں..... آپ گھنٹا کو بھول گئے کیا؟“

”نہیں..... انہیں کون بھول سکتا ہے.....“ میں گھنٹا کی طرف مڑا ”آپ نا میں..... آپ کے تنویر بھیانے سی ایس ایس کی تیاری کر لی..... کب حصے لے رہے ہیں وہ مقابلے کے امتحان میں.....؟“

گھنٹا اپنی رو میں بولتی رہی ”دیکھیں..... شاید اگلے ماہ بیٹھیں وہ تحریری امتحان کے لیے..... تیاری تو انہوں نے واقعی بڑی زبردست کی

ساری گفتگو کے دوران وہیں موجود تھی..... ساری بات میرے سامنے ہوئی تھی..... ”میں چپ کر کے ستارہ کی بات سنтарہا۔ گویا اسے بھی میرے حال دل کی خبر تھی۔ بس اگر کوئی نہیں جان پایا تو وہ ایک وہی تھا کہ جس کے دم سے یہ سارا فسانہ باقی تھا۔ کتنا فرق تھا دونوں بہنوں میں۔ میں نے ستارہ کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کی۔ ”چلیں..... کوئی بات نہیں..... ویسے بھی دل کے فیصلوں پر کس کا زور چلتا ہے..... میرا دل بھی بہل جائے گا دھیرے دھیرے..... اس میں گہنا کی کوئی خطأ نہیں۔ میں ہی اس کے لیے کچھ جذبے پالنے کا مجرم تھا، اور اس جرم کی خوب سزا مل چکی ہے مجھے..... اب حساب برابر ہو چکا ہے..... ”

ستارہ نے دکھ سے میری جانب دیکھا ”یقین کریں وہ دل کی بہت اچھی ہے۔ اسے تو آپ کے کسی جذبے کی خبر تک نہیں ہوئی۔ شاید مجھے بھی نہ پڑتا چلتا اگر اس روز آپ کی بہن اور گہنا کی باتیں نہ لیتی۔ آیاں..... محبت اپناراستہ خود بناتی ہے۔ اسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی..... ”

”ٹھیک کہتی ہیں آپ..... میرے ہی جذبے میں کچھ کمی ہو گی جو وہ اپنا راستہ نہیں بنانا پایا۔ بہر حال..... آپ خود کو اتنا نہ الجھا سیں۔ ..... وقت سارے زخم بھردیتا ہے..... اور ایک وعدہ کریں مجھ سے کہ مجھ پر جو بھی بیتی آپ وہ گہنا کو کبھی نہیں بتائیں گی..... ” ستارہ دھیرے سے بولی ”میں کوشش کروں گی لیکن آپ بھی وعدہ کریں کہ آپ اپنے دل میں ہم لوگوں کے خلاف مزید کوئی مال نہیں رکھیں گے اور کل ہمارے گھر بھی آئیں گے..... ” میں نے اس نازک انداز کا دل ہلکا کرنے کے لیے اس سے وعدہ کر لیا اور وہاں سے چلا آیا۔

راتتے میں کچھ دیر کے لیے کیفے فراق پر رکا تو راجہ اور مشی سے بھی ملاقات ہو گئی۔ مشی دو دن پہلے ہی ہپتال سے ڈسچارج ہو کر واپس آیا تھا اور اب اس کی صحت بھی کافی بہتر لگ رہی تھی۔ دونوں بہت دریتک مجھ سے گلے شکوئے کرتے رہے۔ بالے کو اس کے باپ نے گیراج کا سامان لانے کے لیے دوسرے شہر بیچ رکھا تھا۔ مشی نے مجھے بتایا کہ اگلے ہفتے شاید ہمارابی اے کارزار بھی نکل آئے۔ شکر ہے کہ میں نے اپنے شانوں پر شال ڈال رکھی تھی ورنہ اگر ان کی نظر کرتے کے اندر میرے شانے پر بندھی پٹی پر پڑ جاتی تو ان کے سوالات کا جواب دینا مشکل ہو جاتا۔ میں نے تاہید کے گھر میں بھی پورا وقت خود کو اسی شال سے ڈھکے رکھا تھا۔ مرزا کی فرمائش پر میں تیری مرتبہ چائے پی کر اٹھا تو رات گھری ہو چکی تھی۔ یعقوب میشن میں داخل ہوئے تو ایک عجیب سی ہل چل محسوس ہوئی۔

میں گاڑی سے اتر کر اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ موی کی آواز نے میرے قدم روک لیے۔ ”آگیا شہزادے..... رنگا بھائی تین مرتبہ تیرا پوچھ چکے ہیں..... بڑے مہمان خانے میں وہ تیرا انتظار کر رہے ہیں چل آجا..... میں تجھے لینے کے لیے ہی آیا تھا۔ ”

میں موی کے ساتھ بڑے مہمان خانے کی طرف جاتے ہوئے بھی سوچ رہا تھا کہ آخر ایسی کون سے خاص بات ہے جس کے لیے مجھے رنگا نے اس وقت خاص طور پر طلب کیا ہے۔ میں مہمان خانے کے ہال میں داخل ہوا تو میرے قدم جم سے گئے۔ اندر سارے گاکے ساتھ کوئی اور بھی موجود تھا۔



## کتاب گھر کی پیشکش باب 18

مجھے دروازے پر رکتے دیکھ کر سارنگا نے آواز لگائی ”اندر آ جاسا جن..... یہاں بھی اپنے ہیں.....“ میں اندر داخل ہوا۔ سامنے ہی نواب دیرالملک اور پاشا صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ پاشا نے مسکرا کر سارنگا کی طرف دیکھا ”آپ نے اس نوجوان کا تعارف نہیں کروایا..... اس سے آپ کا کچھ خاص لگاؤ معلوم ہوتا ہے۔“ سارنگا نے مجھے اپنے پاس بٹھایا ”ہاں صاحب..... کچھ ایسا ہی اپنا ہے یہ..... پرمذانے سے ذرا خفا خفاسارہتا ہے.....“ نواب دیر نے مسکرا کر میری طرف دیکھا ”پڑھ لکھے معلوم ہوتے ہو میاں.....“

”جی..... بی اے کا رزلٹ آنے والا ہے میرا.....“ میری بات سن کر نواب صاحب کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک لہرائی ..... ”رنگا بھائی..... یہ تو مسئلہ گھر میں ہی حل ہوتا معلوم ہو رہا ہے..... آپ اس نوجوان کو کیوں نہیں بھیج دیتے۔ یہ تو آپ کے یہاں کا معلوم بھی نہیں ہوتا۔ لہذا اس پر کسی کے شک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور بہانہ بھی میرے پاس بہت معقول موجود ہے.....“ میں نے حیرت سے پہلے نواب اور پھر سارنگا بھائی کی طرف دیکھا۔ سارنگا نہیں پڑا۔

”نہیں نہیں بڑے صاحب..... یہ واقعی یہاں کا نہیں ہے..... بس مہمان ہے کچھ دن کے لیے اپنے پاس..... پھر اڑ جائے گا یہ پچھی.....“ یہ سن کر نواب صاحب کے چہرے پر مایوسی سی چھا گئی۔ میں نے وضاحت طلب نظر وہ سارنگا کی طرف دیکھا تو سارنگا نے مختصر لفظوں میں مجھے بتایا کہ چونکہ نواب صاحب کی زمرد حولی کالی کے علاقے میں آتی ہے اس لیے رنگا سرکار کے لیے وہاں براہ راست دخل اندازی کی صورت میں بڑوں کی سینٹ Senate کے سامنے جواب دی بہت مشکل ہو سکتی ہے۔ لہذا آج شام سے وہ تینوں بیٹھے یہ مشورہ کر رہے تھے کہ اگر کوئی ایسا طریقہ ہو سکے کہ رنگا بھائی کے گروہ کا کوئی مستند شخص بھیں بدل کر کسی دوسرے روپ میں زمرد حولی میں جا کر رہائش اختیار کرے اور در پر دہ نواب کے دشمن کی کھونج لگائے تو اس طرح مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور کسی جواب دی کی نوبت بھی نہیں آئے گی لیکن انہیں بہت سوچ بچار کے بعد بھی ایسا کوئی اڈے سے وابستہ شخص بھائی نہیں دے رہا تھا لیکن رنگا نے مجھے تین مرتبہ شام سے اب تک کیوں یاد کیا تھا۔ میں نے دھیرے سے اس سے پوچھا تو اسے کچھ یاد آیا۔ ”ہاں..... وہ علاقے کا ڈاکٹر ملا تھا۔ اس نے بتایا کہ کوئی نوجوان اساعیل کے ساتھ مر ہم پڑی کروانے اس کے دو اخانے آیا تھا۔ تجھے چوتھی لگی ہے کیا.....“ میں نے گھبرا کر موکی کی طرف دیکھا ”ہاں..... کندھے پر بلکی سی خراش آگئی تھی۔ اب ٹھیک ہوں.....“

لیکن مجھے لگا کہ جیسے سارنگا میرے جواب سے کچھ خاص مطمئن نہیں ہوا۔ میں نے اس کا دھیان بٹانے کے لئے نواب سے سوال کیا۔

”آپ کو وہ شخص اپنے ہاں کس بھیں میں درکار ہے.....“ نواب نے پاشا کی طرف دیکھا ”کچھ بھی..... ایسا کچھ جس سے وہ دشمن اسے کچھ خاص بھجھ کر چوکناہ ہو سکے۔ مثلاً ہماری بیٹی فضہ کا اتنا تیق..... فضہ کی زیادہ تر پروش اس کی ماں کے ہاں ایران میں ہوئی ہے..... ہم بہت دنوں

سے اس کے لئے یہاں کی تہذیب اور تاریخ کا کوئی استاد رکھنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں..... بلکہ پاشا صاحب تو دو مرتبہ اخبار میں اشتہار بھی دے چکے ہیں لیکن کوئی بھی کل وقتی بنیادوں پر یہ کام کرنا نہیں چاہتا..... اور جزو قتی بنیاد پر ہم کسی کورکھنا نہیں چاہتے۔ فضہ کو اس خطے کی تہذیب اور تاریخ سے بے حد گاؤہ ہے..... ”میں نے کسی گھری سوچ میں گم رنگا کی طرف دیکھا اور دوسرا سوال کیا“ اخبار میں اشتہار دینے کی صورت میں یہ عمل کرنے والے میں مکمل ہو سکتا ہے..... ”پاشانے کچھ سوچ کر کہا۔“ پندرہ بیس دن تو لگ ہی جائیں گے..... اور پھر تم جزئیات طے کرنے کے بعد استاد کی زمرد حوالی میں منتقلی تک سمجھو مہینہ پورا ہو جائے گا۔“ میں نے موی کی طرف سوال طلب نظر و میں نے دیکھا۔ اس نے دھیرے سے سر ہلا کر مجھے ”ہاں“ کا اشارہ دیا۔ مطلب وہ دن رات ایک کر کے ایک مہینے کے اندر میری تربیت کا اہم حصہ مکمل کرو اسکتا تھا۔ میں نے سارنگا کی طرف اجازت طلب نظر و میں نے دیکھا اس نے سر ہلا کیا

”بول کیا بولنا چاہتا ہے.....“ میں نے نواب سے کہا ”آپ اخبار میں اشتہار دے دیں..... پاشا صاحب کی ذمہ داری لگادیں کہ وہ مجھے کامیاب امیدوار چن لیں جو میں ہوں گا۔ اور پھر میں دکھاوے کے لئے باقاعدہ کسی دوسرے شہر سے زمرد حوالی میں اتنا لیق کے طور پر واپس ہو جاؤں گا.....“

نواب کی آواز میں جوش تھا ”لیکن ابھی تو تمہارے استاد محترم نے فرمایا کہ تم یہاں کے نہیں ہو.....“ ”ہاں..... لیکن یہی بات آپ کے حق میں بھی توجہی ہے، کیونکہ اس طرح مجھے کوئی اڑے کے آدمی کی حیثیت سے وہاں شاخت بھی نہیں کر پائے گا.....“

رنگا نے مسکراتے ہوئے میری پیٹھ پھٹپھٹھائی۔ ”لیکن پیارے..... اڑے کا کوئی پُر انا چاول چل پائے گا۔ دشمن بڑا گھاگ ہے اور وہاں سب کچھ اٹا بھی پڑ سکتا ہے۔ تجھے کچھ ہو گیا تو میں تیرے باوا کو کیا جواب دوں گا ساجن میں نے رنگا کو اطمینان دلایا“ آپ مطمئن رہیں۔ آپ کا امتحان پاس کیے بغیر میں ان کے ہاں نہیں جاؤں گا۔ رنگا بھائی کی سرکار پر کوئی آئنج نہیں آئے گی میرے نام سے..... ”سارنگا نے کچھ حیرت سے پہلے مجھے اور پھر موی کو دیکھا“ ”لگتا ہے کوئی کچھ بڑی پکڑ ہی ہے پچھا بنتیجے کے درمیان..... ٹھیک ہے بھی..... سانچ کو آئنج کیا..... پریا درکھ..... آگ پر جل کر دکھائے گا۔“ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ نواب صاحب نے خوش ہو کر پاشا سے کہا ”آپ تمام انتظامات کر لیں..... اشتہار ایک آدھوں میں آ جانا چاہئے.....“ کچھ دیر بعد وہ لوگ سارنگا سے اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد رنگا نے ہم سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ کچھ توقف کے بعد میں نے سارنگا سے وہ سوال بھی پوچھ لیا جو بہت دیر سے میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔ ”لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ نواب صاحب کا دشمن بھی ایک ماہ تک انتظار کرے..... وہ اس تیس دنوں کے وقفے میں بھی تو کوئی جان لیواڑ کر سکتا ہے؟“ رنگا نے مسکرا کر موی کی طرف دیکھا ”دیکھ لیا موی..... تیرالاڈلا بھی اب اڑے والوں کی طرح سوچنے لگا ہے..... لگتا ہے یہاں کا پانی اثر کر رہا ہے.....“ موی بھی نہ دیا۔ ”نواب صاحب ایک ماہ کے لیے ایران جا رہے ہیں۔ کچھ جدی پشتو زمین داری کے مسئلے بنانے ہیں..... اسی لیے یہ وقفہ وہ کسی استاد کے چنانچہ میں لگانا چاہتے ہیں.....“

کچھ دیر بعد محفل برخاست ہو گئی اور میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ پھر وہی تہائی اور پھر وہی یادوں کے آسیب..... دن تو جیسے تیسے کٹ

جاتا تھا مگر یہ کم بخت رات جیسے رک سی جاتی تھی۔ آج شام جب میں نے ناہید کے ہاں اسے دیکھا تھا تب سے جو اک ذرا سا آرام نصیب ہوا تھا وہ بھی شدید بے چینی میں تبدیل ہونے لگا تھا۔ ہم مجت کرنے والے بھی کتنے مقصوم ہوتے ہیں۔ چاروں اپنے محبوب کو اپنی نظروں سے اوچھل رکھ کر اور اس سے کوئی بات یارابطہ نہ کر کے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم اسے بھلانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ صد یوں اوچھل رہنے کے بعد بھی محبوب کی پہلی جھلک ہمیں ٹھیک اسی مقام پر دھکیل دیتی ہے جہاں سے ہم نے ترک ملاقات کی ابتداء کی ہوتی ہے۔ حق ہے کہ مجت سے کوئی فرار ممکن ہی نہیں..... شاید مجت بھی موت کا دوسرا نام ہے۔ مجت جان لیوا ہے۔

میں بھی اسی جان کنی کے عالم میں ساری رات اپنے تکیے پر سر پکلتا رہا، مگر محبت کا اندازہ تیر ہمارے خون میں کچھ ایسا زہر چھوڑ جاتا ہے کہ پھر نیندا اور خواب جیسی نعمتیں ہمیں کم ہی نصیب ہوتی ہیں۔ صبح موی کی پہلی دستک پر ہی میں جھٹ سے باہر نکل آیا۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا ”گلتا ہے آج رات پھر خود سے لڑتے رہے ہو..... کبھی کبھی تو میں تجھ سے ڈر جاتا ہوں شہزادے..... اتنی آگ اپنے اندر رمت جلا کر دوسرے بھی بھسم ہو جائیں۔“ اس روز سے موی نے مجھے باقاعدہ ایک ہاتھ میں رسی باندھ کر اور دوسرے ہاتھ میں چاقو دے کر مشق کروائی۔ یہ رسی ہم دونوں کی باس میں کلائی کو جکڑے رہی اور صرف ہمارا داہنا ہاتھ ہی آزاد رہ کروار کر سکتا تھا۔ ہم دونوں کے پاس پینترے بدلنے کے لیے بھی نہایت کم جگہ تھی کیونکہ موی نے کچی زمین پر سفید چونے سے ڈالا ہوا دائرہ بھی بہت چھوٹا کر دیا تھا۔ اس روز موی نے مشق ختم ہونے پر فراخ دلی سے میری پیٹھ پھینپھائی۔

”شہزادے..... تو واقعی مہینوں کا کام دنوں میں سیکھ رہا ہے۔ بڑی صفائی آتی جا رہی ہے تیرے ہاتھ کے اندر..... شاید یہ تیرے اندر کی اسی نار کا اثر ہے شہزادے..... ناکام محبت اگر بہت کچھ لے جاتی ہے تو بد لے میں دل جلوں کو کچھ ایسا دے بھی جاتی ہے کہ اگر وہ اپنے آپ کو جھونک دیں تو وہ فتح کر سکتے ہیں.....“

شاید موی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ محبت میں ناکامی ہمیں بیک وقت دو مختلف انتہاؤں کی طرف کھینچتی ہے۔ ایک انجام خود کو اور دنیا کو ترک کر دینے کی صورت میں لکھتا ہے جو انسان کو ہمیشہ کے لیے غروب کر دیتا ہے اور وہ پھر سدا کے لیے ایک عضو معلل کی طرح زندگی گزارتا ہے۔ اسے دن رات کا ہوش نہیں رہتا اور وقت اسے گزار دیتا ہے۔ جبکہ دوسری انتہا اس کے اندر کے انسان کو طلوع کر دیتی ہے۔ اس کے اندر کا غصہ اور دکھ اور جلن کی کاث اسے کچھ ایسا کرنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ جس سے وہ دنیا کی نظروں میں آجائے۔ چاہے بدنامی کی صورت ہی کہی پر اس کا تذکرہ کسی طور تو اس کے محبوب تک جا پہنچے۔ ایسے میں اسے کسی انجام کا خوف یا راہ میں آئی کسی بھی رکاوٹ کی جھجک اپنے مقصد سے روک نہیں پاتی۔ مجھے بھی شاید وہی دوسری انتہا اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔ ورنہ خود کو اس جنوں اور اس اذیت میں ڈالے رکھنے کی اور کوئی وجہ مجھے سمجھنہیں آ رہی تھی۔ میری زندگی سے جیسے ایک پل میں ہی تمام خواہیں، سب منزلیں اور تمام مقاصد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے تھے۔ محبت ہمیں اپنوں سے بیگانہ اور غیروں کے معاملے میں بے حس بنا دیتی ہے، مگر میرے اپنے مجھے بھلا کیسے بھول سکتے تھے۔ صح نوبجے کے قریب اساعیل نے مجھے ریحان کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ میرے لیے امی کا پیغام لے کر آیا تھا کہ ابا آج صح کی گاڑی سے ہمارے شہر سے چالیس کلومیٹر دور قبے میں رہائش پذیر تاباہان کی مزاج بری کے لیے نکل چکے ہیں اور اب ان کی واپسی شام حارے تک ہو گی لہذا میں کسی بھی طرح ان سے ملنے آ جاؤں۔ ریحان نے

مجھے دھمکی آئیز نظر وہ سے دیکھا ”دیکھو..... اس دن میں نے تمہاری بات مانی تھی..... لیکن آج اگر تم نے میری بات نہ مانی تو ان سب کے سامنے تمہیں باندھ کر لے جاؤں گا۔“ ریحان کے تیور اور گلے میں پڑا مفلر تارہ تھا کہ آج وہ واقعی بچپن کا کھیل دھرانے کے موڑ میں ہے۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا ”اچھا میرے تھانے دار..... کپڑے بد لئے کی اجازت تو ہے نا۔“ ریحان بھی نہس دیا۔ میرے دل سے صدا آئی کہ کاش میرا بھائی یونہی سدا ہستار ہے۔ ”کاش اسے کبھی کسی سے محبت نہ ہو۔“ ریحان جب مجھے لیے گھر میں داخل ہوا تو برآمدے میں سے برتوں کی ٹڑے اٹھائے گزرتی چھوٹی کے ہاتھ سے سارے برتن گر گئے۔ چند لمحے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ میں اس کے سامنے صحن میں کھڑا ہوں اور پھر وہ امی کو آوازیں دیتی ہوئی میری جانب دوڑی۔ امی بھی اس کی آوازیں سن کر ہڑ بڑائی ہوئی سی کمرے سے نکل آئیں اور پھر کچھ ہی دیر میں سب جل تحل ہو گیا۔ یہ ماکیں اور بہنیں اپنے اندر اتنے آنسو کہاں چھپا رکھتی ہیں۔ بڑی مشکل سے میں نے اور ریحان نے ان دونوں کو چپ کرایا، لیکن پھر بھی بات بے بات امی کی آنکھ چھلک ہی جاتی تھی۔ انہوں نے مجھے پہلا اور آخری حکم یہی صادر کیا کہ میں فوراً ابا سے معافی مانگ کر گھر واپس آ جاؤں ورنہ وہ مجھے اپنا حق نہیں بخشنیں گی..... وغیرہ وغیرہ..... ان ماوں کے پاس بھی اپنے بچوں کو دھمکانے کے کیسے کیسے گر ہوتے ہیں، لیکن ماں کا سب سے بڑا ہتھیار تو اس کی محبت ہوتی ہے۔ میں بھی اپنی ماں کی دھمکیاں سن کر مکاتا رہا۔ پھر بڑی مشکل سے میں نے انہیں یقین دلایا کہ میں بہت محفوظ ہاتھوں میں ہوں اور کچھ ایسا کرنا چاہتا ہوں کہ میری بھی ابا کے سامنے کچھ شناخت بن سکے۔ با توں با توں میں میں نے نواب صاحب کے ہاں نوکری کی بات بھی ان کے کان میں ڈال دی۔ کیا کریں، ان ماوں کو بہلانا بھی تو بڑا مشکل ہوتا ہے، اور میری بھولی امی بھی آخر کار بہل ہی گئیں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ اگر تین ماہ تک میں خود کو ثابت نہ کر سکا تو جیسا ابا کہیں گے، چپ کر کے وہی کروں گا۔ حتیٰ کہ اسٹنٹ پروفیسری کے امتحان میں بھی پوری تیاری کر کے بیٹھ جاؤں گا۔ امی نے دو پھر کے کھانے میں ہر چیز میری پسند کی بنائی اور شام چار بجے سے پہلے میں مشکل اس وعدے پر گھر سے نکل پایا کہ وہ جب بھی ریحان کو مجھے لینے کے لیے بھیجیں گی..... میں ضرور ان سے ملنے آؤں گا۔

محلے کے کپاؤندھ میں اپنے کسی ساتھی کو نہ پا کر میں نے سکون کا سانس لیا کیونکہ میں ابا کے آنے سے پہلے ہی جلد از جلد کا لوٹی سے نکل جانا چاہتا تھا، اور پھر سڑک پر آ کر میرے قدم سادات محلے کی طرف اٹھ گئے۔ کل میں نے ستارہ سے وعدہ کیا تھا کہ میں ان کے گھر ضرور آؤں گا۔ کچھ وعدوں کا پاس نہ چاہتے ہوئے بھی کرنا پڑتا ہے۔ میں جانتا تھا کہ اس نے میری آمد کا ذکر گھر میں بھی ضرور کیا ہوا۔ سادات محلے کی چوڑی گلی میں مرتے ہی مجھے ایک اور حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ سامنے کی دوکان سے بر قعے میں ملبوس ستارہ اور بڑی سی کالی شال میں لپٹی گہنا نکل رہی تھی۔ میں ابھی اسی شش و پیش میں تھا کہ انہیں آواز دوں یا نہیں کیونکہ یوں سر بازار انہیں پکارنا مجھے معیوب لگ رہا تھا کہ اچانک گلی کے ٹکڑے پر کھڑے چند اوپا ش لڑکوں نے خواہ مخواہ بات بے بات زور زور سے ہنسنا اور شش کی دھن پر کچھ گنگنا نا شروع کر دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ ان کا نشانہ اور مخاطب وہی دونوں تھیں۔ میں نے اتنی دور سے بھی ان دونوں کی چال میں واضح پریشانی کی لڑکھڑاہٹ اور تیزی محسوس کر لی۔ مجبوراً مجھے اوٹ سے نکل کر ان کے سامنے آنا ہی پڑا۔ ”آپ لوگ یہاں ..... تھا ..... شیخ صاحب کہاں ہیں .....“ گہنا اور ستارہ کی جیسے جان میں جان آگئی۔ ”اوہ شکر ہے ..... یا آپ ہیں ..... ہم تو ڈر ہی گئے تھے .....“ میں نے پلٹ کر ان نو عمر لڑکوں کی طرف دیکھا۔ شوک سے جھگڑے کے بعد یہاں کا ہر فرد میری شغل خوب اچھی

طرح پچھا نتا تھا۔ وہ مجھے اپنی جانب گھورتے دیکھ کر بولھا سے گئے اور جلد بازی میں ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کروہاں سے رو چکر ہو گئے۔

میں نے ستارہ اور گہنا کو چلنے کا اشارہ کیا ”لیکن آپ دونوں یہاں کیا کر رہی ہیں“ ستارہ نے نقاب کے پیچھے سے گہنا کو گھورا ”یہ سب اسی کی کارستانی ہے۔ میں نے گہنا کو کہا بھی تھا کہ ابا قربی بازار تک گئے ہیں سودا سلف لانے کے لیے۔ وہ آجائیں تو ان کے ساتھ ہی چلیں گے لیکن اس نے تو کسی کی بات نہ مانے کی قسم کھا رکھی ہے“ گہنا بڑی بہن کی ڈانت سن کر روانی سی ہو گئی ”اچھا آپی..... اب ڈائیش تو نہیں ..... پہلے ہی ان بد تیزروں کی وجہ سے میرا آدھا خون خشک ہو چکا ہے .....“ میں انہیں ساتھ لیے ان کی گلی میں داخل ہو گیا۔ دروازے پر دستک کے چند لمحوں بعد اندر سے قدموں کی چاپ ابھری۔ گہنا نے دھیرے سے ستارہ سے کہا ”لگتا ہے ابا جی واپس آگئے ہیں .....“

چند لمحوں بعد دروازہ کھلا اور اس کے پیچوں پیچ کسی کا کرخت چہرہ ابھرا۔ اس کو دیکھ کر ستارہ اور گہنا کی جان نکلی گئی۔ وہ ریحان سے بڑی عمر کا کوئی نوجوان تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی شدید غصے میں گہنا اور ستارہ سے پوچھا ”تم دونوں اس وقت باہر کیا کر رہی ہو..... اور ابا کہاں ہیں .....؟“ وہ شیخ صاحب کا بیٹا حمید تھا جو اپنے آبائی مکان کی رکھوالی کے لیے سیالب زدہ علاقے سے شاید آج ہی واپس آیا تھا۔ ستارہ اور گہنا خوف کے مارے کچھ بول ہی نہیں پائیں۔ اس نے انہیں جھاڑا ”اور یہ کون ہے تم لوگوں کے ساتھ .....؟“ تم لوگ تو چلو اندر ..... تم سے بعد میں بات ہو گی .....“ وہ دونوں تیزی سے لپکتی چکلتی گھر کے اندر چلی گئیں۔ حمید نے اب مجھے کڑی نظروں سے گھورا۔ ”جی فرمائیے ..... کس سے ملنا ہے آپ کو .....“

”شیخ صاحب سے ..... انہوں نے مجھے یاد کیا تھا ..... میرا نام آیاں ہے .....“

”اچھا .....؟ لیکن ابا تو اس وقت گھر پر نہیں ہیں اور آپ ستارہ اور گہنا کے ساتھ ہی آئے ہیں یا یہ صرف شخص ایک اتفاق ہے .....“

”نہیں ..... وہ دونوں مجھے گلی کی نکڑ پر گھر کی طرف آتی ہوئی ملی تھیں ..... آپ چاہیں تو اسے اتفاق بھی سمجھ سکتے ہیں .....“

حمدی کی آنکھوں میں اب بھی بے یقینی کی ایک لہر تیر رہی تھی۔ ایک سخت گیر بھائی کو شاید ایسا برتابوی کرنا چاہئے تھا۔ میں واپسی کے لیے پڑنا۔

”ٹھیک ہے ..... شیخ صاحب آجا گئیں تو انہیں میرا سلام دیجئے گا ..... خدا حافظ“ میرے مژتے ہی شیخ صاحب خود مجھے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے گلی میں داخل ہوتے نظر آئے۔ وہ مجھے اور حمید کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر ہماری جانب لپکے۔ حمید کی آمد کی خبر انہیں بھی نہیں تھی، باب پ بیٹا مل چکے تو وہ میری جانب متوجہ ہوئے۔

”ارے آیاں میاں ..... تم باہر کیوں کھڑے ہو ..... اندر بیٹھ کر باتیں ہوں گی“ میرا جی چاہا کہ ان سے کہوں کہ آپ کے فرزند شاید میرے دروازے پر موجودگی سے بھی نالاں ہیں اور آپ مجھے گھر کے اندر لیے جاتے ہیں۔ شیخ صاحب میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر لے گئے اور تمام ملاقات کے دوران حمید کو میرے اب تک کے کارنا مے نتائے رہے لیکن میں چائے ختم کرتے ہی معدہت کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔ حمید کا برتابو شیخ صاحب کے خاندان سے مختلف تھا اور اس کے اندر کی تلخی کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ شیخ صاحب جیسے زم دل باپ کا بیٹا ہے۔

میں سادات محلے سے نکل رہا تھا مجھے پہلے دو کاندار نے سلام کیا ”آیاں بھیا سلام“ میں نے سر ہلا کر جواب دیا تو سامنے ٹھیلے والے نے ہاتھ جوڑ دیے ..... ”اנו بھائی سلام عرض کرتا ہوں .....“ میں نے کچھ حیرت سے دوبارہ جواب دیا تو نکڑ والے پان کے کھوکھے سے پنوڑی

باقاعدہ ہاتھ جوڑتا ہوا باہر نکل آیا۔ ”سلام انو بھائی..... آپ سے ایک عرض تھی.....“ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب لوگ میرا نام کس طرح جانتے ہیں اور مجھے اس قدر عزت و تکریم سے کیوں پکار رہے ہیں۔ پھر اچانک میرے ذہن میں ایک جھما کا سا ہوا۔ یہ لوگ مجھے اب سارنگ کے توسط سے جانتے ہیں۔ میں اب صرف آیاں نہیں رہا۔۔۔ اس علاقے کا ”بھائی“ بن چکا تھا۔



## کتاب گھر کی پیشکش قلمکار کلب پاکستان

اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ مختلف موضوعات پر لکھ سکتے ہیں؟

☆..... آپ اپنی تحریریں ہمیں رو انہ کریں، ہم ان کی نوک پلک سنوار دیں گے۔

☆..... آپ شاعری کرتے ہیں یا مضمون و کہانیاں لکھتے ہیں؟

☆..... ہم انہیں مختلف رسائل و جرائد میں شائع کرنے کا اہتمام کریں گے۔

☆..... آپ اپنی تحریریوں کو کتابی شکل میں شائع کرانے کے خواہشمند ہیں؟

☆..... ہم آپ کی تحریریوں کو دیدہ زیب و لکش انداز میں کتابی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

☆..... آپ اپنی کتابوں کی مناسب تشریف کے خواہشمند ہیں؟

☆..... ہم آپ کی کتابوں کی تشریف مختلف جرائد و رسائل میں تبرروں اور تذکروں میں شائع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

اگر آپ اپنی تحریریوں کے لیے مختلف اخبارات و رسائل تک رسائی چاہتے ہیں؟

تو..... ہم آپ کی صلاحیتوں کو مزید نکھانے کے موقع دینا چاہتے ہیں۔

مزید معلومات کے لیے رابطہ کریں۔

ڈاکٹر صابر علی ہاشمی

قلمکار کلب پاکستان

0333 222 1689

[qalamkar\\_club@yahoo.com](mailto:qalamkar_club@yahoo.com)

## باب 19

## کتاب گھر کی پیشکش

میں اپنی جگہ گم سا کھڑا تھا اور کچھ ہی دیر میں میرے آس پاس بازار کے دو کانداروں کا جہنمگا اکٹھا ہو چکا تھا۔ ان میں سے ہر کوئی بس اتنا ہی چاہتا تھا کہ میں دو گھنٹی اس کی دوکان پر پھر جاؤں۔ ان سب کے پاس سارنگا کی سرکار میں پیش کرنے کے قابل کوئی نہ کوئی عرض یاد رکھا تھا۔ جب تک آیاں احمد صرف ایک شریف انسف ہیڈ ماسٹر کا بیٹا تھا وہ ان کی نظروں سے اوچھل اور نہایت غیر اہم تھا اور آج جب اسی غریب گھرانے کے آیاں کا نام سارنگا کے اڈے کے ساتھ جڑ گیا تھا تو ان سب کے لیے وہ دنیا میں سب سے اہم ہستی بن چکا تھا۔ اسی بازار میں جب میں نے شوکی کو مارا پیٹا تھا تو کوئی میری مدد کو آگئے نہیں آیا تھا اور پھر جب اسی بازار میں مجھے ہاتھ جوڑ کر شوکی سے معافی مانگنی پڑی تھی تب بھی یہ سب خاموش تھے، لیکن آج مجھ سے بات کرنا ان کے لیے قابل فخر ہو چکا تھا۔ شاید ہمارے اندر کی اسی مناقبت نے اس معاشرے کو اس قدر مکروہ اور قابل نفرت جگہ بنا دیا ہے۔

اس علاقے کے دو کانداروں کے لیے میرا یہ احسان ہی کافی تھا کہ اب ان سے کوئی زبردستی ہفتہ وصول نہیں کرتا تھا۔ وہ سارنگا کے ان برائے نام کا رندوں کے خوف سے آزاد ہو چکے تھے لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ انہیں اس خوف سے آزاد کرواتے کرواتے خود میں اپناب کچھ گروئی رکھ چکا تھا۔ میرے ذہن میں موی کی ایک نصیحت گوئی ”یاد رکھ شہزادے..... اس دنیا میں بس زور کو سلام ہے..... تو زور آور ہو گا تو لوگ تیرے آگے پلکیں بچھانے کو بھی تیار ہو جائیں گے..... اور اگر کم زور پڑ گیا تو یہ تجھے روندھتے ہوئے آگے بڑھ جائیں گے.....“ اور آج میں اپنے سامنے اسی ”зор کو سلام“ کا ایک مظاہرہ دیکھ رہا تھا۔ ابا کے خدشات اتنی جلدی حقیقت کا روپ دھار لیں گے۔ یہ میں نے نہیں سوچا تھا۔ انہیں یہی ڈر تھا کہ لوگ مجھے اڈے کی وجہ سے جانیں گے اور سلام کریں گے اور آج مجھے پورا بازار سلام کر رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے ان سب سے پیچھا چھڑایا کہ جس کو بھی کسی مدد کی ضرورت ہو وہ یعقوب مینشن آجائے۔ اگر وہ حق پر ہوا تو اس کی دادری ضرور کی جائے گی، لیکن اس کے لیے انہیں سارنگا سے خود بات کرنی ہو گی۔“

مینشن واپس پہنچ کر بھی میں بہت دیر تک ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار رہا۔ ہم لوگ اپنے گھروں کی بند چار دیواریوں میں جن لوگوں کی طاقت کا روناروتے ہیں اور غلط اختیارات پر انہیں برا بھلا کہتے اور محتوب کرتے ہیں، باہر کی کھلی فضائیں ان کے سامنے ہی سر کیوں جھکا دیتے ہیں۔ کیا دنیا کی سب سے بڑی طاقت واقعی ”خوف“ کی طاقت ہوتی ہے.....؟ موی نے اسی روز سے میری تربیت کو دن کے تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا ب صح فجر کے بعد دو گھنٹے کی تربیت کے علاوہ مجھے دن گیارہ سے ایک اور پھر شام چار سے سات بجے تک تربیت دی جاتی تھی۔ ناہید کے پرچے شروع ہو چکے تھے لہذا اب اسے ٹیوشن کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اب میری تربیت باقی اسٹادوں سے کچھ ڈھکی چپی بات نہیں رہ گئی تھی مگر پھر بھی وہ اس رہائشی صحن کی طرف آنے سے گریز ہی کرتے تھے جہاں موی

مجھے یہ سب سکھا رہا تھا۔

آخر دن بھی آگیا جب مجھے سارنگا کے سامنے امتحان کے لیے پیش کر دیا گیا۔ وہ شام کی معمول کی مشق کا وقت تھا جس کی نگرانی سارنگا خود کیا کرتا تھا۔ موئی نے جب مجھے احاطے میں چلنے کا کہا تو میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ تربیت اور مشق اگر سب کے درمیان ہو تو انسان کو اپنے قد کا شکھ کا اندازہ بھی ہوتا رہتا ہے، کیونکہ وہ دوسروں کا پیمانہ بھی دیکھ چکا ہوتا ہے مگر میر امسکہ یہ تھا کہ میر اندازہ صرف موئی کی حد تک محدود تھا۔ میں خود کو صرف اس کی نظر میں ہی تول سکتا تھا کیونکہ اس کے علاوہ میر آج تک کسی سے سامنا ہی نہیں ہوا تھا۔ لہذا دوسروں کے بارے میں میرے اندازے کا پیمانہ بالکل خالی تھا۔ اب یہ خدا ہی بہتر جانتا تھا کہ میں اڈے کے معیار پر پورا بھی اترتا تھا یا پھر وہی سدا کا بے معیار تھا۔

سارنگا نے مسکرا کر مجھے دیکھا "اچھا تو موئی کا پٹھا آگیا ہے میدان میں..... بھی واہ..... دیکھیں مجھے کتنا کندن بنایا ہے تیرے استاد نے....."

سارنگا نے میری پہلی آزمائش پنجہ بازی ہی رکھی۔ شاید وہ سب سے پہلے میری کلامی کا دم خم دیکھنا چاہتا تھا۔ اس پر کھکے لیے اس نے پھر اسی سینڈو کو میدان میں آنے کا حکم دیا جو مجھے پہلے بھی اس مقابلے میں شکست دے چکا تھا۔ سینڈو مسکراتے ہوئے میرے مقابل آ کر بیٹھ گیا اور اس نے اپنی کہنی تختہ پر رکھ دی۔ میں نے اپنی کلامی کا توازن صحیح کیا اور اپنا پنجہ سینڈو کے پنجے سے بھڑا دیا۔ کچھ لمحے تک ہم دونوں کے جڑے ہاتھ اسی مقام پر ساکت رہے اور پھر میں نے سینڈو کی نظر میں پریشانی کی جھلک دیکھی وہ اپنی کلامی کا زور میرے پنجے پر منتقل کرنے کی کوشش میں پیشہ پیشہ ہو رہا تھا۔ آج بھی ہمارے گرد اسی دن جتنی ہی بھیڑ تھی لیکن آج وہ سب دم سادھے یوں خاموش کھڑے یہ مقابلہ دیکھ رہے تھے جیسے ان میں سے کسی کی بھی سرگوشی یہ سارا طسم توڑ دے گی۔ میں نے چند لمحے سینڈو کی جانب سے کسی تحریک کا انتظار کیا۔ یہ اس کی اڈے پر بنی ہوئی ساکھ کو برقرار رکھنے کے لیے بھی ضروری تھا۔ پھر میں نے موئی کی جانب اجازت طلب نظرؤں سے دیکھا۔ اس نے اثبات میں سرہلایا تو میں نے دوسرے ہی لمحے سینڈو کی کلامی ایک جھلکے میں گرا دی۔ کچھ دیر تو ہجوم کے اندر نکھیوں جیسی بھینٹا ہٹ ہوتی رہتی اور پھر ایک جنخن پکار مجھ گئی۔ سب لپک کر موئی کو مبارکباد دے رہے تھے اور میرے کاندھے اور بازو سہلارہ ہے تھے۔ سارنگا نے سینڈو کو ڈانٹا "دھت تیرے کی..... حرام خور..... سانڈ کا سانڈ ہے پر اپنی تو آج کر کری کروادی نا....." میں نے مسکرا کر سینڈو کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اسے کھینچ کر کھڑا کر دیا۔ سینڈو میرے گلے لگ گیا۔ "ج انو بھائی آج بہت عرصے کے بعد ہارنے میں مزہ آیا ہے....."

سارنگا نے مجھے مسکراتے ہوئے خبردار کیا "ذرا شہر جا سو رہا..... بھی اصل امتحان باقی ہے۔" اڈے کی روایت کے مطابق دو بند چاقو ایک چاندی کی تھال میں سارنگا کے سامنے لائے گے۔ اس نے ان دونوں پر ہاتھ رکھ کر گویا مقابلے کی اجازت دے دی۔ ان میں سے ایک چاقو کو میں بخوبی پہچانتا تھا۔ یہ موئی کا وہی چاقو تھا جو اس نے تمام تربیت کے دوران استعمال کیا تھا۔ ماہروں کی بھیز میں سے ایک پکی عمر کا شخص سارنگا کے اشارے پر آگے بڑھا۔ میں نے اسے احاطے میں شاگردوں کو تربیت دیتے ہوئے کئی بار دیکھا تھا۔ اس کا نام اشرف تھا۔ رنگا نے اشرف کو آگے بڑھنے کی دعوت دی مگر اس نے ریت کے مطابق اپنے سب سے مضبوط اور مستند شاگردوں کو آگے بڑھا دیا۔ میں نے موئی کا چاقو اٹھایا اور میرے حریف

نے دوسرا چاقو اپنی ہتھیلی میں تولا۔ پھر ہم دونوں نے رواج کے مطابق اپنے اپنے چاقو سارنگا کے قدموں میں ڈال دیے۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ ہم سارنگا کو ہی اپنا سب سے بڑا استاد اور گرومنٹے ہیں۔ سارنگا نے پاس بلاؤ کر ہم دونوں کو اپنے انداز میں شabaشی اور دعاوی۔ ہم دونوں نے چاقو اٹھا لیے اور کھلے احاطے میں آگئے۔ کچھ دیر تک میرا حریف چاروں جانب گھوم کر مجھے نظروں میں تو تارہا۔ جبکہ میرے ذہن میں موی کا ایک ہی جملہ گردش کر رہا تھا کہ اگر سامنے والے کی طاقت اور چال کا اندازہ نہ ہو تو اپنے دونوں پیروں پر اپنا بوجھہ رقرار کھوا اور صرف اس کی نظر پڑھتے رہو۔ میں نے بھی یہی کیا اور کھڑے کھڑے اپنے حریف کی حرکت کے ساتھ گھومتا رہا۔ میرے مقابلے میں میرا دھیان بٹانے کے لیے اپنے چاقو کو تیزی سے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ اس کے اندر واقعی بھلی بھری ہوئی تھی لیکن میری نگاہیں اس کے ہوا میں ادھر سے ادھر منتقل ہوتے چاقو کے پھل سے زیادہ اس کی آنکھوں کی چلیوں پر بھلی ہوئی تھیں۔ فضائیں چاقو کی دھار کی چمک سورج کی ایک کرن سے لکڑا کر منعکس ہو رہی تھی اور میرے لیے حریف کی چال پر نظر رکھنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ تبھی میں نے دکھاوے کی خاطر ایک پل کے لیے اپنی آنکھیں موندھ لیں اور میرا حریف اسے میری بھول سمجھ کر میری جانب لپکا، لیکن یہ خود اس کی اپنی چوک ثابت ہوئی مجھے ایسے ہی کسی لمحے کے ہزاروںیں حصے کا انتظار تھا۔ میں نے ذرا سا پہلو بدلا اور دوسرے ہی لمحے حریف کی داہنی کلائی میرے باہمیں ہاتھ کے پنجے میں جکڑی جا چکی تھی۔ اس نے بوکھلا کر ہاتھ چھڑانے کے لیے زور سے کھینچا اور میں نے ایک دم اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ ذرا سال کھڑا یا اور اگلے ہی پل میرا چاقو اس کی شرگ کو چھوڑ رہا تھا۔ میں نے اس کے لڑکھڑانے کے دوران باہمیں ہاتھ سے اس کے شثانے کے اندر سے ہاتھ ڈال کر اسے جکڑا یا تھا اور میرے داہنے ہاتھ میں پکڑا چاقو اس کی گردن پر تھا۔ میں نے حریف کو آزاد کر دیا اور مقابلہ ختم ہو گیا۔ رنگا دونوں ہاتھوں سے تالیاں پیٹتے ہوئے جوش میں چلایا..... ”واہ ساجن..... موی کی جوانی یاد دلادی.....“ موی نے آگے بڑھ کر میرا تھا چوم لیا۔ میں نے اڈے کے سب سے مشاق چاقو بازو بہت کم وقت میں مات دے دی تھی۔

رنگا نے اشرف استاد کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اشرف استاد چاقو تھامے زمین پر لگے چونے کے دائرے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ ہم دونوں کے باہمیں ہاتھ کی کلائی کو رسی سے باندھ دیا گیا اور صرف داہنے ہاتھ کو آزارہ بننے دیا گیا۔ اب ہم میں سے جس کا قدم بھی دائرے سے باہر نکل جاتا تا وہ مقابلہ ہار جاتا۔ اشرف استاد اڈے کے پرانے استادوں میں سے ایک تھا، اور اس کی یہاں بڑی دھاک تھی۔ ہم دونوں کچھ دیر تک نظروں نظروں میں ایک دوسرے کو تولتے رہے اور پھر اشرف نے جھا کا دینے کے لیے اپنا چاقو ہوا میں اچھالا۔ ٹھیک اسی لمحے اس نے رسی کو ایک زور دار جھکا دیا اور اگر میری نظر ہوا میں اچھلے چاقو کی طرف ہوتی تو میں ضرور اوندھے منہ دائرے سے باہر جا گرتا مگر میں نے چاقو کی طرف دیکھنے کی غلطی نہیں کی۔ اشرف نے دوسرے ہی لمحے بازی گروں جیسی پھرتی کے ساتھ اپنا ہوا میں اچھالا چاقو پھر سے پکڑ لیا اور دھیرے سے مجھے داد دی ”شباش جوان..... یونہی ڈٹے رہنا.....“ میں نے داہمیں ہاتھ سے ہی چاقو اچھال کر تولا اور بنا کسی منصوبے کو ظاہر کیے رسی کو تیزی سے اپنی کلائی کے گرد دوبل دے کر اپنے اور اشرف کے درمیان فاصلہ کم کرتے ہوئے چاقو کی نوک سے اشرف کے بازو پر واکیا لیکن یہ دھیان رکھا کہ میرے چاقو کی نوک اس کے بازو کے گوشت کو چھونہ پائے اور صرف اس کے کرتے کوئی گزند پہنچے۔ میرا اندازہ ٹھیک رہا اور اشرف کے بازو پر کرتا کٹ کر ایک جانب کو جھول گیا۔ مجھے میں ایک تیزی تھیز آمیز سرگوشی ابھری۔ میرا مقصد پورا ہو گیا تھا، میں نے رسی ڈھیلی کرتے ہوئے خود ہی دائرے سے باہر قدم رکھ دیا۔

میں نے اشرف استاد کے آگے اپنی ہاڑ خود تسلیم کر لی تھی۔ سب ہی کو سانپ سونگھا گیا اور پھر سب سے پہلے اشرف استاد نے ہی اپنا چاقو پھینک کر مجھے گلے لگایا۔ فضا بیٹھیوں، تالیوں اور نعروں کے شور سے گونج آئی۔ میں نے خود کو ایک استاد کے سامنے مقابلے کے لیے پیش تو کر دیا تھا کہ یہ مویٰ کی عزت کا سوال تھا مگر مویٰ کے دیے ہوئے فن کی ایک جھلک دکھا کر میں نے خود کو مقابلے سے دست بردار کر کے اس استاد کی سالوں کی محنت کامان بھی رکھ لیا تھا۔

<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> مویٰ نے مجھے دونوں بازوؤں میں اوپر اٹھا لیا۔ ”تو نے آج مویٰ کو خرید لیا ہے شہزادے..... جیتا رہ.....“

سارنگا نے قریب آ کر اپنے دونوں ہاتھ میرے شانوں پر رکھ دیے۔ ”مارڈا الاجناء..... رنگا کو مارڈا ال آج تو نے..... ہر ریتی روانج پکی طرح سیکھ کر اترائے آج تو میدان میں.....“ رنگا نے آگے بڑھ کر مویٰ کو سینے سے لگایا اور اس کے ہاتھ کی پشت پر ایک بوسہ دیا ”تیرے ہاتھ میں آج بھی جادو ہے مویٰ“ مویٰ نے عقیدت سے رنگا کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں پر لگایا۔ ”سب آپ سے ہی سیکھا ہے مالک.....“

سارنگا نے اپنی سونے کی چین گلے سے اتاری اور میرے گلے میں ڈال دی۔ بجوم نے خوشی سے نظرے لگائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سارنگا نے مجھے اپنے اڑے کا مستند اور ماہر تسلیم کر لیا اور اسی خوشی میں اس رات سارنگا کی طرف علاقے کے تمام استادوں، اپنے احاطے کے تمام شاگردوں اور اردوگرد کے سارے اڑے کے لوگوں کو رات کے بڑے کھانے کی دعوت دی گئی، اور اسی رات مجھے پتہ چلا کہ آس پاس کے تمام بڑے لیدر اور سیاستدان بھی رنگا کی طرف سے دی گئی اس دعوت میں شریک تھے۔ طاقت کی اس شطرنج پر بچھے تمام مہرے آج اس محفل میں موجود تھے۔ آج مجھے سارنگا کی اصل طاقت کا راز بھی پتہ چل گیا تھا ”سیاست“ سیاست و ان رنگا کی طاقت کا سہارا لے کر اوپر آتے تھے اور لوگوں پر راج کرتے تھے، لیکن ان کا یہ راج رنگا کی طاقت کا مرہون منت تھا۔

اس رات رنگا نے میرا تعارف ایسے لوگوں سے بھی کروایا جن سے ہیڈ ماسٹر تو قیر احمد کے بیٹے آیاں کی حیثیت سے ملنے کے لیے شاید ایک جنم بھر کا انتظار بھی کافی نہ ہوتا، لیکن آج وہ لوگ خود آگے بڑھ بڑھ کر مجھے مل رہے تھے۔ فلم، لی وی، سیاست، تجارت، ثقافت..... غرض کون سا شعبہ تھا جس کے لوگ اس دعوت میں شریک نہیں تھے۔ دن کی روشنی میں یہ لوگ اڑے اور اس سے وابستہ لوگوں کو برا بھلا کہتے تھے اور حکومت سے مطالبے کرتے تھے کہ شہر کے امن و امان کو قائم رکھنے کے لیے ایسے زیر زمین اڑوں کا خاتمه کیا جائے، لیکن رات کے اندھیرے میں یہ لوگ اس زیر زمین سرکار سے اپنی وابستگی ظاہر کرنے کے لیے چہروں پر مسکراہٹ سجائے۔ اس محفل میں چلے آرہے تھے۔ میں نے دعوت میں بعض پولیس افسران کو بھی دیکھا جو سادہ لباس میں خوش گپیاں کر رہے تھے۔ اس رات نہ جانے کیوں مجھے رنگا اور اس کے ساتھیوں کا قدان سب بنوں کے مقابلے میں بہت اونچا گا۔ کم سے کم وہ ان سب کی طرح منافق تو نہیں تھے۔ وہ جو تھے، سب کے سامنے تھے۔ بڑے تھے یا بھلے تھے مگرچھے تھے۔ چھپ کر وار نہیں کرتے تھے۔ کھلے دل کے تھے۔ خوشی کو خوشی اور غم کو غم کی طرح مناتے تھے۔

میں بھی باقی بھیڑ کو چھوڑ کر صرف مویٰ کے آس پاس ہی موجود رہا اچانک مجھے ایک گوشے میں شوکی اپنے دوستوں کے ساتھ دبکا سا کھڑا نظر آیا۔ میں ایک دم ہی اس کے سامنے جا کھڑا ہوا تو کچھ پل کے لیے مجھے دیکھ کر وہ بالکل ہی ہکا بکا سارہ گیا۔ یقیناً اسے بھی دیگر اڑے والوں کی

طرح دعوت پر بلوایا گیا ہو گا مگر شاید وہ میری وجہ سے سب کے سامنے آنے سے کترار ہاتھا۔ میری زندگی کا رخ بد لئے میں اس لڑکے کا بہت بڑا تھا۔ میں گھر سے بے گھر ہوا اور آج آیاں احمد سے انو بھائی بن چکا تھا۔ سارنگا کے خاص آدمی کی حیثیت سے شوکی جیسے سینکڑوں کا رکن آج کے بعد میرے ایک اشارے کے نظر ہوں گے لیکن شاید یہی میری تقدیر تھی۔ شوکی تو اس بے رحم تقدیر کا ایک کم زور سامنہ تھا۔ مجھے شوکی کے سامنے کھڑے اور سینہ تانے دیکھ کر آس پاؤے کے لوگوں میں بے چینی سی پھیل گئی۔ شاید وہ اتنی بڑی محفل میں میری جانب سے کسی بد مزگی کے خیال سے سرا سیدھہ ہو گئے تھے۔

مویٰ جو مجھ سے کچھ فاصلے پر تھا اس نے بھی پہلو بدل۔ کچھ دیر تک میں شوکی کی آنکھوں میں دیکھتا ہا اور وہ سر جھکائے آنکھیں چراتا رہا۔ پھر میں نے اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ شوکی کو کچھ دیر تک تو میرا دوستی کے لیے بڑھایا ہوا ہاتھ دیکھ کر یقین نہیں آیا۔ پھر اس کی آنکھیں بھرا آئیں اور اس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ سب کے چہروں پر مسکرا ہٹ پھیل گئی۔ میں نے شوکی سے پوچھا ”اب تو رنگا بھائی کے نام پر بھتھ اکٹھا نہیں کرتے“، اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا ”نمیں انو بھائی..... میرے بزرگوں کی بھی تو پہ.....“ میں، شوکی اور اس کے دوست سمجھیں پڑے۔

رات گزری تو صبح میں نے رنگا سے زمرد حولی جانے کی اجازت مانگ لی۔ ”میں نے آپ کی شرط پوری کر دی۔ اب مجھے بھی آپ کے لیے کچھ کرنے کی اجازت دے دیں۔ میرے لیے تو آپ لوگوں نے بہت کچھ کر لیا۔ میں نواب کے دشمن کو کڈ کر آپ کے محض ابراہیم کا کچھ قرض اتنا چاہتا ہوں۔“ سارنگا نے غور سے میری جانب دیکھا۔ مویٰ بھی اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ ”کبھی کبھی تو تو اپنا ہی کوئی جنم جایا گلتا ہے۔ جا چلا جاز مرد حولی..... تیرا رب را کھا.....“

## کتاب گھر کی پیشکش

### ایمان کا سفر

محی الدین نواب کی نشر سے تیز معاشرتی کہانیوں کا مجموعہ۔ **ایمان کا سفر** ..... خوبصورت نقابوں کے چیچپے گھاؤ نے چہروں کو بے نقاب کرتی۔ ہمارے اپنے معاشرے میں بکھرے ہوئے اچھے برے کرداروں کی کہانیاں۔ کہانیوں کا یہ مجموعہ کتاب گھر کے معاشرتی کہانیاں/ افسانے سیکشن میں دستیاب ہے۔

## باب 20

## کتاب گھر کی پیشکش

میں اس وقت اپنے شہر سے پینتیس 35 کلومیٹر دور مسافت میں ویران ریلوے اسٹیشن پر کھڑا تھا جہاں سے مجھے کمال پاشا لینے آیا تھا۔ زمرد حویلی ہمارے شہر کی حدود سے باہر لیکن ایک ہی ضلع کی حدود میں آتی تھی۔ میرا حلیہ اس وقت کسی یونیورسٹی سے تازہ تازہ ماسٹر کر کے نکلے اتنا لیق جیسا ہی تھا۔ سادہ سا کرتا شلوار، کرتے کے اوپر کالی واںگٹ کے جیب میں لگے چند پین..... ہاتھ میں فلنے کی ایک مشہور کتاب اور سوت کیس میں تاریخ اور سو شیا لوچی کی بہت سی کتابیں..... میں پاشا صاحب کے دیے گئے اشتہار کی تمام شرائط پوری کرنے کے بعد اور زمرد حویلی کے بوڑھے نیجر کے ذریعے لیے گئے انٹرویو میں پاس ہونے کے بعد باقاعدہ نوکری کے لیے یہاں پہنچا تھا۔

اوائل دسمبر کی خلک ہوادھیرے دھیرے میرے وجود کے رویوں کو کامنے لگی تھی۔ گاڑی کو مجھے اسٹیشن پر اتارتے اور پلیٹ فارم پر چھوڑے آؤ ہے گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا، لیکن نواب صاحب کے ہاں سے ابھی تک کوئی مجھے لینے کے لیے اسٹیشن نہیں پہنچا تھا۔ اسٹیشن کے آس پاس دور دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے اور مغرب کی جانب والی اوپنی پہاڑی کی چوٹی پر سورج کی سنہری کرنوں کا تاج ساپنا ہوا تھا۔ سورج ڈوبتے وقت کتنا مہربان ہو جاتا ہے۔ شاید ہر غروب ہوتی ہوئی شے اپنے کیے کی تلافی کرنا چاہتی ہے۔ اس رویے کی تلافی جو اس نے طلوع ہونے کے بعد اپنے عروج کے دور میں روا رکھا ہے۔ کافی دیر کھڑے رہنے کے بعد جب میری گرم سانس باقاعدہ بھاپ بن کر ڈھلتی شام کے دھوئیں میں مغم ہونے لگی تو میں نے پلیٹ فارم پر نصب ولیٹن ریلوے (WR) کی مہرواںے اور عام سائز سے دو گئے میاں لے پلیے رنگ کے بیچ پر اپنا سوت کیس رکھ کر اسی سے نیک لگالیا۔

اور پھر کچھ دیر بعد میں نے دور اسٹیشن کی طرف پکڑنڈی پر سنہری دھول اڑتے ہوئے دیکھی۔ پرانے ماڈل کی ایک روز رائس کا رجواب ہمارے ملک میں چند گئے چنے نوابوں کے پاس ہی رہ گئی تھی۔ اپنے باور دی ڈرائیور کے ساتھ دوڑتی چلی آرہی تھی۔ پیچھے کمال پاشا صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ گاڑی تیزی سے موڑ کاٹ کر اسٹیشن کے بیرونی دروازے کے قریب رک گئی۔ میں نے اپنا سامان اٹھالیا۔ پاشا صاحب نے آتے ہی معدرت کی۔ معاف کرنا میاں..... یہاں ریلوے کر انگ پر پھاٹک نہیں ہے اور ٹرین بھی عین اسی وقت وہیں کھیتوں میں سے گزرتی کر انگ پر آ کر انگ گئی تھی۔ لہذا دیر ہو گئی..... ویسے اسٹیشن سے نظارہ بہت خوب دیکھنے کو ملتا ہے۔ میں اور نواب صاحب توجہ بھی کچھ فارغ ہوں..... چائے بنو کر یہیں چلے آتے ہیں۔ بڑا سکون ملتا ہے یہاں.....

میں نے اپنا سامان اٹھایا اور ان کے ساتھ چل پڑا۔ انہوں نے ڈرائیور کو مدد کرنے کا اشارہ کیا مگر میں نے اسے روک دیا۔ یہ اسٹیشن شہر کے باہر مسافت میں ہونے کے باوجود شہر سے اس قدر قریب تھا کہ یہاں شاذ و نادر ہی کوئی ٹرین سے آتا ہوگا۔ کیونکہ سڑک کا راستہ آدھا تھا اور وقت کی بچت کے ساتھ سہولت بھی موجود تھی مگر میں منصوبے کے مطابق جان بوجھ کر ٹرین سے یہاں اترنا تھا کیونکہ ہمیں حویلی والوں پر ظاہر کرنا مقصود تھا کہ میں کسی دور پار کے شہر سے یہاں آیا ہوں اور ہمارا پہلا گواہ یہی ڈرائیور تھا جو پاشا کے ساتھ مجھے لینے کے لیے اسٹیشن آیا تھا۔ پاشا صاحب نے

راتے میں اسے نانے کے لیے میرے اس فرضی شہر اور وہاں کے موسم کے بارے میں چند سوالات بھی کیے۔ کچھ ہی دیر میں ہم اشیش کی گلڈنڈی سے ہوتے ہوئے کپی سرڈک پر آگئے اور یہ سرڈک ہمیں سیدھی زمرد حوصلی کے دروازے تک لے گئی۔ واقعی سارنگا نے ٹھیک کہا تھا۔ حوصلی کیا تھی پورا جل تھا۔ جس کے بزرگ مرمر کے دالانوں اور ستونوں میں کچھ ایسی پچی کاری کی گئی تھی کہ دور سے وہ پورا محل ہی زمرد کا بنانا ہوا لگتا تھا۔ مرکزی دروازے سے ایک سفید سنگ مرمر کی سرڈک سیدھی کا پورچہ تک جاتی تھی اور سفید سرڈک کے دونوں طرف سرو کے درختوں کی قطار موجود تھی۔ جس سے پرے دونوں اطراف گھاس کے بڑے بڑے میدان تھے جن میں جا بجا پھولوں کی کیا ریاں، پانی کے فوارے اور چھوٹی چھوٹی ندیاں اور بیٹھنے کے لیے مناسب فاصلوں پر بنی راہداریوں میں سنگ مرمر کے بڑے بڑے خوبصورت تخت نما صلیب رکھے ہوئے تھے۔ طرز تعمیر کی پہلی جھلک ہی مغلوں کے ہاتھ کی گواہی دے رہی تھی۔ مغل ہمارے خطے میں کیسے کیسے شاہ کار بنا گئے۔ کاش تاج محل بھی ہماری طرف ہوتا، میں ایسی کئی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ کار حوصلی کے پورچہ میں جا کر رک گئی۔ ستونوں کی لمبای اتنی اوپنجی تھی کہ پورچہ میں ہی تین منزلیں ڈالی جاسکتی تھیں۔ کہتے ہیں ہیں ستون اور چھت کی اوپنجائی قوم کے ظرف کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ گویا یہ حوصلی بھی کسی اعلیٰ ظرف کے تخلیل کا کار نام تھی۔

ہم پورچہ سے مرکزی ہال میں داخل ہوئے تو ایک بار پھر سے کسی مغل شہزادے کے محل کا تصور تازہ ہو گیا۔ آج تک میں نے ایسے وسیع دربار نما ہال اور اوپنجی بالکل دنیاں صرف تاریخی فلموں میں ہی دیکھی تھیں۔ جھرو کے، ریشمی لہبہاتے پردے، مردان خانے، زنان خانے، دیوان خاص و عام، راہداریاں، روشنیاں اور غلام گردشیں..... سمجھی کچھ تو موجود تھا اس محل میں۔ کچھ ہی دیر میں نواب صاحب بھی پہنچ گئے اور بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ملے۔ یہ مردان خانے کا حصہ تھا جس میں ہم ابھی موجود تھے۔ بیگمات کے لیے زنان خانہ مخصوص تھا۔ مجھے یہاں لگ رہا تھا کہ شہر کی تیز اور بھاگ دوڑ والی زندگی کو ایک دم ہی جیسے بریک سی لگ گئی ہو۔ جیسے کسی ماڈرن سائنس فلشن فلم کے دوران اچانک ہی چالیس یا پچاس کی دھائی کی کوئی ریل جزر گئی ہو۔ یہاں وقت بھی کتنی آہستگی سے گزرتا تھا۔ میں نے اوپر لگے گھریال پر نظر ڈالی۔ ابھی مجھے یہاں پہنچے صرف ایک گھنٹہ ہی ہوا تھا لیکن مجھے یہاں لگ رہا تھا کہ پورا مہینہ بیت گیا ہے۔

کچھ ہی دیر میں نوکروں نے کھانا لگنے کی اطلاع دی اور ہم سب مرکزی ہال میں متصل کھانے کے کمرے میں آگئے جو بذات خود ایک درمیانے ناپ کا ہال ہی تھا۔ کھانے کی میز کافی طویل اور خوان بے شمار تھے۔ کھانے پر نواب کی پہلی بیوی سے ان کے دونوں بیٹے بھی موجود تھے۔ بڑے کا نام وقار اور چھوٹے کا نام سجاد تھا۔ دونوں کے نام کے ساتھ الملک کا لاحقہ بھی جڑا ہوا تھا۔ وقار الملک اور سجاد الملک، لیکن شاید دونوں ہی اس قدیم خاندانی مہر سے بے زار تھے لہذا تعارف کرواتے وقت انہوں نے صرف وقار اور سجاد ہی کہا۔ لاحقہ لگانے کا فریضہ خود نواب دیر الملک ادا کرتے رہے۔ دونوں بھائی ایک دوسرے سے کچھ اکھڑے اکھڑے اور بے زار نظر آئے۔ بڑے والے نے تو در پردہ باپ کو یہ پیغام بھی پہنچا دیا کہ وہ نہیں سمجھتے کہ ان کی سوتیلی بہن کے لیے ایسے کسی استاد یا ااتالیق کی ضرورت بھی تھی۔ اس نے کون سا ہمیشہ یہاں رہنا ہے..... جہاں بیاہ کر جائے گی وہاں خود ہی سب باتوں سے آشنا ہو جائے گی، لیکن نواب صاحب نے سنی ان سنی کرتے ہوئے اعلان کر دیا کہ اب میری رہائش یہیں مردان خانے کے مہمان کے طور پر ہو گی اور انہوں نے حوصلی کے پرانے خادم اور غیر حیم کو مہمان خانہ کھولنے اور میری تمام ضرورتوں کا خیال رکھنے کی ہدایت کر دی۔ حوصلی کا خانہ مال اعظم (Chef) شیرعرف شمن بھی ایک ایسا کردار تھا جس کا آگے چل کر مجھ سے کچھ زیادہ واسطہ پڑنے والا تھا، کیونکہ میرے

کھانے پینے کی ذمہ داری اس کے سر پر ڈالی گئی۔ زمرد جو یلی کے اصول کے مطابق رات کے کھانے پر سب کو مردان خانے کی کھانے کی میز پر اکٹھا ہونا پڑتا تھا۔ صبح کا ناشتا اور دوپہر کا کھانا البتہ نواب صاحب زنان خانے میں اپنی ایرانی بیگم اور بیٹی فضہ کے ساتھ کرتے تھے۔ یہ ساری تفصیلات مجھے وقٹے و قٹے سے پاشا صاحب کی زبانی مل رہی تھیں۔ وہ خود بھی نواب صاحب کے خاص مہمان کی حیثیت سے مردان خانے میں ہی مقیم تھے، مگر ان کا کرہ بالائی منزل پر تھا۔ کھانے کے دوران ہی مجھے نواب صاحب کے محافظ خاص نواز علی سے ملنے کا اتفاق بھی ہوا۔۔۔۔۔ وہ ہمہ وقت مجھے نواب صاحب کے آس پاس ہی بھکلتا رکھا تھا۔ حتیٰ کہ کھانے کے دوران بھی میں نے اسے باہر کی راہداری میں ٹھیٹے اور آس پاس کھانا لاتے لے جاتے تو کروں پر کڑی نظر رکھتے ہوئے دیکھا۔ میرے دل میں ایک اور کھٹکا بھی تھا کہ کہیں نواب کے دونوں بیٹوں میں سے کوئی مجھ سے تاریخ یا تہذیب و ثقافت کے مضمون کی کسی ڈگری کے بارے میں نہ پوچھ لے یا اس بارے میں میری قابلیت جانے کے لیے کوئی سوال نہ کر بیٹھے۔

ان دونوں کو اپنے باپ سے اپنے اپنے روزانہ کے خرچ اور ضرورتوں پر بحث کرنے سے ہی فرصت نہیں ملی لہذا میرے مضمون کی طرف ان کا دھیان کم ہی گیا۔ میں گزشتہ ایک مہینے سے یعقوب میشن میں چار گھنٹے روزانہ ان مضامین کی دو مستند استاووں سے ٹیوشن لیتا رہتا تھا کیونکہ مجھے انہی مضامین کے بھیں میں زمرد جو یلی میں اتنا تھا مگر پھر بھی میری معلومات ابھی ابتدائی درجے سے ذرا ہی اوپر کی تھیں۔ صبح تو یہ ہے کہ گزشتہ ایک ماہ میں میں نے اتنا کچھ پڑھا اور رٹالا گا کر یاد کیا تھا جتنا اب تک میں نے اپنے پورے تعلیمی کیریئر میں نہیں پڑھا تھا۔ عجیب خلک مضامین تھے یہ تاریخ وغیرہ بھی، لیکن مجھے ہر صورت یہاں آنے سے پہلے ان چند موٹی موٹی کتابوں کو گھول کر پی جانا تھا کیونکہ یہاں میرا واسطہ انہی مضامین کی شائق ایک شاگرد سے پڑنے والا تھا۔ اس تمام تجربے کے دوران مجھے ایک اور سبق بھی ملا کہ صرف کتابیں پڑھ لینے سے اور کم از کم وقت میں انہیں از بر کر لینے سے ان ان کسی علم کو پا نہیں سکتا۔ وہ اس عمل سے صرف اپنی یادداشت بڑھا سکتا ہے اور مختلف حوالے سے اپنے ذہن میں ترتیب وار پھا سکتا ہے۔

اصل علم کتاب سے بھی پرے کی کوئی چیز ہے۔

کھانے کے بعد بزرگ ہوئے کا ایک دور چلا اور محفل برخاست ہو گئی۔ ہمیں مجھے میرے کمرے تک پہنچانے کے لیے آیا۔ اس کا بے حد باتوں ہونا میرے لیے فائدہ مند بھی تھا۔ بہت سی باتیں اس نے مجھے ہنا پوچھے ہی باتا دیں کہ نواب صاحب کی پہلی مرحومہ بیوی اپنی آخری سانس تک نواب صاحب کی ایران میں دوسری شادی کو قبول نہیں کر پائی تھیں۔ جاتے جاتے یہ زہرہ اپنے دونوں بیٹوں کو بھی منتقل کر گئیں مگر شومنی قسمت کہ دونوں بھائیوں میں خود ہمیشہ ٹھنپی ہی رہی۔ بڑا بیٹا وقار قارص و سرور کی محفلوں کا دلدادہ تھا اور اس کی شامیں رنگیں ہی رہتی تھیں۔ چھوٹے والے سجاد کے شوق البتہ کچھ مردانہ تھے اور وہ ہفتوں آس پاس کے جنگلوں میں اپنے خاص نوکروں سمیت شکار کی تلاش میں بھکلتا رہتا تھا۔ اور اس کی شکاری بندوق ہمیشہ بھری ہوئی اور جیپ ہمیشہ تیار رہتی تھی۔ ہمیں نے رازدارانہ انداز میں مجھے یہ بھی بتایا کہ بڑے بیٹے وقار کو اس راہ پر ڈالنے والے اس کے اوپا ش دوست تھے جن کا سربراہ رنگیں نام کا ایک بگڑا ہوا مگر فلاش نواب زادہ تھا جو اپنے باپ کی تمام جائیداد تو طوائفوں اور کوٹھوں پر لٹا ہی چکا تھا مگر اب اس کی نظر وقار کی جا گیر اور حصے پر تھی۔ بڑے نواب صاحب یہ سب کچھ جانتے اور دیکھتے رہتے تھے مگر خون کے گھونٹ پینے کے سوا اور کچھ کرنہیں سکتے تھے کیونکہ ان کی مرحومہ بیوی جاتے جاتے دونوں بیٹوں کو ان کے خلاف اور گستاخ کر گئی تھیں۔ ہمیں کچھ دیر مزید بھی میرے کمرے میں موجود رہنا چاہتا تھا مگر جو یلی کے نیجر رسم نے ڈپٹ کرائے میرے آرام کی خاطر کمرے سے باہر بھیج دیا اور مجھ سے معتذت کی کہ ہمیں کی قیمتی کی طرح چلتی

زبان کو روکنے کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں تھا۔

میں نے ان دونوں کے جانے کے بعد کمرے کا جائزہ لیا۔ قالین، صوفوں اور پردوں کے نگلوں کی یکسانیت اور کمرے کے بھاری فرنچر کی نفاست کا بیان طویل تھا۔ ایک طرف پڑھنے والا کونہ بھی مخصوص تھا اور دیوار میں لگئے شیلف میں میرے مطلب کی بہت سی کتابیں ترتیب سی رکھی ہوئی تھیں۔ شاید نواب صاحب کو بھی اس بات کا اندازہ تھا کہ میں ان مضامین سے نا بلد تھا اور میرے لیے ان کتابوں کو دہراتے رہنا بہت ضروری تھا۔ تا وقت تک میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر یہاں سے واپس چلا جاؤں۔ میں نے رات ڈھلنے کا انتظار کیا اور پھر نصف شب کے قریب اٹھ کر مردان خانے کا سرسری جائزہ لیا۔ اس طرح کہ مجھے اگر کوئی یوں آدمی رات کو ٹھلتا ہوا دیکھے بھی لے تو اسے چھل قدمی سے زیادہ اہمیت نہ دے۔ مجھے کوئی غیر معمولی بات دکھائی نہیں دی۔ سوائے اس کے کہ نواز اور اس کا عملہ باہر فصیل پر اور مرکزی دروازے پر نہایت چاک و چوبند حاضر تھا اور ان کی موجودگی میں کوئی پرندہ بھی اندر پر نہیں مار سکتا تھا۔ نواز نے مجھے بھی اپنے کمرے سے باہر نکلتے دیکھا تو وہ تیزی سے میری طرف آیا۔ ”خیر تو ہے آیاں صاحب... کسی چیز کی ضرورت تو نہیں...“۔

”نہیں بس... نیند نہیں آ رہی... شاید نئی جگہ کا اثر ہے...“ نواز نے سر ہلا کیا ”ہو سکتا ہے...“ مجھے بھی نئی جگہ پر ذرا مشکل سے ہی نیند آتی ہے، نواز کا چہرہ حسب معمول سپاٹ تھا جب سے میں یہاں آیا تھا میں نے اسے ایک بار بھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

میں نے باہر گھاس کے میدان میں کچھ دری چھل قدمی کی، اور کن اکھیوں سے آس پاس کا جائزہ لیتا رہا۔ زنان خانہ مردان خانے کے چیچھے ایک علیحدہ محل نما عمارت میں تھا اور مردان خانے سے کچھ راہدار یوں کے ذریعے نسلک تھا۔ البتہ مردانہ اور زنانہ دونوں حصوں میں داخلے کے لیے الگ الگ راستے مخصوص تھے۔ میں نے چھل قدمی کے دورانِ حوالی کا محل وقوع خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ میرے ذہن میں سارنگا کی کہی ہوئی باتوں کی بازگشت ابھی تک موجود تھی جو اس نے یہاں بھیجنے سے پہلے وقاً وقعاً مجھے بطور نصیحت اور سبق سکھائی تھیں۔ انہی میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ ”اجنبی منڈروں پر چڑھنے سے پہلے ان کا نقشہ اچھی طرح ذہن میں بٹھایا ضروری ہوتا ہے...“

میں کچھ دری چھل قدمی کے بعد اپنے کمرے میں واپس آ کر لیٹ گیا۔ مجھے اگلی صبح ایک اور امتحان سے گزرنا تھا اور نواب کی صاحبزادی سے اس کے اتنا یقین کے روپ میں ملنا تھا۔ اس کے لیے میرے ذہن کو باقی کسی قسم کی بھی سوچ یا فکر سے آزاد ہونا چاہئے تھا۔ ذہن کی گھنیماں کہیں اور ابھی ہوں تو کبھی کبھی ان جانے میں ہم اپنا آپ ظاہر کر جاتے ہیں اور میرے لیے اپنا بہر روپ قائم رکھنا بہت ضروری تھا۔

لیکن وہ ایک چہرہ مجھے یک سورج ہے ہی کب دیتا تھا۔ جیسے ہی میں نے پلکیں موندیں وہ میرے ذہن کے پردے پر کھلتا چلا گیا۔ وہی آسمانی جوڑ اور وہی کالی شال..... آسمان پر گھٹائیں تو سب نے ویکھی ہیں لیکن گھٹاؤں پر آسمان شاید آج تک کسی نے نہ دیکھا ہو۔ میں زمردِ حوالی آنے سے پہلے آخری مرتبہ شیخ صاحب کو ملنے کے لیے دو دن پہلے ہی سادات محلے کی دہلیز تک گیا۔ ول کے اندر کے چور کا تو پتہ نہیں البتہ ذہن کا بہانہ یہی تھا کہ جانے سے پہلے انہیں خدا حافظ کہہ آؤں کہ جانے پھر کب ملاقات ہو، لیکن دروازے پر حمید کا چہرہ دیکھ کر میں مایوس ہو گیا۔ خلاف معمول آج اس کے چہرے کی کرخی کچھ کم تھی۔ شیخ صاحب گھر پر نہیں تھے۔ میں واپس پلنے لگا تو حمید نے آواز دی ”اگر آپ کے پاس کچھ وقت ہو تو ہم اندر بیٹھ کر کچھ بات کر لیں“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، لیکن اس کے چہرے پر سمجھیگی طاری تھی۔ کچھ دری بعد ہم اسی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں

میں کئی بار پہلے بھی آچکا تھا۔ حمید چائے کے برتن خود اندر سے اٹھالا یا اور جانے کیوں میرے کان ابھی تک ان manus آہٹوں اور قدموں کی چاپ کو محسوس کرنا چاہتے تھے جواب میرے لیے نامنجم ہو چکی تھی۔ حمید نے کچھ دیر سمجھی باتوں کے بعد اصل بات شروع کی۔ ”معاف کیجئے گا میں اس روز آپ کے ساتھ کافی تلخ بول گیا۔ دراصل دو جوان بہنوں کی ذمہ داری انسان کو تلخ بنا ہی دیتی ہے۔ اور پھر اس روز حالات ہی کچھ ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ میں غصے کی رو میں بہہ گیا۔ دراصل میں جب گھر پہنچا تھا تو میں نے محلے کے چند اواباش لڑکوں کو ہماری لگلی میں اوہر ادھر بے مقصد پھرتے اور ہمارے دروازے کی طرف جھاٹکتے دیکھا تھا۔ پہلی جھڑپ ان کے ساتھ ہوئی اور گھر پہنچا تو ستارہ گہنا بھی موجود نہیں تھیں اور پھر جب دروازے پر ان کو آپ کے ساتھ دیکھا تو جانے کیا کچھ کہہ گیا۔ بعد میں ستارہ نے جب مجھے ساری بات بتائی اور اب انے پہلے دن سے لے کر تک آپ کی طرف سے کی گئی مدد کے بارے میں بتایا تو مجھے اپنے رویے پر بڑی شرمندگی ہوئی۔“

میں نے اسے اس تکلف سے باز رکھنے کی کوشش کی اور ٹھیک اسی لمحے مجھے پر دے کے پیچھے وہ manus سی خوبصورتی محسوس ہوئی ”آپ خود کو نہ الجھائیں..... جو ہوا سو ہوا..... میرے دل میں کوئی ملاں نہیں ہے.....“

”یا آپ کا بڑا اپن ہے۔ میری آپ سے ایک اور درخواست ہے..... اگر آپ برانہ مانیں تو.....“

”بھی..... فرمائیے.....“ حمید نے زبان سے ادا ہونے سے پہلے اپنی بات کو تولا ”میں نے اس علاقے میں آتے جاتے آپ کا نام سنایا۔ لوگ آپ کی بہت قدر کرتے ہیں لیکن افسوس یہ شہرت ایک اڈے کے ساتھ جڑی ہے۔ میرے گھر میں دو جوان بہنیں ہیں۔ مجھے آپ کے کروار کی سچائی کے لیے کسی بھی گواہی کی ضرورت نہیں کہ ابا کو انسان کی خوب پر کھے۔ لیکن آپ کی اس اڈے سے واپسی ہماری دلیزیز پر آنے والوں کے ذہن میں ہزار سوال پیدا کرتی ہے۔ لوگ اگر ہمارے سامنے نہیں تو ہماری پیغام پیچھے ایک دوسرے سے سوال ضرور کرتے ہوں گے کہ آخر ایک اڈے سے وابستہ بندہ یہاں کیوں آتا ہے۔ امید ہے آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے.....“ میرے ذہن میں بیک وقت کئی تیز آندھیاں اور طوفانی جھکڑ چل رہے تھے۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا ایک بدمعاش کا بھلاکسی شریف کے درپر کیا کام اور کیسی غرض.....؟؟

میں کھڑا ہو گیا ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں..... کسی بھی اڈے سے وابستہ بدنای آپ کی دلیزیز نہیں آنی چاہئے۔ کاش یہ بات خود مجھے آپ سے پہلے سمجھ میں آجائی تو اچھا تھا۔ بہر حال آپ اس بارے میں ذرا بھی فکر مند نہ ہوں..... میں اب کبھی اس دروازے کی چوکھت پار نہیں کروں گا.....“ حمید نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن شاید اب کچھ کہنے کے لیے باقی نہیں رہا تھا۔ میں شیخ صاحب کے گھر سے نکل آیا۔ میرا دماغ اس وقت بالکل سن تھا، لیکن حمید نے ایسا نیا کیا کہا تھا۔ اس کی بہن بھی تو مجھے کسی لوفریا آوارہ سے کم نہیں سمجھتی تھی۔ حمید نے تو بس کچھ دوسرے لفظوں میں وہ بات صرف دہرانی تھی۔

میرے دل میں اس بات کو یاد کر کے وحشت کی ایک ایسی شدید لہر اٹھی کہ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ کمرے کا گھر یا میال صبح کے ساز ہے آٹھ بجاء رہا تھا مجھے یاد آیا کہ نواب صاحب نے ٹھیک نوبجے مجھے زنان خانے میں طلب کرنے کا وقت بتایا تھا۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا۔



## باب 21 کتاب گھر کی پیشکش

ٹھیک نو بجے زنان خانے کی جانب سے شہین پیغام لے کر ہڑ بڑا یا ہوا سامیرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح نتیعلق اور قافیہ درست تھا ”آپ کو نواب صاحب زنانے میں یاد کرتے ہیں۔“ میں نے اسے چھیڑنے کی نیت سے دوبارہ پوچھا ”نواب صاحب کیا کرتے ہیں.....؟“ وہ مسکرا دیا ”اجی یاد کرتے ہیں آپ کو صاحب.....“ میں بھی نہ دیا ”میرا نام آیا ہے..... مجھے صاحب نہ کہا کرو.....“ شہین کا چہرہ کھل گیا ”واقعی..... آپ کا کشاوہ ما تھا ہی آپ کے وسیع ظرف کی نشان دہی کرتا ہے..... تو آیاں میاں کہہ لیا کروں .....؟“ ہم دونوں مختلف راہدار یوں سے گزرتے ہوئے زنان خانے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ”جو تمہارا جی چاہے کہہ سکتے ہو.....“ میری نظریں تیزی سے آس پاس کا جائزہ لے رہی تھیں لیکن مجھے کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ شہین کی زبان پڑ پڑ چل رہی تھی۔ ”بس کیا بتائیں آیاں میاں..... جو یلی کی ساری ذمہ داری مجھی پر تو ڈال رکھی ہے نواب صاحب نے..... سب ہی میری سنتے ہیں بس ذرا بڑی بہو ہیں تاں..... نواب خاتون..... ان کا مزاج ذرا کڑوا ہے..... ان سے ذرا فوج کر رہیے گا.....“ وہ شاید نواب کے مرحوم بڑے بھائی کی بیوہ کی بات کر رہا تھا۔ پاشا صاحب کی دوی ہوئی اطلاع کے مطابق جو یلی کا کلی نظام در پرده نواب خاتون ہی دیکھتی تھیں اور انتہائی سخت مزاج خاتون مشہور تھیں۔ ان کے کیے گئے فیصلوں میں نواب دیہ بھی دخل نہیں دیتے تھے۔ آخری راہداری سے نکتے ہی ہم ایک کشاوہ پائیں باعث نملاں میں نکل آئے۔ سامنے ہی زنان خانے کی سفید اور بزرگ مرمر سے بنی پر شکوہ عمارت غرور سے سرتانے کھڑی تھی۔ نواب صاحب اور ایک نازک سی خاتون باہر دالاں میں بچھی چھتریوں کے سامنے تلے بیٹھے ہوئے تھے۔ نواب صاحب نے میرا استقبال کیا اور شہین کو ہاتھ کے اشارے سے جانے کا کہا ”آؤ آیاں میاں آؤ..... ان سے ملو..... یہ ہماری بیگم خانم جان ہیں“ میں نے اس ملیح سے چہرے والی عورت کو سلام کیا۔ انہوں نے مسکرا کر سر ہلا کیا۔ خانم جان نے اپنے سر پر مخصوص ایرانی سکارف کو جا بکی طرح باندھ رکھا تھا اور صبح کی خنک ہوا سے بچنے کے لیے انہوں نے نیلے رنگ کا ایک لمبا سا کوٹ پہن رکھا تھا۔ ان کی آواز بڑی شستہ تھی۔ ”تو تم ہو ہماری فضہ کے اتالیق، بھی ہم تو کسی کمر جھکائے اور نظر پر موٹا چشمہ لگائے بزرگ کا انتظار کر رہے تھے۔ تم تو ابھی خود طالب علم لگتے ہو.....“

”جی..... بس طالب علم ہی سمجھیں..... علم کا سلسلہ تو کہیں رکتا نہیں۔“ وہ مسکرا کیں ”درست..... درست..... ما شا اللہ.....“ نواب نے خانم سے پوچھا ”بھی آپ کی صاحب زادی نہیں آئیں ابھی تک.....“ ان کی بات تکمل ہونے سے پہلے ہی اندر سے فلپر کوٹ اور سر پر وہی مخصوص ایرانی حجاب نما سکارف باندھ ہے ایک نوجوان لڑکی نمودار ہوئی۔ میں احتراماً کھڑا ہو گیا۔ ”یہ لو بھی..... آگئیں فضہ.....“ فضہ خانم کی ہی کوئی نوجوانی کی تصوری معلوم ہو رہی تھی۔ خانم نے اسے ہلکے سے تنہیا پوچھا ”ایس کز دیر.....؟“ (اتنی دیر)۔ فضہ نے جلدی سے تلافی کی ”معدرت..... من بخشن (معافی چاہتی ہوں)۔“ نواب نے اس سے میرا تعارف کروایا ”بیٹی یہ آیاں احمد صاحب ہیں..... آپ کے اتالیق.....“ فضہ نے جلدی سے مجھے سلام کیا ”خوشی ہوئی آپ سے مل کر..... کب سے میں آغا جان سے درخواست کر رہی تھی کہ میرے لیے کسی ثیوڑ کا انتظام کر دیں..... لیکن اس

ویرانے میں آنے کے لیے کوئی تیار ہی نہیں ہوتا تھا..... آپ کا بہت بہت شکر یہ جناب ..... تشكر .....“

دونوں ماں بیٹی کی زبان سے ک اور ق کا فرق بہت بھلا محسوس ہوتا تھا۔ میں نے مسکرا کر اس عفت ماب کے تشكیر کا جواب دیا۔ فضہ کی پلکیں اپنی ماں کی طرح گھنی اور سیاہ تھیں۔ ایران کا حسن پہلی نظر میں خیر نہیں کرتا، مگر اس کے جو ہر دھیرے دھیرے کھلتے ہیں اور پھر وہ شہری عارض اور وہ سرمی آنکھیں اپنا سکدے ایسا جماعتی ہیں کہ بڑے بڑے شہنشاہ اس کوئے پار میں جھک کر حاضری دیتے ہیں.....

میری فضہ سے صبح کی یہ ملاقات مختصر ہی اور طے پایا کہ روزانہ شام 4 بجے ایک گھنٹہ کے لیے کہیں زنان خانے میں ڈرائیور یا لان وغیرہ میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ میں نے واپسی کے لیے رخصت طلب کی تو نواب صاحب کو کچھ یاد آیا "ارے آیاں

میاں..... مردان خانے کی بالائی منزل پر حومی بھی موجود ہے۔ وہاں دنیا بھر کی کماییں اسی لر رسمی ہیں مرحوم بڑے نواب صاحب نے..... تم چاہو تو وہاں سے بھی اپنے مطلب کے حوالے جمع کر سکتے ہو۔“ اتنے میں ایک بوڑھی نوکرانی نے آکر اطلاع دی کہ اگر نواب صاحب ملاقات سے فارغ ہو چکے ہوں تو نواب خاتون ان سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتی ہیں۔ نواب نے فوراً اثبات میں سر ہلایا ”ہاں ہاں کیوں

نہیں..... بلکہ وہ یہیں کیوں نہیں آ جاتیں ..... خانم اور فضہ بھی یہیں ہیں ” میں نے مزید وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا اور اجازت کے لیے نواب صاحب کی طرف دیکھا۔ نواب صاحب نے اسی خادم کو مجھے مردان خانے تک چھوڑ کر آنے کا حکم دے دیا۔ واپس پلتئے وقت میں نے روایتی غارے کے لباس میں اس کے کنکے کو اٹھ کر کھینچا۔

میں ایک پی مرنی بورت والے دیجھا، سے پھرے سے خوت اور بے راری اپک رہی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے گریب سے گرے تو اس نے سر سے پیر تک مجھے غور سے دیکھا اور تکھمانہ لجھے میں بولیں ”رکو.....“ میں ٹھہر گیا ”تو تم ہی ہو فضہ کے نئے استاد؟..... لیکن چھرے سے تو استاد نہیں لگتے.....“ میرا جی چاہا کہ انہیں جواب دوں کہ آپ بجا فرماتی ہیں ..... میں استاد ہوں ..... لیکن رنگا بھائی کے اڈے کا ”کچھ دریتک وہ میرا ناقد اسہ جائزہ“

لیتی رہیں اور پھر انہوں نے مجھے جانے کی اجازت دے دی ”اچھا ٹھیک ہے جاؤ..... لیکن زنان خانے کے آداب کا خیال رہے۔“ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ مجھے تو ابھی تک مردان خانے کے آداب کا بھی نہیں پڑتا لیکن میں بنا کچھ کہے سلام کر کے آگے گئے بڑھ گیا۔

شام تک میرے پاس کافی وقت تھا اور میں نے یہ وقت کمرے میں بندراہ کر صرف کرنے کے بعد جائے زمر دھویلی کے آس پاس مضافات کا جائزہ لینے میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ حویلی کے آس پاس گندم کے کھیت اور دور تک پھیلی خاموشی تھی۔ جانے کیوں مجھے اس لمحے بہت دن پہلے کا کہیں پڑھا جوں ایلیا کا شعر یاد آ گیا۔

قابلِ رحم ہیں وہ دیوانے

جن کو حاصل نہیں ہے ویرا۔

میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ نواز اس تمام عرصے میں مجھ پر خصوصی نظر رکھ رہا، لیکن مجھے اس کی مستحدی سے زیادہ اس کمزور کڑی کی تلاش تھی جہاں سے نواب صاحب پر اگلا حملہ ممکن ہو سکتا تھا۔ کمرے میں واپس آ کر میں نے حوالی میں اب تک میری جن لوگوں سے ملاقات ہوئی تھی ان سب کی ایک فہرست بنائی اور موسیٰ کی ہدایت کے مطابق ان سب کو شک کے دائرے میں ایک ایک کر کے رکھا اور پھر ایک نئی

فہرست بنائی جس میں نمبر شمار میرے زیادہ شک کی بنیاد سے ہو کر نیچے تک جاتے تھے۔ اس فہرست میں سب سے اوپر نواز تھا۔ پھر نواب صاحب کے دونوں بیٹے، ان کے ذاتی محافظ اور اسی طرح میں اپنی پہلی کیفیت کے حساب سے سب ہی کوشک کی نظر سے دیکھتا، سوچتا اور پھر رد کرتا گیا لیکن کسی بھی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

چار بجے کے قریب ایک بار پھر شمن مجھے لینے کے لیے آگیا۔ وہ منہ تھی منہ میں نہ جانے کیا بڑا بڑا رہا تھا۔ میں نے اس کے بگڑے مود کی وجہ پوچھی تو وہ پہت پڑا۔ ”بس کیا بتا سیں آیاں میاں..... ان دونوں بھائیوں کی آپسی چیقلش نے ہم نوکروں کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ ایک کی بات مانو تو دوسرا بگڑ جاتا ہے، ایک کوئی حکم دیتا ہے تو دوسرا اس کی ضد میں اس سے بھی بڑی فرمائش کر بیٹھتا ہے اور تمیل نہ ہونے پر ڈاٹ ہم غریبوں کو پڑتی ہے۔“

”لیکن یہ دونوں تو سگے بھائی ہیں ناں..... پھر ان میں آپس میں اتنی دشمنی کی وجہ کیا ہے؟“ شمن کی آواز دھمکی ہو گئی ”اب ہم کچھ بولیں گے تو راز افشا کا طعنہ سنیں گے۔ سناءے دونوں نواب خاتون کی کسی بھانجی پر فدا ہیں..... سلمی نام ہے بھی کا..... لیکن نواب خاتون دونوں کوہی ہاں کہتیں ہیں نہ ناں..... سچ کہوں تو مجھے اس دشمنی کا خاتمہ صرف نواب خاتون کے ہاتھوں لکھا نظر آتا ہے۔ کیونکہ دونوں ہی بھائی ان کی بہت سنتے ہیں.....“

شمن جاتے جاتے مجھے ایک نیاز اور یہ بھی دکھا گیا تھا۔ میں زنان خانے کے دالان تک پہنچا تو فضہ مجھے وہیں ہو گی میں بھتی ایک چھوٹی سی پانی کی مصنوعی نہر کے کنارے ڈالی ہوئی کری پر بیٹھی نظر آگئی۔

”میں آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔“ وہ حسب معمول سر پر اپنے پیر ہن سے میل کھاتا سکارف باندھے ہوئے تھی اور نہر کے پانی میں پڑتی ہوئی کرنوں کا عکس اس کے چہرے کو جھلماڑ رہا تھا۔ میں بھی اس کے قریب پڑی دوسری ٹاث کی کرسی پر بیٹھ گیا اور میں نے اندازہ لگانے کے لیے اس سے کہا کہ وہ اس علاقے کی تاریخ اور تہذیب کے بارے میں جو کچھ خود جانتی ہے، پہلے مجھے وہ بتائے۔ اس سوال کا مقصد خود اپنے آپ کو جانچنا بھی تھا کہ میں کتنے دن تک فضہ کو اپنے مدد و علم کی بنیاد پر چھا سکتا تھا، لیکن فضہ کی ان دونوں مضامیں میں پہنچ دیکھ کر مجھے اسی دن اندازہ ہو گیا کہ یہ بیل زیادہ عمر سے تک مندرجہ نہیں چڑھ پائے گی۔

”آپ کو تو یہاں کی تاریخ کی اچھی خاصی سوچ جو جھے ہے اور علاقے کی قدیم اور جدید تہذیب کے موضوع پر بھی آپ کی گرفت مضمبوط ہے.... تو پھر یہ خصوصی طور پر کسی استاد کو رکھنے کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔“

فضہ نہ پڑی ”سچ بتاؤں تو میں بھی کوئی بزرگ نمائتا لیق ہی تصور کیے بیٹھی تھی۔ سوچا تھا کہ ان سے خوب لمبی لمبی بحث کر کے اپنی قابلیت کا رعب بھی جھاؤں گی اور ان کے تجربے سے اپنے اندر کے سوالات کی پیاس بھی بجھاؤں گی۔ مجھے اردو بھی ایسے ہی ایک بزرگ استاد کی وساطت سے سکھنے کا شرف حاصل ہوا تھا مگر آپ کو دیکھ کر میں اور مومودونوں ہی بہت حیران ہیں۔ برانہ مانے گا لیکن آپ بھی میری طرح بھی تازہ گریجویٹ ہیں لگتے ہیں، لیکن اگر آغا جان نے آپ کا انتخاب کیا ہے تو ضرور کچھ سوچ کر ہی کیا ہو گا۔ مجھے کوئی گستاخی ہوئی ہو تو معاف کر دیجئے گا.....“

میرا بھی چاہا کہ میں اس مخصوصی لڑکی کو سچ بتاؤں لیکن بڑی مشکل سے میں نے خود کو باز رکھا۔ اتنے میں خانم بھی اندر سے نکل کر ہمیں دالان میں بیٹھا دیکھ کر ہماری جانب چلی آئیں ”تم دونوں یہاں بیٹھے ہو..... میں چائے کا پوچھنے آئی تھی کہ اندر لگاؤں یا میہیں بیچج دوں.....“ فضہ

نے ماں کو روک لیا ”آپ بیٹھیں موموجان ..... چائے پینیں آجائے گی۔ میں نے کہہ رکھا ہے .....“

خانم نے مسکراتے ہوئے میری جانب دیکھا ..... ”ہاں تو کیا بات ہو رہی تھی شاگرد اور اتنا لیق کے درمیان .....“ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا ”یہ کہ انہیں پہلے ہی مضمانت کے بارے میں اتنا زیادہ علم ہے کہ کچھ دنوں میں یہ میری اتنا لیق بن جائیں گی .....“ دونوں ماں بیٹھی زور سے نہ پڑیں۔ خانم نے مجھ سے کہا ”تمہاری ایک بات مجھے بہت پسند آئی۔ تم نے آتے ہی اپنی قابلیت کا رعب ڈالنے کی کوشش نہیں کی کسی پر ..... علم انسان کو سمندر کی طرح گہرا بنا دیتا ہے ..... اسے با ربار چھلنے سے روکتا ہے .....“

میں نے صاف دلی سے کہا ”میں سمجھتا ہوں آپ کی صاحبزادی کو مجھ سے کہیں زیادہ تجربہ کا راستا دکی ضرورت ہے جو صرف اب ان کے اندر بہتے علم کے دریا کو کوڑے میں بند کر سکے ..... میری یہاں موجودگی صرف ان کے وقت کا ضیاء ہی نہ ثابت ہو .....“ فضہ جلدی سے بول پڑی ”اڑے نہیں نہیں ..... ایسا کیوں کہا آپ نے ..... میرا یا موم کا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا۔ ہر انسان دوسرے انسان کو کچھ نہ کچھ دے کر ہی جاتا ہے ..... اب یہم پر منحصر ہے کہ ہم اس سے کیا فیض حاصل کرتے ہیں۔ آپ سے میری یہ گزارش ہے کہ آپ مجھ سے ایک اچھے دوست کی مانند وہ سب علم باشیں جو آپ کے پاس ہے ..... چاہے وہ کتابی نہ بھی ہو ..... کتاب ہی مقصد ہوتا تو وہ میں خود بھی پڑھ سکتی تھی۔ آپ مجھ سے اپنی وہ سوچ باشیں جو ان کتابوں میں لکھی تعلیم نے آپ کے اندر پیدا کی ہے۔ بد لے میں میں بھی یہی کچھ تقسیم کرنے کی کوشش کروں گی۔“

فضہ کی بات سن کر میرے سر سے ایک بہت بڑا بوجھہ اتر گیا ..... سچ تو یہی تھا کہ کتابی علم کی صورت میں اسے دینے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا ہاں ..... میں کیا سوچتا تھا اگر اس سے ہم دونوں کی اس علم کی تحریک کو کوئی فائدہ ملتا تھا تو یہ ہم دونوں کے لیے ہی منافع بخش سودا تھا کیونکہ بد لے میں مجھے بھی تو اس کی سوچ جاننے کا موقع مل رہا تھا۔ جانے ہمارے تعلیمی اداروں میں کتابیں ذہن میں ٹھونے پر ہی کیوں زور دیا جاتا تھا۔ کتاب کے ذریعے سوچ کو پروان چڑھانے کے عمل کو فروغ کیوں نہیں دیا گیا آج تک؟؟؟

پہلے دن کا انتقام بہتر طریقے سے ہونے پر میں نے دل ہی دل میں دا خل ہوتے ہی تیز تیز بولنے اور جھگڑنے کی آوازوں نے میرے قدم روک لیے۔ وقار اور سجاد میں تیز بجھت جاری تھی اور نواب صاحب سر جھکائے دونوں کے درمیان پریشان بیٹھے ہوئے تھے۔ وقار نے چلا کر کہا ”بس بہت ہو گیا ..... آپ کے پاس اس کی شکاری فضول خرچیوں کے لیے تورم کی کوئی کمی نہیں ..... اور میں اگر کبھی اپنے دوستوں کی دعوت کے لیے کچھ روپے اضافی مانگ لوں تو آپ کو اپنے اصول یاد آ جاتے ہیں۔“ سجاد نے ترکی بہتر کیا اور میں شکار پر خرچ کرتا ہوں کوٹھوں پر نہیں ..... میری برابری کرنے کی کوشش نہ تھی کہیں تو بہتر ہے .....“ بڑے بھائی سے یہ جملہ برداشت نہیں ہوا اور وہ تیزی سے چھوٹے کی جانب بڑھا ”بہت زبان چلنے لگی ہے تمہاری ..... آج اس کا بھی بندوبست کیے دیتا ہوں .....“ نواب صاحب کی برداشت جواب دے گئی اور وہ زور سے چلا کر اٹھ کھڑے ہوئے ”شرم آئی چاہئے تم دونوں کو ..... اب تو باپ کی موجودگی کا لحاظ نہیں رہا کسی کو۔ میں نے بہت برداشت کر لیا۔ اب اگر تم دونوں نے اس بات کو بڑھایا تو دونوں کو ہی عاق کر دوں گا۔“ وقار نے باپ کی جانب دیکھا ”میں جانتا ہوں کہ آپ ایسے ہی کسی موقعے کی تاک میں ہیں تاکہ میرے حصے کی برداشت بھی اپنی اس لاڈلی بیٹی کو منتقل کر سکیں۔“ وقار پر پختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ میں ایک اوٹ

میں کھڑا تھا لہذا اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ چھوٹا سجا بھی بکتا جھکتا وہاں سے چلا گیا جاتے جاتے اس نے باپ سے اپنے حصے کی جائیداد کی علیحدگی کا مطالبہ بھی کیا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد میں مرکزی ہال میں ہوتے اس تماثیل کے آخری کردار نواب دہیر کے سامنے آگیا۔ وہ بھی تک اپنا سر تماثیلے بیٹھے ہوئے تھے۔

”آؤ آیاں میاں..... تم نے اس ناگلف اولاد کی زبان درازی تو دیکھی ہی لی ہوگی۔ جانے میری تربیت میں ہی کچھ کی تھی یا پھر نہیں اور چوک ہو گئی ہے مجھ سے ..... یہ دونوں پہلے تو ایسے بھی نہ تھے .....“ میں نے ایک تلخ سوال کیا ”کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان دونوں میں سے بھی کوئی آپ کی جان کے درپے ہو سکتا ہے، تاکہ آپ کی وراثت اسے جلدی منتقل ہو سکے .....“ نواب صاحب بری طرح چونک گئے۔ خون کے رشتے بعض اوقات انسان کی آنکھوں پر گہرے کالے پردے ڈالے رکھتے ہیں۔ ”نہیں نہیں ..... یہ دونوں کتنے بھی نافرمان کیوں نہ کہی ..... مگر اپنے باپ کی جان نہیں لے سکتے ..... مجھے یقین نہیں آتا .....“

میں نے نواب صاحب کو زیادہ کریدا مناسب نہیں سمجھا۔ نہ ہی میں نے شمن سے سئی بات ان کے کان میں اندھیلی کہ اس اچانک تبدیلی کی وجہ کیمیں ان کی اپنی بھا بھی نواب خاتون تو نہیں کیونکہ کسی بھی حتمی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے مجھے ابھی بہت سے کام انجام کو پہنچانے تھے۔ بہت سے چھروں کو ٹھوٹ لانا تھا۔

## کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

## گُڑبڑ گھوٹالہ

**گُڑبڑ گھوٹالہ** ڈاکٹر مظہر عباس رضوی کی مزاحیہ شاعری کا مجموعہ کلام ہے۔ یہ اُنگی مزاحیہ شاعری کی تیسری کتاب ہے۔ اس سے پہلے ان کی شاعری کی دو کتابیں ”ہوئے ڈاکٹری میں رسوا“ اور ”دوا بیچتے ہیں“ شائع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر مظہر عباس رضوی کی یہ شاعری اس اعتبار سے منفرد ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں ڈاکٹری، ہسپتال اور بیماریوں جیسے خلک موضوعات کو مزاح کے لطیف قابل میں ڈھالا ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں کے چند عنوانات ہیں ”ریقان آرزو“، سوہے وہ بھی ڈاکٹر، درد عرق النساء، پیوند کاری، نر، ایسی جی، لفظی پوشاہم، بلکہ جگر کے، وغیرہ وغیرہ۔

## کتاب گھر کی پیشکش

**گُڑبڑ گھوٹالہ** کتاب گھر پرستیاب جسے شاعری کے طنز و مزاج سیکش میں دیکھا جاسکتا ہے۔

## باب 22 کتاب گھر کی پیشکش

وہ رات میں اپنے کمرے میں ہی گزاری۔ دونوں بھائی نا راض ہو کر شام ہی سے گھر سے باہر جا چکے تھے اور صبح تک ان کی واپسی کی کوئی امید نہیں تھی۔ پاشا صاحب اپنے کسی قریبی رشتہ دار کے ہاں کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے اور ان کی واپسی اب اگلے ہفتے ہی متوقع تھی۔ گویا مردان خانے میں اس رات میرے اور حویلی کے ملازموں کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں تھا۔ میرا بار بار باہر ٹھہلانا نواز کو مشکوک کر سکتا تھا لہذا میں نے خود کو کرے تک ہی محدود رکھا۔ جانے کیوں آج مجھے راجہ بالا اور مشی تینوں ہی بہت یاد آ رہے تھے۔ جانے وہ کیسے ہوں گے..... مجھے یاد تو ضرور کرتے ہوں گے۔ کیفے فراق میں ان کی مخلفیں اب بھی اسی طرح جنمی ہوں گی یا نہیں..... چچا فراق کیسے ہوں گے..... مرزا اب بھی ان تینوں کے لیے فراق چچا سے چھپا کر فریش روں اور گرم پیش رکھتا ہو گا یا نہیں؟..... سب کچھ دویسا ہی ہو گا..... بس میری کمی ہو گی۔.....

میں جانے کن خیالوں میں کھو یا ہوا تھا۔ اچانک مجھے باہر کسی کھلکھلے کی آواز سنائی دی۔ میں چونکہ کراٹھ بیٹھا اور پھر دوسرے کھلکھلے سے پہلے ہی میں آہستگی سے اپنے کمرے سے نکل چکا تھا۔ آواز اوپر والی منزل سے آئی تھی میں دبے پاؤں مگر تیزی سے میڑھیاں چڑھ کر اوپر راہداری میں آگیا۔ راہداری سنان پڑی ہوئی تھی۔ اسی منزل پر حویلی کی لاہی بیری بھی تھی۔ میں نے چاروں طرف گھوم کر اچھی طرح جائزہ لیا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں کچھ دیر انتظار کے بعد واپس اپنے کمرے میں آگیا۔ اگلی صبح میں نے نواب صاحب سے بر سیل تذکرہ پوچھا کہ مردان خانے کی دوسری منزل پر عام حالات میں کون رہائش پذیر رہتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ کوئی مستقل رہائش نہیں ہے دوسری منزل کا بس کبھی کبھار چوکیدار یا محافظرات کو وہاں کا چکر لگایتے ہیں، لیکن جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی محافظت کی آہٹ نہیں تھی۔ میں نے بات ٹال دی۔

شام کو فضہ اپنی کل والی جگہ پر ہی میرا انتظار کر رہی تھی لیکن آج وہ کتابیں لے کر نہیں آئی تھی۔ البتہ اس کے ہاتھ میں ایک نوٹ بک ضرور موجود تھی۔ جس میں اس نے اس علاقے کی طرز تعمیر کے بارے میں اپنے کچھ مشاہدات درج کیے ہوئے تھے ”آپ کیا سمجھتے ہیں..... مغل اس خطے کے آرکیٹچر Architecture پر تاثر انداز کیوں ہو پائے؟.....“

”شاید اس لیے کہ وہ اپنے ساتھ ایک نئی تازگی اور تعمیرات میں کسی خوبصورت تصویر جیسی باریکیاں لے کر آئے تھے۔ اب آپ اپنے اس محل کو ہی لے لیں۔ یہ بذات خود اس وادی میں اور ان کھیتوں کے درمیان کسی ایک خوبصورت پینٹنگ کی طرح ہی تو لگتی ہے..... مغل واقعی مصور تھے.....“ فضہ مسکرائی ”آپ مغلوں سے بہت متاثر لگتے ہیں.....“

”نہیں..... خود اپنے آپ سے کیا متاثر ہونا..... ہم بھی مغل ہیں.....“ فضہ خوشی سے بے یقینی سے چلائی ”اچھا..... واقعی..... اوہ یہ کتنی حیرت کی بات ہے اور میں آپ کو بتاؤں کہ میں واقعی مغلوں سے بہت متاثر ہوں..... آپ سے مل کر خوشی ہوئی سر آیاں مغل.....“ ہم دونوں نہیں پڑے۔ اس دن ہم دونوں نے بہت دیر تک مغل تہذیب اور طرز تعمیر پر اپنے خیالات بانٹے اور اپنا اپنا نظریہ پیش کیا۔ فضہ ایک ذہن لڑکی تھی اور

اس کی سوچ کے زاویے بہت منفرد تھے۔ وہ شاید زمرد حویلی میں تھائی کا بھی شکار تھی کیونکہ ماں کے علاوہ کسی اور کے پاس یہاں اس کے لیے وقت نہیں تھا۔ میں جان بوجھ کر کم بولتا اور اسے زیادہ سنتا رہا۔۔۔ اور وہ تھی بھی کچھ ایسی ہی قابل سماut۔۔۔ خود میرے بھی بہت سے مجسم زاویے اس کی معلومات سے واضح ہوتے گئے اور پھر ہمارا یہ روز کا معمول بتاتا چلا گیا۔ ہم روزانہ زمرد حویلی کی اس نہر کے کنارے بینچہ کر خدا پنے اندر کو کھو جتے اور فضہ اہم باتیں نوٹ بک میں درج کرتی رہتی۔ اب میں اس کا استاذ نہیں تھا بلکہ ہم دونوں ہی اپنی اپنی سوچ اور خیال سے ایک دوسرے کو تعلیم دے رہے تھے۔ دھیرے دھیرے خود مجھے بھی ان مضامین سے دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی اور میں نے خود اپنی معلومات کے لیے اپنی لائی ہوئی اور لابریری میں موجود کتابیں کھنگا لانا شروع کر دی تھیں۔ اب جب میں فضہ سے یہاں کی تاریخ اور تہذیب پر بات کرتا تھا تو وہ ماضی کی طرح میرے رئے رثائے جملے نہیں ہوتے تھے بلکہ میری اپنی کھونج اور تحقیق ہوتی تھی۔ فضہ کی صحبت آیاں احمد کو بھی کتابوں سے محبت کرنا سکھا رہی تھی یا شاید میں اندر سے تبدیل ہو رہا تھا لیکن جس اصل مقصد سے میں زمرد حویلی میں داخل ہوا تھا وہ ابھی تک میری نظروں سے او جھل تھا۔ پشا صاحب بھی واپس آچکے تھے اور دن گزرتے جا رہے تھے۔ مجھے فضہ جیسی بچی اور صاف گولڑکی سے اپنی حقیقت چھپانا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن عجیب الجھن تھی کہ میری

شناخت کا چھپا رہنا خود اسی کے گھرانے کے لیے ضروری تھا۔

آخر کار بھجے زمرد حویلی میں داخل ہوئے دو بخت سے زیادہ ہو گئے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب ہمیں حملہ آور کا چھپ کر انتظار کرنے کے بجائے اسے خود آگے بڑھ کر حملہ کرنے کی ترغیب اور لائق دینا ہوگی۔ میں نے نواب صاحب کو اپنے منصوبے سے آگاہ کیا تو پاشا صاحب فکر مند ہو گئے۔ ”لیکن میاں یہ بھی تو سوچو کہ اگر ہم سے ذرا سی بھی چوک ہو گئی تو نواب صاحب کی جان کو واقعی خطرہ ہو سکتا ہے۔“ میں نے ان پر واضح کیا کہ ہم اعلان کی حد تک یہ مشہور کریں گے کہ نواب صاحب اپنی بیگم خانم سے کسی کھٹ پٹ کی وجہ سے مردانے کی خواب گاہ میں منتقل ہو رہے ہیں جبکہ اصل میں وہ اپنی مردانے والی خواب گاہ میں نہیں میرے کرے میں سوئیں گے اور ان کی خواب گاہ میں ان کے بستر پر میں موجود رہوں گا۔ نواب صاحب نے بھی میری حفاظت کے پیش نظر کچھ تامل کیا لیکن میں نے آخر کار انہیں قاتل کر لیا کہ ہنکار کو اس کی کمین گاہ سے نکالنے کے لیے یہ چارہ ڈالنا بہت ضروری ہے۔ طے یہ پایا کہ نواب صاحب ایک آدھ دن میں میرے منصوبے کے مطابق مردانے میں منتقل ہو جائیں گے اور خانم کو اس معاملے میں اعتماد میں لینے کی ضرورت پڑی تو اس سے بھی دربغ نہیں کیا جائے گا۔

اس رات میں اپنے منصوبے کی جزئیات پر غور کرنے کے لیے بہت دیر تک جا گتا رہا۔ ویسے بھی نیند کا اور میرا ساتھ تو جانے کب کا چھوٹ چکا تھا کبھی یہ نیند میری کتنی گہری سی ہیلی ہوتی تھی۔ مجھے اپنے گھر کی نیند یاد آتی۔ امی، ریحان اور چھوٹی دن چڑھے تک مجھے جا گا کر تھک جاتی تھیں اور پھر آخر کار ابا کے حکم پر ریحان با قاعدہ بالٹی بھر پانی لا کر مجھ پر انڈیل دیا کرتا تھا۔ کاش ہمارے میں میں نیند اور بے داری کا بھی کوئی مخصوص خود کا نظم ہوتا تو کم از کم اپنی آدھی زندگی تو اپنی مرضی سے بتا سکتے۔۔۔ میری نیند میں تو اس حسن بے پرواہ نے بر باد کردی تھیں جسے آخری لمحے یا حساس بھی نہیں ہو سکا کہ کوئی اس کے لیے دھیرے دھیرے اندر سے مر رہا ہے۔ گہنا کا خیال آتے ہی میرے آس پاں پھر سے اسی ادا سی کی گہری دھندا اور کہرا چھا گیا جو میرے آس پاں باقی تمام مناظر دھندا دیتا تھا۔

اچانک مجھے اوپر کی منزل سے پھر وہی ہلکے قدموں کی چاپ اور کسی تالے کے کھلنے جیسا کھلا کسانی دیا۔ اس بار مجھے اپنی ساعتوں پر بالکل شک نہیں ہوا۔ میں بیکلی کی تیزی سے اپنے کمرے سے لکلا اور اوپر کی منزل کی جانب لپکا۔ اوپر راہداری مکمل اندر ہیری اور سنسان تھی۔ اچانک ایک ستون کے پیچے نیچے والاں سے آتی روشنی کے ایک ٹکڑے میں مجھے کسی ہیولے کا سایہ سادھائی دیا۔ کوئی شخص اپنے آپ کو بڑی سی کالی چادر میں لپیٹھے میری موجودگی سے بے خبر دوسری منزل پر بننے کسی کمرے میں داخل ہو گیا۔ میرے پاس فیصلہ کرنے کے لیے بہت کم وقت تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں اس دروازے کے باہر دیوار سے ٹیک لگا کر اپنا سانس روکے کھڑا تھا۔ اس کمرے کا ایک ہی دروازہ کھلا تھا اور دوسرے بڑے دروازے کے باہر لگا بڑا ساتالہ مجھے یہاں سے بھی بند نظر آ رہا تھا۔ لمحے برسوں کی طرح گزرنے لگے۔ جانے وہ اتنی دیر تک اندر کیا کر رہا تھا۔ قریباً بیس منٹ بیس صد یوں کی طرح بتانے کے بعد میں نے آخر کار خود اندر جانے کا فیصلہ کر لیا لیکن تھیک اسی وقت اندر سے کسی کے دھیمے قدموں کی چاپ نے مجھے پھر سے دم سادھنے پر مجبور کر دیا۔

کوئی دھیرے دھیرے چلتا ہوا دروازے تک آیا اور پھر اس نے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ میرے ہاتھ کے نیچے کی مضبوط گرفت نے اس اجنبی کی کلائی کو جکڑ لیا مجھے موئی کا دیا ہوا ابتدائی سبق یاد آیا۔ دشمن کے ہاتھ کو سب سے پہلے قابو کر لو تو وہ آدھارہ جاتا ہے کیونکہ سب سے پہلی جدوجہد اور کوشش ہاتھ کی ہی ہوتی ہے۔ مخالف کا ہاتھنا کا رہ کر دو تو آدھی جیت پہلے ہی اپنے نام ہو جاتی ہے۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں اس کی کلائی کو جھکاؤ دے کر ناکارہ کرتا، فرش پر بہت سی کاشی کی چوڑیاں اور لگن ٹوٹ کر گرنے کی آواز گوئی۔ میں نے گھبرا کر ہاتھ چھوڑ دیا۔ سیاہ شال کے نیچے سے ایک سکی سی ابھری۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اجنبی کی چادرالثادی۔ فضا میں ایک کونڈا ساپکا اور کسی کی سہری زلفیں تیز ہوا سے اڑیں اور کسی چاند چہرے سے لپٹ کر خود نقاب بن گئیں۔ وہ فضہ تھی جو اس قدر خوف زدہ ہو چکی تھی کہ اس کے کانپتے ہوں سے آواز تک نہیں نکل پا رہی تھی۔ اس کی کلائی سے چوڑیاں ٹوٹنے کی وجہ سے خون کی ایک پتلی سی لکیر ابھر کر بننے کو تیار تھی۔ میں نے اس سے پہلے آج تک کبھی بھی فضہ کو بنا اسکارف یا کھلے بالوں کے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے سر کو ڈھانپنے رکھتی تھی۔ میرے سامنے لرزتی کا نیقی سی ایک نئی فضہ کھڑی تھی۔ اس سے پہلے وہ خوف کے مارے بے ہوش ہو کر گر پڑتی میں نے جلدی سے اسے شانوں سے پکڑ کر جھینجھوڑا۔

”ہوش میں آئیے۔ یہ میں ہوں۔۔۔ آیاں۔۔۔“

فضہ نے ایک جھر جھری سی لی۔ میں نے جلدی سے اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کی کلائی پر باندھا ”آپ اس وقت آدھی رات کو یہاں کیا کر رہی ہیں؟“ وہ ہکلائی ”میں۔۔۔ میں تو لا بھری سے چند کتابیں لینے اور پرانی واپس رکھنے آئی تھی۔۔۔ دراصل میرے بھائیوں کو میرا دن کے وقت یہاں مردانے کی لا بھری میں آتا پسند نہیں ہے۔۔۔ اس لیے میں چھپ کر رات کو یہاں آتی ہوں۔۔۔ ہفتے میں دو مرتبہ۔۔۔“ میری نظر فضہ کے دوسرے ہاتھ میں پکڑی ایک کتاب پر پڑی ”لیکن آپ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہیں۔۔۔؟۔۔۔“ مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پایا ”میں۔۔۔ میں تو آہست سن کر اوپر آ گیا تھا۔ میں سمجھا کوئی اجنبی کسی غلط ارادے سے حویلی میں آ گھا ہے۔۔۔“ دفعہ فضہ کو اپنے پلو اور کھلے سر کا خیال آیا اور اس نے جلدی سے خود کو اسی بڑی شال سے ڈھانپ لیا۔ ہم دونوں ہی بڑی عجیب سی صورت حال میں ہنسنے ایک دوسرے سے نظریں چڑا

رہے تھے۔ پھر فضہ نے ہی مشکل کا حل نکالا ”اب میں چلتی ہوں..... مو مو جاگ گئیں تو پریشان ہوں گی۔ میں انہیں بتائے بنا آئی ہوں.....“۔

”چلیں میں آپ کو زنان خانے کی راہداری تک چھوڑ دیتا ہوں..... راستے میں بہت اندر ہیرا ہوگا.....“ فضہ دھیرے سے مسکرائی ”مجھے اندر ہیرے سے ڈرنیں لگتا..... لیکن آج اندر ہیرے کے محافظ نے بری طرح ڈرایا۔ آپ بھی جا کر سو جائے بہت دیر ہو گئی ہے.....“ فضہ دہاں سے پلٹ کر چل دی۔ میں اپنی جگہ یوں ہی ساکت کھڑا رہا۔ اس نے راہداری کے اختتام پر مرنے سے پہلے مجھے پلٹ کر دیکھا اور دھیرے سے آداب کا اشارہ کرتی ہوئی اندر ہیرے میں غائب ہو گئی۔ مجھے میری ہتھیں میں ہلکی سے چبجن کا احساس ہوا میں نے ہاتھ کھول کر دیکھا تو میری ہتھیں میں فضہ کی ٹوٹی ہوئی چوڑی کا ایک چھوٹا سا مکڑا کھب کر پھسارت گیا تھا۔ میں نے بے خیال میں وہ خوبصورت ”پھانس“ اپنی ہتھیں سے نکالی اور خود میری ہتھیں پر بھی خون کی چند سخنی مٹی بوندیں ابھر آئیں۔

میں تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے میں لوٹ آیا مگر پھر صبح تک نیند میری آنکھوں سے میرے نصیب کی طرح روٹھی رہی۔ صبح ناشتے پر پاشا صاحب نے مجھے اطلاع دی کہ نواب صاحب آج سے مردانے میں منتقل ہونے کی خبر مشہور کروادیں گے اور پھر سب سے پہلے حویلی کے ڈھنڈوں پچی شہین نے ہی مجھ تک رازدارانہ انداز میں یہ خبر پہنچائی ”کیا بتائیں آیاں میاں..... لگتا ہے حویلی کو کسی کی سیاہ نظر کھانگئی ہے۔ اب پتہ چلا ہے کہ نواب صاحب اور خانم بیگم کے درمیان کچھ ناچاقی ہو گئی ہے شاید۔ تبھی تو انہوں نے اپنی مردان خانے والی خواب گاہ کی صفائی کا حکم دے دیا ہے۔ آج شام سے وہ خود بھی مردانے میں منتقل ہو رہے ہیں۔ اللہ ہی خیر کرے.....“ شہین نہ جانتے اور کیا کچھ کہتا رہا لیکن میری نظر بار بار اپنی ہتھیں کے اس نخے منے سے گاؤ پر جا کر نکل جاتی تھی جو گزشتہ رات سے میری تقدیر کی اندر ہیری لکیروں میں کسی جگنوکی طرح جگمگار ہاتھا۔

چار بجے میں ٹوٹن کے لیے زنان خانے پہنچا تو فضا کو پہلی مرتبہ کچھ بے اعتماد اور الجھاسا پایا۔ میں خود بھی اس سے نظر ملانے سے نہ جانے کیوں کترار ہاتھا۔ اس روز ہمارا موضوع بھی کچھ تشنہ ہی رہا۔ فضہ مجھ سے تاریخ اور اس خطے کی ایجادات کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے لفظ کچھ بے ربط سے تھے ”آپ نہیں سمجھتے کہ نور جہاں نے عطر ایجاد کر کے اپنے عہد کو کتنا عظیم تحفہ دیا تھا“، میں مسکرایا ”کون جانے وہ ایجاد نور جہاں کی ہی تھی یا پھر ملکہ نے اپنی کسی کنیز یا غلام کی تحقیق کو اپنے نام کر لیا تھا.....“ وہ بحث کے مودہ میں تھی۔ ”نہیں..... آپ صرف اپنے اندر کے ایک شک کی وجہ سے اتنا بڑا سہرا اس ملکہ سے نہیں چھین سکتے، اور پھر ایک عطر کی ایجاد پر ہی کیا منحصر..... کیا ہر دوسریں ایسی کئی ایجادات کے بانیوں نے ہمارے لیے زندگی بے حد بہل اور آسان نہیں کر دی؟ ہم سے پہلے کے لوگ بھی کچھ تو کر گئے ہیں ہمارے لیے.....“ میں نے ایک گھری سانس لی ”لیکن کتنا بڑا الیہ ہے کہ انسان نے انسان کے لیے ایجادات کی صورت میں جو بھی آسانیاں پیدا کیں، ہم انسانوں نے ہی ان کا حصول چند سکوں سے مسلک کر کے خود اپنی ہی زندگی کو پھر سے اپنے لیے کس قدر مشکل ہنا دیا ہے۔ کاش اس دنیا میں یہ روپے پیے اور سکے وجود میں ہی نہ آتے..... اگر ہم زندگی کو اس بے جان اور مادی پیانا نے پر نہ پر کھ سکتے تو کتنا اچھا ہوتا.....“ تب یہاں کوئی امیر ہوتا نہ کوئی غریب۔ صرف انسان ہوتے۔ سب برابر اور یکساں انسان.....“

فضہ غور سے میری جانب دیکھتی رہی ”کبھی کبھی آپ بالکل فرہاد کی طرح با تمیں کرتے ہیں۔ اسے بھی یہ دنیاوی تقسیم اور روپے پیے کی

بنیاد پر اونچ نیچ سخت زہر لگتی تھی..... وہ بھی بالکل آپ جیسا تھا۔ ”فضہ اپنی رومیں کچھ کہتے کہتے رک سی گئی۔ میں نے اس کے چہرے کے اترے چڑھتے رنگ کو بغور دیکھا۔ ”یہ فرہاد کون ہے.....؟“ فضہ نے مجھ سے نظریں چڑالیں ”ہے نہیں..... تھا..... تہران یونیورسٹی میں میراہم جماعت تھا۔ میراہم تین دوست..... میراہم نفس.....؟“

”تحا کیوں..... ہے کیوں نہیں.....؟“ فضہ دور خلامیں دیکھ رہی تھی ”آغا جان کو میرا اس سے ملنا جتنا پسند نہیں تھا۔ وہ غریب تھا مگر اس کے خیالات انقلابی تھے..... اور نیکیں وامراء کو انقلاب ذرا کم ہی بھاتا ہے.....؟“ میں نے چونک کرا سے دیکھا۔

”تو آپ نے تھیار کیوں ڈال دیے..... آپ بھی اس انقلاب میں فرہاد کی مددگاری کیوں نہیں بن گئیں.....؟“ فضہ ادا س ہو گئی۔

”انقلابیوں کی کوئی منزل نہیں ہوتی..... کبھی کبھی انقلاب تین چار سلوں تک صرف ایک سراب ہی رہتا ہے۔ میں اس کے ساتھ چلنے کے لیے تیار تھی..... مگر وہ مجھے ان کا نٹوں میں گھینٹنے کے حق میں نہیں تھا۔ لہذا چپ چاپ سب چھوڑ چھاڑ کر اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے وظیفے پر جرمی چلا گیا، اور میں دوسال بعد آغا جان کے اصرار پر یہاں آگئی۔.... تب سے ہمارا کوئی رابطہ نہیں رہا.....“ فضہ نے آج پہلی بار اپنا دل میرے سامنے کھولا تھا۔ تو اس ناز نہیں کو بھی دنیا میں منفرد اور جدار کھنے والا یہ ”محبت“ نامی پارس ہی تھا۔ ہاں..... نیچ ہے..... محبت کی تاثیر بھی تو پارس پتھر جیسی ہی تھی۔ جس نے آج تک جس کسی کو بھی چھووا اسے سونا کر دیا، لیکن اس کے اندر سے روح کھیچ لی۔ دنیا کے کبھی محبت کرنے والے اس پارس سے چھو جانے کے بعد بنا روچ اور جان کے سونے کی سورتیوں جیسی زندگی ہی تو گزارتے ہیں۔ میں نہ جانے کن خیالات میں کھویا رہا اور مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ فضہ مجھے غور سے دیکھ رہی ہے۔

”کیا آپ کی زندگی میں بھی کوئی ہے یا تھا جس کے لیے آپ کی یہ آنکھیں بار بار جھللاسی جاتی ہیں.....؟“

میں نے چونک کر جلدی سے آنکھیں مسل ڈالیں۔ کبھی کبھی ہماری نظریں ہمیں چلتا پھرتا اشتہار بنا دیتی ہیں۔ ”پتا نہیں..... وہ تھی بھی کہ نہیں..... محبت یک طرفہ ہو تو اس کا نام محبت نہیں الزام رکھ دینا چاہئے۔ مجھ پر بھی اسی ادھوری محبت کا الزام ہے..... اور شاید سدار ہے گا۔“ میں نے فضہ کو گھنٹا کے بارے میں مختصر آبتدیا۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی۔ میں نے رنگا کے اڈے سے تعلق کے علاوہ اسے یہ بھی بتایا کہ ستارہ کا یہ کہنا ہے کہ کبھی کبھی محبت ہم پر ظاہر ہونے اور اپنا آپ منوانے میں بہت وقت لیتی ہے، اور کبھی کبھی خود ہمارے اندر کی یہ دیر کی بازیاں پلٹ دیتی ہے۔ لیکن میں تو پیار کی پہلی بازی ہی اس بری طرح ہارا تھا کہ اب کسی اور محبت کی گنجائش ہی کب پتھر تھی میرے اندر۔ مجھے تو اب اس لفظ محبت سے ہی خوف محسوس ہوتا تھا۔ اس دن میں فضہ کے پاس سے اٹھ تو آیا لیکن ہم دونوں کے اندر کئی خلا اور کئی سوال تشنہ رہ گئے تھے۔

شام کو نواب صاحب بھی مردان خانے والی اپنی خواب گاہ میں منتقل ہو چکے تھے اور مردان خانے کے نوکروں کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ شہین ڈانٹ ڈانٹ کر سب کو حکم دے رہا تھا۔ نواز کی تیز نظریں سب پر جھی ہوئی تھیں۔ نواب کے دونوں بیٹے بھی رات کے کھانے پر موجود تھے لیکن دونوں کے انداز میں سرد مہری نمایاں تھی۔ کھانے کے بعد نواب صاحب نیند کا بہانہ کر کے جلدی اٹھ گئے اور اپنی خواب گاہ کی جانب بڑھ گئے میں نے قہوے کے دور چلنے تک کچھ توقف کیا اور پھر میں بھی اجازت لے کر اٹھ آیا۔ کسی کو پتہ نہیں چل پایا کہ پاشا صاحب نے نواب صاحب کو کس وقت میرے

کمرے میں منتقل کیا اور کب میں اپنے کمرے کی جانب جاتے جاتے نواب صاحب کی خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔ دونوں ہی کمرے پھلی منزل پر تھے اور تقریباً ایک دوسرے کے بال مقابل بھی تھے۔ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی صفر کے ایک بلب کے علاوہ باقی تمام روشنیاں گل کر دیں۔ پتہ نہیں کیوں آج میرا دل کسی انہوں کی گواہی دے رہا تھا۔ میں نے خود کو بستر پر ڈال دیا اور آنکھیں موندھ کر اپنے اندر کے اندر ہر دل سے لڑتا رہا۔ رات کے دونوں بچے تھے اور اب گھریوال کی تک تک باقاعدہ میرے ذہن پر کسی ہمتوڑے کی طرح نج رہی تھی۔ اچانک کمرے کی بائیچے کی جانب کھلنے والی بالکنی میں ہلاکا سا کھلا ہوا۔ آواز بہت مدھم اور خفیضی تھی اگر میں ہلکی سی غنوڈگی میں بھی ہوتا تو مجھے ہرگز پتہ نہ چلتا۔ میں نے اپنی سانس روک لی۔ اندر ہر دل سے ایک ہاتھ کھڑکی کی ہلکی سی کھلی درز سے اندر داخل ہوا مطلب وہ جو کوئی بھی تھا اس نے اپنے اندر آنے کا راستہ پہلے سے ہی ہموار کر رکھا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکا۔

## کتاب گھر کی پیشکش

## کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

## کتاب گھر کی پیشکش دجال (شیطان کا بینا)

انگریزی ادب سے درآمد ایک خوفناک ناول۔ علیم الحق حقی کا شاندار انداز بیان۔ شیطان کے پیاریوں اور پیروکاروں کا نجات دہنده شیطان کا بینا۔ جسے بابل اور قدیم صحیفوں میں بیت (جانور) کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ انسانوں کی دنیا میں پیدا ہو چکا ہے۔ ہمارے درمیان پرورش پار ہا ہے۔ شیطانی طاقتیں قدم قدم پر اسکی حفاظت کر رہی ہیں۔ اسے دنیا کا طاقتور ترین شخص بنانے کے لیے کروہ سازشوں کا جال بنایا جا رہا ہے۔ مخصوص بے گناہ انسان، وانتہ یا نادانستہ جو بھی شیطان کے بیٹے کی راہ میں آتا ہے، اسے فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

**دجال**..... یہودیوں کی آنکھ کا تارہ جسے عیسائیوں اور مسلمانوں کو تباہ و بر باد اور نیست و نابود کرنے کا مشن سونپا جائے گا۔ یہودی کس طرح اس دنیا کا ماحول دجال کی آمد کے لیے سازگار بنارہے ہیں؟ **دجالیت** کی کس طرح تبلیغ اور اشاعت کا کام ہو رہا ہے؟ دجال کس طرح اس دنیا کے تمام انسانوں پر حکمرانی کرے گا؟ **666** کیا ہے؟ ان تمام سوالوں کے جواب آپ کو یہ ناول پڑھ کے ہی ملیں گے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ اس ناول کو شروع کرنے کے بعد ختم کر کے ہی دم لیں گے۔ دجال ناول کے تینوں حصے کتاب گھر پر متیاب ہیں۔

## باب 23

## کتاب گھر کی پیشکش

آنے والے نے خود کو نقاب اور ایک کالی چادر سے ڈھانپ رکھا تھا۔ سیاہ رنگ شاید اپنے اندر مغم ہو جانے والا سب سے زیادہ گھر انگ ہوتا ہے۔ تبھی تو اس کی رات کے اندر ہیرے سے اس قدر روشنی ہوتی ہے۔ نقاب پوش نے نہایت احتیاط سے ہر مقام پر کراطیناں کیا کہ کہیں اس کی کوئی آہٹ سونے والے کو ووشارنہ کر دے۔ میں نے جسم پر پڑی چادر کو اس طرح چہرے تک اوڑھ لیا تھا کہ صرف ایک ہلکی سی جھری باقی تھی جس کے ذریعے مجھے اس کی حرکات و سکنات کی ایک نامکمل سی جھلک نظر آری تھی۔ دفعتہ مجھے نقاب پوش کے ہاتھ میں کسی خجرا کی دھار صفر کے بلب کی اوہوری روشنی میں چمکتی نظر آئی۔ میرا سارا جسم اکٹھنے لگا۔ مجھے اپنی موت کو اپنے اس قدر نزدیک آنے دینا تھا کہ وہ قاتل میرے ہاتھوں سے نکل کر مجھے سے قضا نہ ہو جائے اور اس کے لیے مجھے اس کے قدموں کو گنتے رہنا تھا کیونکہ چادر کے نیچے سے اب وہ مجھے کسی پر چھائیں کی طرح بھی دکھائی نہیں دے پا رہا تھا۔ میں نے مویٰ کا سبق یاد کیا۔۔۔ اندر ہیرے میں دشمن کی چاپ اور اس کی سانس کے ہاضنے کی آواز سے اس کا اندازہ لگاتے رہو اور ٹھیک وقت پر اس پر چھپت پڑو۔۔۔ لیکن یاد رہے کہ اندر ہیرے میں کیے گئے وار سے دونوں کو بیک وقت ایک جیسا خطرہ رہتا ہے۔ لہذا ہاتھ چوک گیا تو سمجھو کر کھیل ختم۔۔۔ میں نے دل ہی دل میں الٹی گنتی شروع کر دی۔ ”پانچ، چار، تین، دو۔۔۔ ایک۔۔۔ اور اچانک ہی میں نے چادرالٹ کر پھینک دی۔ ٹھیک میرے اندازے کے مطابق نقاب پوش کا ہاتھ مجھے پر چھپتی وار کے لیے فضائیں بلند ہو چکا تھا۔ میرے کروٹ لینے اور اس کے گھبرا کر تیزی سے نیچے آتے ہاتھ میں شاید سکینڈ کے کسی ہزاروں حصے کا فرق تھا۔ میں نے کروٹ میں اور خجرا میرے کرتے کو چیرتا ہوا بستر کے زم فوم میں ڈھنس گیا۔ نقاب پوش نے گھبرا کر خجرا دوبارہ نکلنے کی کوشش کی لیکن تب تک میرا ہاتھ اس کی کلامی کو جکڑ چکا تھا کہتے ہیں وحشت میں انسان کی طاقت دو گنی ہو جاتی ہے۔ اس کا مظاہرہ میرے سامنے تھا۔ دوسرے ہی لمحے نقاب پوش با قاعدہ اپنی پوری قوت سے مجھ پر اپنا سارا بوجھ ڈال چکا تھا۔ اس کا فولادی گھٹٹا ٹھیک میری شرگ کے اوپر اپنا قاتل دباو بڑھا رہا تھا جب کہ وہ دوسرے ہاتھ سے اپنے خجرا کو پھر سے تو لنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ مویٰ ہمیشہ کی طرح میرے ذہن میں اپنے تمام داؤ اور گروں کے ساتھ موجود تھا۔

”ندھال پڑنے لگو تو بازی ملنے سے پہلے اپنی تمام طاقت مجتمع کر کے مخالف پر پل پڑو۔۔۔ یاد رہے۔۔۔ کبھی کبھی زیادہ دری تک خود کو روک رکھنا بھی مات کا باعث بن سکتا ہے۔۔۔“ میں نے اب تک اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ نقاب پوش کو کوئی ایسی چوٹ نہ لگ جائے جو جان لیوا ثابت ہو سکتی ہو کیونکہ اس کی موت سے ہمارا مقصد حل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ زندہ رہتا تو ہمیں بہت سے راز کھول جاتا، لیکن اب میں نے یہ احتیاط ترک کر کے اس سے نہنے کافی صلہ کر لیا اور خود کو تول کر پوری قوت سے اسے چیچپے کی جانب اچھا ل دی۔ خجرا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کہیں دور جا گرا اور پھر میں نے اسے اٹھنے کا موقع نہیں دیا۔ میری ٹھوکروں نے تھوڑی ہی دری میں اسے باواز بلند چینے پر مجبور کر دیا۔ اس نے کھڑکی کی جانب کو درکار باہر بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس کی کلامی پر میری گرفت بہت مضبوط تھی۔ فضائیں ہڈی ترخنے کی آواز گوچی اور اس کے منہ سے ایک بلند چیخ ابھری اور وہ اپنا ہاتھ پکڑ کر وہیں نڈھال ہو کر

گر پڑا۔ اس عرصے میں اس تمام شور و غل سے حویلی کے مردان خانے کے سبھی افراد جاگ کر میرے دروازے پر جمع ہو کر بڑی طرح سے پیٹ رہے تھے میں نے آگے بڑھ کر نقاب پوش کے چہرے سے نقاب کھینچ لیا، اور میرے منہ سے بے اختیار لکلا ”رجیم... تم... مگر... مگر کیوں...“ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سب سے آگے نواب صاحب اور ان کے عقب میں دونوں بیٹے۔ پاشا اور نواز سمیت سبھی تیزی سے کمرے میں گھس آئے۔ ان کے سامنے حویلی کا سب سے پرانا اور بظاہر سب سے زیادہ خدمت گار اور وفادار ملازم رجیم جو حویلی میں فوجر کی حیثیت سے برسوں سے یہاں موجود تھا اس وقت زمین پر آڑھاتر چھا پڑا درد سے کراہ رہا تھا۔ نواب صاحب تو نہ حال ہو کر وہیں ڈھنے سے گئے ”رجیم... تم نے یہ سب کیوں کیا۔ میری شفقت میں کیا کمی رہ گئی تھی... بولو... جواب دو...“ لیکن نواب صاحب کے سوال کے جواب میں رجیم کے پاس ایک خاموشی تھی۔ نواب کے بیٹے چلائے ”یہ سب کیا ہو رہا ہے...؟... اس لڑکے نے رجیم کی یہ حالت کیوں بنائی ہے۔ یہ سب حویلی میں کیا چل رہا ہے...؟“

نواب صاحب نے سب کو واپس اپنے اپنے کمروں میں جانے کا حکم دے دیا ”اس وقت کچھ بھی کہنا مناسب نہیں ہو گا۔ کل صبح دس بجے مرکزی دالان میں سب کے سامنے یہ راز بھی کھول دیا جائے گا۔ فی الحال آپ سب اپنے اپنے کمروں میں جا کر آرام کریں۔ میں تھاںی میں رجیم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں...“

وقار اور سجادہ چاہتے ہوئے بھی بڑھاتے ہوئے کمرے سے نکل گئے اور پھر سب نوکر ایک ایک کر کے وہاں سے چل دیے۔ نواب صاحب نے آخر میں مجھے اور پاشا صاحب کو وہیں روک لیا۔

رجیم اب سکرست کرو ہیں دیوار کے ساتھ نیک لگا کر بیٹھ چکا تھا۔ میں نے سب کے جانے کے بعد دروازہ بند کر دیا اور نواب صاحب کی طرف پلٹا ”نواب صاحب..... آپ کا دشمن آپ کے سامنے ہے لیکن اس پر میرا راز بھی افشا ہو چکا ہے۔ لہذا اب اس کا زندہ رہنا ہم میں سے کسی کے مفاد میں نہیں۔۔۔ بہتر یہی ہے کہ اس کی قبر نہیں حویلی کے پچھوڑے بنادی جائے باقی سب سارنگا کا استاد سن جال لے گا.....“ سارنگا کا نام سن کر رجیم کے ساکت جسم میں ایک جھر جھری سی پیدا ہوئی۔ پاشا صاحب میراشارہ سمجھ چکے تھے۔ انہوں نے بھی میری تائید کی۔ ”ہا۔۔۔ آیاں ٹھیک کہہ رہا ہے نواب صاحب۔۔۔ اب یہ کھلیل نہیں ختم ہو جائے تو بہتر ہے۔ آپ کا مسئلہ توصل ہو ہی چکا.....“ نواب صاحب کو اب ہماری منتشر کیجھ میں آئی اور انہوں نے ایک لمبا سا سنس لیا ”ٹھیک ہے۔۔۔ اگر آپ دونوں کی یہ مرضی ہے تو یوں ہی سکی۔۔۔ لیکن وھیان رہے۔۔۔ یہ میرا بہت پرانا آدمی ہے۔۔۔ زیادہ تکلیف نہ ہو.....“ نواب صاحب واپس جانے کے لیے پلٹے اور رجیم اپک کر ان کے قدموں سے لپٹ گیا ”خداء کے لیے مجھے ان کے حوالے کر کے نہ جائیں۔۔۔ مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی صاحب۔۔۔ میں سب بتانے کے لیے تیار ہوں۔۔۔ مجھے اس کام کے لیے نواب بیگم نے اکسایا تھا۔“ ہم سب کے سروں پر ایک بم جیسے پھونٹا اور ہم سب ساکت کے ساکت کھڑے رہ گئے، لیکن سب سے زیادہ صدمے کا شکار نواب صاحب تھے۔ وہ بمشکل قریبی صوفے تک پہنچے اور بنا کچھ کہے وہیں ڈھنے گئے۔ پاشا صاحب ان کی حالت دیکھ کر بوکھلا گئے اور بڑی مشکل سے ہم نے انہیں چند گھونٹ پانی پلا کر کچھ دیر کے لیے لٹا دیا۔ رجیم جو اپنے مالک کی جان لینے کے درپے تھا اور چند لمحے پہلے ان کے سینے میں فوجر گھونپنے کے لیے بے تاب تھا بخود روتے ہوئے تیزی سے بھاگ بھاگ کر نواب صاحب کی خدمت کر رہا تھا۔ ان کے ہاتھ پاؤں مسل کر انہیں ہوش میں لانے

کی کوشش کر رہا تھا اور نہ جانے دل ہی دل میں کون کون سی دعائیں پڑھ کر ان پر پھونک رہا تھا۔ انسان کے کتنے رنگ ہیں یہ شاید کبھی کوئی نہ جان پائے۔  
شیطان اور حمان کتنے بلکروں میں بٹ کر اس کے اندر پلتے ہیں اس کا اندازہ آج تک کوئی نہیں لگا پایا۔

خدا خدا کر کے دو گھنے بعد نواب صاحب کی طبیعت کچھ سنبھلی، لیکن اب وہ ایک ہمارے ہوئے جواری کی طرح خاموش بیٹھے رہے۔ رحیم نے دھیرے دھیرے ساری بات ہمول دی کہ نواب خاتون کے دل میں یہ خناس آج کا نہیں بلکہ برسوں پرانا ہے جب ان کے شوہر یعنی نواب صاحب کے بڑے بھائی نواب امیرالملک کا ایک حادثے میں انتقال ہوا تھا۔ دونوں بھائی شکار کے لیے گھر سے نکلے اور پھر بھوپال کے جنگلات میں سے ان دو میں سے ایک بھائی ہی واپس گھر پہنچا تھا۔ کہتے ہیں کہ اوپری مچان کا عین شیر کے حملے کے وقت ٹوٹ جانا اور بڑے بھائی کا زمین پر گر جانا اس حادثے کا باعث بن گیا تھا۔ اس وقت رحیم کا باپ جوان دو بھائیوں کی فیجری کرتا تھا وہ بھی اپنے بڑے مالک کو بچانے کے لیے نیچے کو دیکھا اگر افسوس دونوں میں سے کوئی نہیں فیض پایا۔ جنگل سے دو لاشیں گھر پہنچیں تو ایک کھرام مجھ گیا۔ تین دن تک تو نواب خاتون کو کوئی ہوش ہی نہیں تھا۔ پھر نہ جانے کس بد خواہ نے ان کے کان میں یہ بات ڈال دی کہ بھائی کی مدد و فیجر کے بجائے چھوٹا بھائی کیوں نہیں کو د۔ رفتہ رفتہ یہ سوال ان کے اندر پک پک کرنا سور بنتا چلا گیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ دولت، جائیداد اور جاگیر کی خاطر چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی کو مار ڈالا، اور پھر نواب خاتون نے اپنے اس خود ساختہ یقین کے سہارے نواب دھیر اور ان کے پورے خاندان سے انتقام لینے کی تھیں لی۔ گھر کے اندر دونوں بھائیوں میں سدا کے لیے بچوٹ ڈال کر انہوں نے ہر طرح سے گھر کا سکون ہمیشہ کے لیے بر باد کیے رکھا لیکن ایک عورت ہونے کی وجہ سے ان کی بھی کچھ مجبوریاں تھیں لہذا انہوں نے رحیم کو اپنے ساتھ ملانے کا منصوبہ بنایا۔ رحیم کا باپ بھی اس حادثے میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا اور رحیم کو اسی کے باپ کی وفاداری کے صلے میں فیجر کی نوکری دی گئی تھی، لیکن نواب خاتون نے رحیم کے دل میں شک کا شیج بودیا کہ وہ دونوں کسی حادثے میں نہیں بلکہ با قاعدہ ایک منسوبے کے تحت موت کے لگھات اتارے گئے تھے، اور پھر آخر کار شک کا وہ کڑواز ہر رحیم کی رگوں میں بھی پھیلتا چلا گیا کہ اس کے باپ کا قاتل بھی نواب دھیر ہی ہے۔ لہذا اس نے نواب خاتون کا ساتھ دینے کی ہامی بھر لی۔ تب سے اب تک وہ نواب پر تقریباً سات وار کر چکا تھا اگر نواب کی تقدیر ہمیشہ نواب خاتون کی تدبیر کے آڑ سے آتی رہی اور آج آخر کار اس کا ہمان بھی ہمارے سامنے تھا۔

رحیم بات ختم کر کے سر گھٹنوں میں دیے بیٹھا رہتا ہا۔ نواب صاحب نے ہم سے درخواست کی کہ وہ کچھ دیر کے لیے تہارہ تھا چاہتے ہیں لہذا ہم اب اپنے کمروں میں جا کر آرام کریں اور انہیں تنہا چھوڑ دیں۔ رحیم سے انہوں نے بس اتنا کہا کہ وہ آزاد ہے۔ جہاں جانا چاہے جا سکتا ہے۔ ہمارے کمرے سے نکلنے کے بعد انہوں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ پاشا صاحب ان کی ہنی حالت کے مذکور بہت سے شکو و شبہات کا شکار تھے۔ خود میرے دل میں بھی صبح تک عجیب عجیب وسو سے آتے رہے اور پھر دس بجے شین تیزی سے بھاگتا ہوا میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

”وہ نواب صاحب..... نواب صاحب.....“ میں گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔  
”کیا ہو نواب صاحب کو.....“



## کتاب گھر کی پیشکش

### باب 24، 25

چند لمحے کے لیے تو مجھے یوں لگا کہ میرے سارے حواس ہی معطل ہو چکے ہیں۔ میں نے شہین کوڈائیا ”بولتے کیوں نہیں؟“ نواب صاحب تھیک تو ہیں نا.....!“ شہین نے اپنی سانس درست کی ”کیا کہوں کہ تھیک ہیں بھی یا نہیں۔ لگتا ہے ساری رات کسی شدید کرب میں روتے رہے ہیں۔ انہوں نے حویلی کے زنانے اور مردانے کے بھی لوگوں کو بڑے دالان میں جمع کرنے کا کہا ہے مجھے۔ سچ۔ آج تو مجھے ان سے شدید خوف محسوس ہو رہا ہے.....“ شہین مجھے اطلاع دے کر باقی لوگوں کو بلا نے کے لیے الٹے پاؤں دوڑ گیا۔ نواب صاحب نے حویلی کے بھی افراد کو ایک ساتھ کیوں طلب کیا ہے؟..... میں یہی سوچتے ہوئے کچھ دیر بعد زمرد حویلی کے مرکزی دالان میں پہنچا تو فضہ، خانم، نواب کے بیٹوں سمیت حویلی کا ہر فرد چھوٹے بڑے سمجھی ملازم، نواز اور اس کا عملہ، حتیٰ کہ دربان بھی وہاں موجود تھے۔ ایک جانب رحیم بھی گم سما کھڑا تھا۔ اس نے نواب کی پیش کے باوجود فرار کی راہ اختیار نہیں کی تھی۔ کہتے ہیں انسان کا سب سے بڑا فرار خود اس کے اندر لگا آئینے سے او جھل ہونا ہوتا ہے۔ اگر کوئی اس آئینے سے نہ چھپ سکے تو پھر دنیا کے سمجھی فرار بس برائے نام ہیں۔ کوئی چھپنے کی کوشش کرے تو خود سے چھپے ورنہ خود کو تھکانا لاحصل ہے، اور پھر کچھ دیر بعد نواب خاتون بھی سُتھے ہوئے چہرے اور سوچی ہوئی سرخ آنکھوں کے ساتھ وہاں آگئیں۔ ان کی آمد پر حسب معمول نواب دیر سمیت حویلی کے ہر فرد نے انہیں اٹھ کر تعظیم دی۔ نواب خاتون کی وہ دو مخصوص خادماں میں جو ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتی تھیں آج بھی ان کے پیچے دامیں بامیں موجود تھیں مطلب ان سے ابھی تک ”مراعات“ واپس نہیں لی گئیں تھیں، لیکن نواب خاتون کا چہرہ بتارہا تھا کہ انہیں رحیم کے ذریعے ساری بات کھل جانے کی اطلاع مل چکی ہے لیکن میں نے آج بھی نواب صاحب کو ان کی تعظیم کے لیے اٹھتے دیکھا تو مجھے ریت رواجوں میں بندھے اس شخص کے لیے خود اپنے دل میں بڑی قدر محسوس ہوئی۔ نواب دیر واقعی ایک اعلیٰ ظرف انسان تھے۔

نواب صاحب نے کچھ دیر تک سب کے بیٹھ جانے کا انتظار کیا۔ پھر انہوں نے پاشا صاحب کو تمہید باندھنے کا اشارہ کیا۔ پاشا صاحب اٹھ کر نواب صاحب کے ساتھ سب کے سامنے جا کھڑے ہوئے ”آج چندایسی باتیں آپ لوگوں کے علم میں آئیں گی جس سے آپ میں سے کوئی بھی پہلے واقف نہیں تھا۔ دراصل کچھ عرصے سے نواب صاحب کی زندگی کو شدید خطرات لائق ہو گئے تھے۔ کوئی ان دیکھا دمن نواب صاحب کی زندگی کے درپے تھا اور وہ جتنے بھی حادثے آج تک اس حویلی میں اتفاق ہے کبھے گئے تھے وہ سب کے سب اس اجنبی قاتل کی نواب صاحب کی جان لینے کی کوششیں تھیں۔“ سارے مجھے کو جیسے سانپ سا سونگھا گیا اور پھر بھی نے سر گوشیوں میں ایک دوسرے سے کچھ پوچھنا شروع کر دیا۔ خانم پریشانی میں اپنی جگہ کھڑی ہو گئیں۔ ”نواب صاحب۔ یہ سب کیا ہے۔ یہ پاشا صاحب کیا کہہ رہے ہیں.....؟“ نواب صاحب نے خانم سے بیٹھ جانے کی درخواست کی۔ پاشا صاحب نے اپنی بات جاری رکھی۔

”آپ سب کو پہلے اس حقیقت سے اس لیے آگاہ نہیں کیا گیا کیونکہ نواب صاحب اس بات کی تشریف اور حویلی کی بدنامی کو روکنا چاہتے تھے

اور پھر شروع میں تو خود نواب صاحب بھی اس بات سے لاعلم تھے کہ یہ سب کچھ باقاعدہ کسی منصوبے کے تحت کیا جا رہا ہے، لیکن تیرے حادثے کے بعد ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ لہذا نواب صاحب اپنے طور پر محتاط تو ہو گئے لیکن وہ انجانادشمن وار کرنے سے نہیں رکا۔ لہذا میں نے اور نواب صاحب نے طے کیا کہ ہمیں پولیس یا کوتولی کو درمیان میں ڈالے بنائیں دشمن کو کھو جانا ہو گا تاکہ گھر کی بات گھر میں ہی رہے اور باہر کوئی نئی داستان نہ بن پائے۔ اس کام کے لیے ہم نے زیر میں دنیا سے رابطہ کیا اور ایک مہربان کی وساطت سے آیاں میاں کو فضہ پیٹا کے اتا لیق کے روپ میں حوالی میں مدعو کیا گیا، لیکن وہ دراصل نواب صاحب کی جان کے دشمن کے خاتمے کے لیے یہاں بلاعے گئے تھے.....” اس لمحے میں نے فضہ کے چہرے پر بہت سے رنگ آ کر جاتے دیکھے۔ اس نے کچھ ایسی نظر سے میری طرف دیکھا جس کا بیان ممکن نہیں..... پاشا صاحب فضہ کے دل کی حالت سے بے خبر ہوتے رہے۔

”اور پھر آخر کار کل رات آیاں کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو ہی گئی۔ انہوں نے اپنی جان پر کھیل کر اور خود نواب صاحب کی خواب گاہ میں اپنے آپ کو شکار کے لیے پیش کر دیا اور وہ انجانادشمن اس وقت رحیم کی صورت میں آپ کے سامنے موجود ہے۔“ سب ہی کی نفرت بھری نگاہیں رحیم پر نکل گئیں۔ نواز کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسی وقت رحیم سے وہیں سارے حساب بے باک کر لے۔ پاشا صاحب نے رحیم کی سنائی ہوئی داستان ایک بار پھر سے سب کو سنا دی کہ اس دشمنی کی ابتداء بھوپال کے حادثے سے ہوئی اور اس کا انجام کل رات نواب گاہ میں کیسے ہوا۔ اس تمام عرصے کے دوران نواب خاتون بالکل خاموش اور ساکتی بیٹھی رہیں۔ پاشا صاحب نے اپنی بات ختم کی تو بہت دیر تک ماحول پر خاموشی چھائی رہی۔ نواب صاحب خوبی مضمحل سے کھڑے تھے جیسے ان کا دل مردہ ہو چکا ہو۔ انہوں نے پاشا صاحب کو اشارہ کیا اور پاشا صاحب نے دوبارہ کلام کا سلسلہ جوڑا۔ ”جس حادثے پر قتل کا شک کیا جا رہا ہے اس کا ایک عینی گواہ جو بھوپال کے جنگل میں اس شکار کے دوران بڑے نواب یعنی نواب خاتون کے شوہر نواب امیر الملک کا سب سے قابل اعتماد ساتھی بھی تھا اور نواب امیر الملک کے دائیں بازو کے طور پر مشہور تھا۔ اس کا نام اکبر ہے۔ جسے نواب صاحب نے راتوں رات اپنی خصوصی گاڑی بھیج کر یہاں سے تین گھنٹے دور کی مسافت پر اس کے قبیلے سے بلوایا تھا اور وہ اب سے کچھ دیر پہلے ہی یہاں پہنچا ہے۔“ پاشا کے اشارے پر نواز نے اپنے عقب میں کھڑے ایک بہت ضعیف شخص کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ اکبر کو دیکھ کر پہلی مرتبہ نواب خاتون کے چہرے پر حیرت اور یاد ماضی کے کچھ آثار نمودار ہوئے۔ اکبر سلام کر کے ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ پاشا نے کہا ”اس روز بھوپال کے جنگل میں جو کچھ بیتا اکبر نے خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور آج آپ کے سامنے وہ پھر سے وہی سب بیان کرے گا۔ یاد رہے کہ یہی وہ اکبر ہے جس پر نواب امیر اس قدر بھروسہ کرتے تھے کہ ان کی خواب گاہ کی ایک کنجی ہمیشہ اکبر کے پاس رہتی تھی۔ اکبر وقدم آگے بڑھ آیا اور اس نے کاپتی ہوئی آواز میں اس شام کا ذکر چھیڑ دیا۔ مچان خود اکبر نے جنگل کے دیگر شکاری کارندوں کے ساتھ مل کر بندھوائی تھی اور اس کے ٹوٹنے کی بات درست نہیں تھی۔ دراصل نواب امیر نشانہ لینے کے لیے خود خطرناک حد تک آگے کو جھکے ہوئے تھے اور کنارے کی لکڑی اتنا بوجھ سہارنہ کی اور جی کر علیحدہ ہو گئی۔ ٹھیک اسی لمحے شیر کا حملہ ہوا اور رحیم کا باپ جو اسی مچان پر موجود تھا اپنے مالک کی مدد کے لیے نیچے کو دیکھا گیا نواب دیر کچھ فاصلے پر دوسری مچان میں بیٹھے تھے اور انہی کی گولی نے شیر کو گھائل ہو کر بجا گئے پر مجبور کر دیا تھا۔ نواب دیر نے نشانہ لینے اور گولی چلانے میں ایک پل کی دیر

بھی نہیں کی تھی لیکن تب تک وہ درندہ بڑے نواب دیر نے اپنے بھائی کا بہت خون دیکھ کر اپنے حواس نہیں کھوئے اور جس قدر جلد ممکن ہو سکتا انہیں اپنی پیٹھ پر لاد کر دور کیمپ میں کھڑی گاڑیوں تک پہنچ کیوں کہ گھنی جھاڑیوں اور درختوں کی وجہ سے گاڑی مچان تک نہیں پہنچ سکتی تھی لیکن لمبے راستے کی وجہ سے ہسپتال تک پہنچتے ان دونوں کا خون اس قدر زیادہ بہہ چکا تھا کہ یہ بعد میگرے دونوں مالک نوکرنے ہسپتال میں ہی جان ہار دی۔ اکبر نے اس غلط فہمی کو بھی دور کر دیا جو بڑے نواب کی موت کے بعد اس کی اچانک گم شدگی کی صورت میں افواہوں کا باعث بنی تھی۔ اس نے بتایا کہ بڑے نواب کے بعد اس کا دل ہی نہیں چاہا کہ وہ روزانہ اپنے مہربان مالک کی یادوں کو کریدنے کے لیے حولی آئے لہذا اس نے چھوٹے نواب سے اجازت لے کر خود کو اپنے قبے تک محدود کر لیا اور آج بھی وہ صرف اپنے مالک کے عزیزان از جان چھوٹے بھائی پر لگے الزم کو دھونے کے لیے اپنے گھر سے نکلا ہے۔

ساری بات آئینے کی طرح واضح ہو چکی تھی۔ نواب صاحب نے کچھ دیر یوقوف کیا اور پھر جب وہ بولے تو برسوں کے بیمار لگ رہے تھے۔ ”میں نے نواب خاتون کو ہی ہمیشہ اس حولی کا بڑا سمجھا ہے اور آج بھی وہی اس خاندان کی بڑی ہیں۔ کاش وہ اپنے دل کا یہ کائنات بھی مجھے بھی دکھا پاتیں تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ بہر حال دیر آئد، درست آئد۔ میں نے بھائی جان کی موت سے لے کر اب تک ان کے حصے کی ایک ایک پائی نواب خاتون کی خدمت میں ہی پیش کی ہے لیکن اگر وہ آج تک بھی سمجھتی رہیں کہ یہ سارا مکروہ کھیل ہی وراشت کا ہے تو آج میں نے ان کے نام یہ سادہ مختار نامہ (Power of Atrony) دستخط کر دیا ہے۔ وہ اس پر جو بھی چاہے بھر کر اپنے نام کر سکتی ہیں۔ میں نے یہ زمر دھولی بھی ان کے نام کر دی اور خود اگلے ماہ ایران منتقل ہو کر باقی ساری زندگی وہیں بسر کرنے کی تھیں لی ہے۔ رحیم کو میں نے پہلے ہی معاف کر دیا ہے وہ چاہے تو اسی حولی کے نیجر کے طور پر اپنی نوکری جاری رکھ سکتا ہے۔ میں نے نواب خاتون کو بھی معاف کیا اور ان سے بھی اپنے تمام حقوق بخشش کی انجام کرتا ہوں.....“

بات ختم کرتے کرتے نواب صاحب کی آنکھوں سے آنسو رواؤ ہو چکے تھے۔ پاشانے جلدی سے انہیں سنجا لایک کونے میں کھڑا رحیم بھی رو رہا تھا اور پھر میں نے شہین سمیت حولی کے بھی ملازمین کی آنکھوں کو بھیگتے ہوئے دیکھا۔ حیرت ہے وہ ایک شخص جو اپنے غلاموں کے دلوں میں بھی بستا تھا۔ خود اپنے ہی خون کی نظروں میں ساری عمر کے لیے معتوب ٹھہرا تھا۔

دفعۃ نواب خاتون اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔ ان کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ ان کی زبان سے صرف اتنا ہی نکلا ”دیر میں تو تم سے معافی مانگنے کے قابل بھی.....“ اور اگلے ہی لمحے نواب خاتون زمین پر ڈھنے چکی تھیں۔ ہم سب ان کی طرف دوڑے۔ نواب خاتون کے ہونٹ نیلے پڑھکے تھے۔ ہلکا سا بہتا کاف اس بات کی نشان دہی کر رہا تھا کہ شاید انہوں نے نواب صاحب کی جان لینے کے لیے جوز ہر بچار کھا تھا سے وہ یہاں آنے سے پہلے خود گھوول کر پی چکی تھیں۔ انتہائی عجلت میں انہیں شہر کے ہسپتال میں منتقل کیا گیا اور وہاں چند گھنٹوں بعد انہوں نے آنکھیں بھی کھو لیں، لیکن شاید یہ ان کے لیے قدرت کی جانب سے کفارے کے لیے دیا جانے والا آخری موقع تھا۔ انہوں نے اپنے سرہانے بیٹھنے نواب دیر سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی اور پھر ہمیشہ کے لیے آنکھیں موندھ لیں۔ زمر دھولی ایک بار پھر اجز گئی۔ نواب خاتون نے اس روز بڑے دالان میں آنے سے پہلے ہی زہر چکھ لیا تھا۔ انہیں شب تھا کہ نواب دیر بھی معاف نہیں کریں گے اور سارے زمانے میں ان کی رسوانی الگ ہو گی لہذا انہوں نے یہ آخری بازی مات

ہونے سے پہلے ہی اپنی زندگی کی بازی ہار جانے کا فیصلہ کر لیا۔ کاش وہ نواب صاحب کے ظرف کا تھوڑا سا بھی اندازہ کر لیتیں تو یہ سب کچھ نہ ہوتا، لیکن بات اگر ظرف کی شناخت کی ہی ہوتی تو وہ بھلانواب دیر کے خلاف اتنے سال تک اپنے دل میں یہ عداوت اور دشمنی ہی کیوں پالے رکھتیں؟.....

نواب خاتون کا تیرا بھی ہو گیا اور حولی کی وحشت اور ویرانی میں کوئی کمی نہیں ہو پائی۔ میں اب نواب صاحب سے اجازت لیتا چاہتا تھا کیونکہ میرا کام یہاں ختم ہو چکا تھا، لیکن اس سے پہلے مجھے اس مہ جبیں سے بھی معافی مانگنی تھی جس سے اپنی شناخت چھپانے کے جرم کا بوجھا ب مجھے کچلے جا رہا تھا، لیکن کوئی ایسا موقع یا بہانہ مجھے نہیں پایا کہ میں فضہ تک اپنا پیغام پہنچا سکوں۔ رحیم نہ جانے کہاں چلا گیا تھا اور حولی کے زیادہ تر فرائض اب نواز اور شہین کے کام ہوں پر آن پڑے تھے۔ اس رات کے واقعے کے بعد نواز اور حولی کے باقی بھی ملازمین کی نظرؤں میں حیرت کے ساتھ ساتھ میرے لیے ایک خاص احترام کی جھلک بھی واضح دکھائی دیتی تھی۔ جب سے انہیں یہ پتہ چلا تھا کہ میرا تعلق سارنگا کے اڈے سے ہے اور میں نواب صاحب کی حفاظت کی خاطر یہاں آیا تھا جب سے وہ میرا خصوصی خیال رکھنے لگے تھے۔ نواز دن میں تین چار بار سلام کرنے ضرور آتا تھا اور شہین نے تو جیسے میرے کمرے کی راہ ہی پکڑ لی تھی۔ ”آیاں میاں..... شہین کی نظر نے تو پہلے روز ہی بھانپ لیا تھا کہ آپ ضرور کسی خاص مقصد سے یہاں آئے ہیں..... آپ کی نگاہ کا تو میں پہلے دن سے معرف ہو گیا تھا جب آپ نے طاڑانہ جائزہ لیا تھا زمرد حولی کا..... آپ جانتے ہیں کہ جب سے رحیم پکڑا گیا ہے چاروں طرف آپ کے نام کی دھوم ہے حولی میں..... اور وہ کھڑوں نواز تو جیسے آپ کا مرید ہی ہو گیا ہے۔ کہتا ہے میں آیاں بھائی سے کچھ سیکھ کر ہی انہیں جانے دوں گا..... آخر آپ سارنگا کے اڈے کی شان جو ہو.....“ گویا اڈے کے ساتھ جزی شہرت یا بدناہی نے حولی میں بھی ذریہ جمالیا تھا۔ میں نے شہین ہی کے ذریعے فضہ کو پیغام بھجوانے کی ٹھان لی، لیکن براہ راست ملنے کے بجائے احتیاط خانم کو وسیلہ بنانے کا سوچ کر میں نے کاغذ پر فضہ کے لیے دو سطر میں لکھیں کہ میں کل اس حولی سے رخصت ہو رہا ہوں اور جانے سے پہلے اس سے ایک بار ملنا چاہتا ہوں۔ کاغذ کو لفانے میں ڈال کر میں نے شہین کے حوالے کیا کہ وہ اسے خانم کے ہاتھ میں دے آئے۔ میں جانتا تھا کہ خانم میرا پیغام فضہ تک ضرور پہنچائیں گی۔ اب میرا فضہ کے ساتھ ایسا کوئی تعلق نہیں رہ گیا تھا کہ میں زنان خانے میں اپنی مرضی سے جا سکتا۔ میری توقع کے مطابق خانم نے شہین کے ہاتھ ہی جوابی پیغام بھجوادیا کہ آج شام کی چائے میں ان لوگوں کے ساتھ زنان خانے میں ہی پہنچوں۔

چار بجے مجھے لینے کے لیے خانم کی خاص نوکرانی آگئی۔ زنان خانے کے درود یوار پر ایک عجیب سا سکوت طاری تھا۔ فضہ نہر کے قریب سنگ مرمر کی سلوں والی اپنی پسندیدہ جگہ پر موجود نہیں تھی۔ جانے اسے خانم نے میرے آنے کی اطلاع دی ہو گی یا نہیں.....؟..... خانم مرکزی ہال کے دروازے پر میرا انتظار کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ ہلکے سے مسکرا گئیں ”تم اپنے اندر حیرتوں کی اتنی زیادہ سوغات لیے، اتنے پر سکون کیسے رہ سکتے ہو..... جاؤ..... جا کر مل لو اس سے..... وہ اپنے کمرے میں ہی ہے..... میں چائے لگو اک تم دونوں کو اطلاع کر دوں گی۔ نواب صاحب کو بھی میں نے زبردستی مددوکر کھا ہے آج کی چائے کے لیے..... ورنہ انہوں نے تو اپنے کمرے سے لکھا ہی چھوڑ دیا ہے.....“ میں خانم کا شکر یہ ادا کر کے خادمہ کی سر برائی میں آگے بڑھنے لگا تو انہوں نے پیچھے سے مجھے آواز دی۔

”آیاں.....“ میں نے پلٹ کر انہیں دیکھا۔ ”میں تشكیر کے دو بول بول کر تمہارے احسان کا رتبہ کم نہیں کروں گی..... بس اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ زندگی کے کسی موڑ پر بھی یہ نہ بھولنا کہ اب ہم بھی تمہارے اپنوں میں سے ہیں۔ بس میں اپنا سمجھتا.....“

میں نے دھیرے سے مسکرا کر کہا ”یہ اعزاز مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ آپ بے فکر ہیں“ خادمہ نے راہداری کے کونے میں آخری کھلے دروازے کے جانب اشارہ کیا اور خود واپس پلٹ گئی۔ کمرے کے اندر چاروں جانب کھلی کھڑکیوں سے باہر ڈھلتے سورج کی روشنی نے عجیب زردی مائل سا جالا پھیلا رکھا تھا لیکن یہ پیلا ہٹ فضہ کے چہرے پر پھیلی زردی سے بہت کم تھی۔ کمرے کے فیلف کتابوں سے بھرے ہوئے اور گل دانوں میں بھرے پھول مر جھائے ہوئے لگ رہے تھے۔ شاید بہت دنوں سے ان پھولوں کو تبدیل نہیں کیا گیا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر ایران کے چند مشہور مصوروں کی بنائی ہوئی تصاویر بھی تھیں۔ ایک جانب پڑے ہوئے موسیقی کے جدید سسٹم (Audio system) کے قریب اردو اور فارسی کی غزلوں کی چند سسکس بھی نظر آ رہی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ فضہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہاں کی مشہور گلوکارہ گوگوش کو آج بھی ایران میں ایک دیوبی کی حیثیت حاصل ہے، لیکن فضہ اس وقت خود اداسی اور مطال کی ایک ایسی دیوبی کی طرح کھڑکی کے قریب کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔ جسے اس کا دیوبتا ہمیشہ کے لیے سنیاں کی سوغات دے کر پھر گیا ہو۔

میری آہٹ پر اس نے چونک کر پلٹ کر دیکھا اور جلدی سے خود کو سنبھالا۔ آج اس نے سر پر اسکارف نہیں باندھا ہوا تھا۔ بس ایک سیاہ شال تھی جو بار بار اس کے سر سے سرک جاتی تھی ”اوہ..... آپ آگئے معاف کیجئے گا۔ میں اپنے دھیان میں تھی..... آئیے..... بیٹھئے..... وہاں کیوں کھڑے ہیں.....؟“ میں ایک جانب کھڑکی کے سامنے بچھے صوفے پر بیٹھ گیا۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے جانے لفظوں کے کتنے انبار اپنے ذہن و دل میں جمع کر کھئے تھے، لیکن فضہ کے سامنے آتے ہی جیسے میں اپنی یادداشت ہی کھو بیٹھا تھا۔ میں نے خود کو جمیع کیا ”میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں.....“ فضہ سر جھکائے بیٹھی رہی ”جانتی ہوں لیکن اگر آپ اپنی شاخت چھپانے کے لیے کوئی معدرت کرنا چاہتے ہیں..... تو ایسا نہ کیجئے گا..... آپ نے اپنا فرض ہی تو پورا کیا ہے..... ہاں البتہ اگر آپ میرے اندر پھنسنے والی احتل پتھل کے لیے خود کو ذمہ دار سمجھتے ہیں تو میں بس اتنا ہی کہوں گی کہ یہ میری تقدیر میں تھا..... آپ اپنے دل کو بوجھل نہ کریں.....“ فضہ کی آواز لرز رہی تھی۔ وہ خود پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی لیکن اس کی آنکھیں اور آواز اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ ”میں جانتا ہوں میراجم بہت بڑا ہے..... لیکن مجھے اپنے منصب کے ظرف کی وسعت کا بھی خوب اندازہ ہے..... لہذا میں معدرت جیسے کم وزن لفظ استعمال کرنے نہیں آیا..... حق یہی ہے کہ میرا تعلق زیر زمین دنیا کے ایک بدنام اڑے سے ہے اور یہی میری شاخت ہے۔“ فضہ کچھ در خود کو سنبھالے رکھنے کی جدوجہد میں جتی رہی اور پھر اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر روپڑی ”کیوں آیاں..... کیوں.....؟..... کیوں کیا آپ نے میرے ساتھ ایسا.....؟..... اگر آپ مجھے بتا بھی دیتے تو کیا میرے ظرف پر آپ کو اتنا بھی بھروسہ نہیں تھا کہ میں یہ راز سنبھال پاتی.....“ میں اس کے یوں ایک دم روپڑنے سے بالکل حواس باختہ سا ہو گیا ”ارے ارے..... ایسے کیسے..... آپ اپنے قیمتی آنسو یوں تو نہ بھائیں..... چپ ہو جائیں..... مجھے بہت دکھ ہو گا اگر آپ ان موتیوں کو یوں ضائع کر دیں گی.....“ میرا دل چاہا کہ میں خود اپنی ہتھیلیوں میں اس خزانے کو جذب کر لوں۔ اس نے تڑپ کر میری جانب دیکھا ”اور مجھے جو دکھ ہوا ہے..... اس نقصان کی بھرپائی کیسے کریں گے

آپ.....؟” مجھے اس کے اس معصوم سوال نے لا جواب کر دیا ”واقعی اس نقصان کا ازالہ تو ناممکن ہے۔ میں تو آپ کے ایک آنسو کی قیمت بھی عمر بھر ادا نہیں کر پاؤں گا..... آپ چاند گلگر کی شہزادی ہیں اور میں ایک بے گھر بخارہ..... آوارہ..... مجھے اتنا قرض دارندہ کریں کہ میں خود کو بیچ کر بھی اسے ادا نہ کر سکوں۔“ فضہ نے اپنی زخمی نگاہ اٹھائی ”ایسا کیوں کہتے ہیں آپ..... آپ سے ان چند دنوں میں بہت کچھ سیکھا ہے میں نے..... مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کا تعلق کس گروہ یا قبیلے سے ہے۔ آپ وہ واحد انسان ہیں جن کی باقی سن کر فرہاد کی یاد کی کہکش میرے دل سے مت جاتی ہے۔ مجھے آج تک لگتا تھا کہ زندگی کا بس ایک ہی زاویہ ہے جو فرہاد کے فلمے نے میرے من کے اندر اجاگر کیا ہے، لیکن آپ سے مل کر اور آپ کے زندگی کے بارے میں نظریات جان کر میں نے اپنے اندر اک نئی فضہ کو جنم لیتے پایا تھا۔ مجھے بس یہی بات اندر سے کاٹے جا رہی ہے کہ آپ جیسا فرد یہ دو ہری شاخت کیسے رکھ سکتا ہے؟..... میں آپ کی کس پہچان کو حصی سمجھوں..... کسی انڈرولڈ مافیا سے جڑے ایک شخص کی یا پھر اس انسان کی جو مجھے چند دنوں میں بہت کچھ دے گیا.....؟ کیا آج تک آپ نے مجھ سے جو بھی پانواہ لفظ صرف ایک دکھاواتھے؟ اپنے فرض سے بندھے ایک شخص کی مجبوری تھے.....؟۔

”نہیں..... ایسا نہیں ہے..... ہاں میں اپنے فرض اور وعدے کے ہاتھوں مجبور ضرور تھا لیکن آپ سے مل کر تو میں نے خود اپنے اندر چھپے اک نئے آیاں کو ڈھونڈا ہے..... آپ سے ملاقات کسی اذے سے وابستہ شخص کی نہیں..... ایک نئے آیاں کی تھی..... جسے اپنی کم مائیگی اور آپ کی بیش قیمت کا خوب احساس ہے۔“

فضہ نے اپنی جھکی پلکیں اٹھائیں۔ ”نہیں..... وہ آیاں بھی بہت قیمتی ہے..... فضہ سے کہیں زیادہ بیش قیمت ہے، اور ان تین چار دنوں میں اس آیاں سے نہ مل کر مجھے احساس ہو رہا ہے جیسے وہ آیاں میری زندگی کا جزو بنتا جا رہا ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ فرہاد کے جانے کے بعد میرا دل اب کسی کے لیے یوں دھڑک نہیں پائے گا..... لیکن مجھے اعتراف کرنے دیں کہ اس رات لا بھری ہی سے جب میں اپنی زخمی کلائی لے کر واپس لوٹی تھی تو شاید خود کو ہیں لا بھری ہی کے دروازے پر ہی چھوڑ آئی تھی۔ شاید اسی رات کا یہ اثر ہے کہ میں اب تک کسی خواب کی کیفیت میں ہوں.....“ فضہ رو پڑی۔ ”آیاں..... مجھے ڈر ہے کہ میں کہیں آپ کی محبت میں نہ بتلا ہو جاؤں.....“



## باب 26 کتاب گھر کی پیشکش

میں گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے کچھ بولا نہیں گیا۔ میں اس بھولی اور مخصوص اڑکی کو یہ بھی نہ کہہ سکا کہ ایسے راز دل کی چار دیواری میں ہی قید رہیں تو اچھا ہے۔ کیونکہ من کی چوکھت پار کر جانے کے بعد یہ محترم باتیں بس ایک الزام بن کر رہ جاتی ہیں۔۔۔ تہمت بن کر زبان در زبان پھیل جاتی ہیں، اور میں اس عفت آب کے کورے دامن پر ایک ہلاکا سادھبہ بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ محبت جیسے الزام کا داع تو بہت بڑی بات تھی۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔۔۔ اسی غلطی نہ سمجھے گا۔ آپ جانتی ہیں کہ میں اُوے سے جزا ایک بدنام ہوں۔۔۔ جو کسی کی محبت کے قابل نہیں۔۔۔ محبت کے لیے معاشرے میں کسی کی عزت و رتبہ ضروری ہوتے ہیں۔۔۔ کسی مقام کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔ میں تو وہ ہوں جس کو دیکھ کر لوگ اپنی چوکھت بند کر دیتے ہیں۔۔۔ اپنی دلیز پر سیاہ لکیر پھیر دیتے ہیں تاکہ میرے بزر قدم اسے پار نہ کر جائیں۔۔۔“ بولتے بولتے میری آواز روہانی ہو گئی اور شاید میری آنکھوں کا کوئی کمزور بندھ ٹوٹ گیا۔ وہ ترپ کرائھی اور اس نے میری آنکھیں پونچھ ڈالیں ”آیاں۔۔۔ یہ کیا۔۔۔ نہیں ایسا نہیں کرتے۔۔۔“ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ شاید خود فضہ کو بھی اپنی اس بے اختیاری کا اور اک نہیں ہو سکا۔

باہر سے برخوں کی آواز آئی اور پھر خانم دو خادماوں کے ساتھ چائے کی ٹالی لیے کمرے میں آگئیں ”نواب صاحب بھی یہیں آرہے ہیں۔۔۔ باہر بہت خنکی ہو گئی ہے۔۔۔ کچھ ہی دیر میں نواب بھی آگئے اور ہم سب نے فضہ کے کمرے کی کھڑکی کے پاس ہی چائے پی۔ باہر بلکل ہی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی اور تیز سر دہاؤں کے شور اور زور سے والان کے بلند وبالا درختوں کے پتے ٹوٹ کر فضا میں بکھرنے لگے تھے۔ میں انہی بکھرے پتوں پر چلتا ہوا شام ڈھلنے مردان خانے میں واپس پہنچا تو میرا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ لوگوں کے لیے وہ باہر بہتی بارش کا پانی تھا جس نے میرے گال بھگو دیے تھے اچھا ہی ہے کہ قدرت نے بارش کے پانی یا آنسوؤں میں سے کسی ایک کارگ ک جدا تخلیق نہیں کیا تھا ورنہ شاید میرے لیے جواب دینا مشکل ہو جاتا۔ کاش سمجھی رونے والوں کے سروں پر کوئی بادل آکر برس جایا کرتا تو ہم میں سے بہتلوں کا بھرم باقی رہ جاتا۔ میں نے کمرے میں پڑے تو لیے سے اپنا چہرہ پونچھ لیا۔ ہر آنسو کی قسمت میں کسی ناز نہیں کی ہتھیلی کا گداز نہیں ہوا کرتا۔

رات گئے میرے اندر کی ہل چل نے بخار کی صورت اختیار کر لی اور صبح تک میرا جسم شدید تپ سے پھکنے لگا۔ ہمیں نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو گھبرا کر واپس دوزا اور پھر نواب صاحب اور ڈاکٹر سمیت ہی واپس لوٹا۔ میں نے بڑی مشکل سے ان سب کو یقین دلایا کہ شاید رات کو سردی لگ گئی ہو۔۔۔ لیکن اب میں بالکل ٹھیک ہوں، لیکن ڈاکٹر کب بھلامری پس کی سنتے ہیں۔ سواس ڈاکٹر نے بھی مٹھی بھر کڑوی گولیاں اور چند سیر پر میرے حلق سے نیچے اندھیل دیے۔ مجھے بچپن سے ہی ان کڑوی داؤں اور گولیوں سے شدید چڑھتی، لیکن جب انسان کا نصیب ہی کڑوا ہو تو پھر ان دنیاوی کڑواہشوں سے کیسا گلہ۔۔۔؟

اپنے پروگرام کے مطابق مجھے آج شام زمر دھولی سے رخصت ہو جانا چاہئے تھا مگر اس بخار نے مجھے شام ڈھلنے تک بے سدھ کیے رکھا اور پھر

شام کو نواب صاحب نے با قاعدہ حکم صادر کر دیا کہ طبیعت سنجھنے تک میں واپسی کی سوچ بھی دل سے نکال دوں۔ میں موی کو واپسی کا پیغام بھجوا پچھا کتا تھا اور اگلے روز میں بستر پر پڑا۔ اسی شش و پنج میں بنتا تھا کہ یعقوب مینشن میں بھی میرا انتظار کرتے ہوں گے۔ سہ پہر بارہ بجے کا وقت تھا جب اچانک ہی حوصلی کے پورچ میں چند گاڑیوں کے درکنے اور پھر زور دوسرے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی، اور پھر سب سے پہلے نواب صاحب میرے کمرے میں داخل ہوئے۔

”لو بھی..... تمہیں بہت فکر تھی ناپہنچنے انتظار کرنے والوں کی..... تو تمہارا انتظار بھی ختم ہوا.....“ اور پھر نواب صاحب کے عقب میں سب سے پہلے مجھے موی کی جھلک نظر آئی۔ میں حیرت اور خوشی سے انٹھ کر بیٹھا ہی تھا کہ اس کے پیچھے اسماعیل اور پھر خود سارنگا بھی مجھے کمرے میں داخل ہوتے نظر آئے۔ میں موی سے گلے کر رہتا تو رنگا نے بھیجن کر مجھے سینے سے لگا لیا۔ ”کہاں رہ گیا تھا تو ساجن..... تو نے تو سب کو اداس ہی کر ڈالا.....“ موی نے مجھے چھکی دی ”رنگا بھائی..... ہمارے شہزادے نے ہماری لاج رکھ لی..... جس کام کے لیے یہاں آیا..... وہ اس نے کر دکھایا.....“ سارنگا نے ہنس کر موی سے کہا ”ہاں رے..... آخر شاگرد کس کا ہے..... یہی کہلوانا چاہتا تھا تو تو میری زبان سے.....“ سب ہنس پڑے۔ میں اب تک حیران تھا ”لیکن آپ سب لوگ..... اچانک یہاں..... کیسے.....“

”بس تیرے بغیر دل نہیں لگا تو ہم تجھے لینے چلے آئے۔ نواب صاحب نے تیری بیماری کی اطلاع پہنچا دی تھی..... ابھی کوئی اور بھی ہے جس کا دل تیرے بنا نہیں گلتا..... اس کی سواری بھی بس آتی ہی ہوگی.....“ میں نے چونک کر سارنگا کو دیکھا، اور کون مجھے سے ملنے یہاں تک آسکتا تھا بھلا.....؟؟ اور پھر پورچ میں کسی تیسری گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی اور چند لمحوں میں جو چھرہ دروازے پر نمودار ہوا اس نے مجھے حیرت اور خوشی کا ایک مزید جھٹکا دیا۔ وہ ناہید تھی ”آیاں بھائی..... آپ یہاں چھپے بیٹھے ہیں..... لیکن دیکھ لیں..... آپ کی بہن نے آخر آپ کو ڈھونڈ نکالا.....“

”ارے بیلی..... تم بھی یہیں موجود ہو..... بچ ہے بلیوں سے چھپنا بڑا مشکل کام ہے.....“ ناہید کچھ روہانی سی ہو گئی ”پورا ایک مہینہ ہو گیا ہے آپ کو گئے ہوئے..... کوئی ایسا کرتا ہے اپنی بہنوں کے ساتھ.....“ خود میری آنکھیں بھی نہ ہونے لگی تھیں اب میں اسے کیا بتاتا کہ میں ایسے کتنے قسمی رشتے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ سارنگا نے اسے شانے سے کپڑا کر بھیجن لیا ”چل ری..... اب تو مل گیانا تجھے تیرا بھائی..... اب کا ہے کو اپنی جان ہکان کرتی ہے.....“ میں نے ناہید کے سامنے کان کپڑے ”چلو..... اب کی بار معاف کرو..... پھر بھی ایسا ہوا تو جو چور کی سزا وہ تمہارے بھیا کی.....“ ناہید نہیں پڑی۔ نواب صاحب نے سارنگا کی لاکھ منتوں کے باوجود انہیں اسی روز واپسی سے روک لیا۔ ایک بہانہ میری بیماری بھی تھی اور دوسرا یہ کہ سارنگا پہلی مرتبہ زمر دھولی میں آیا تھا۔ اس لیے نواب صاحب کی مہمان داری کا مزہ چکھے بنالے سے بھلا کون یہاں سے جانے دیتا۔

دو پہر کے کھانے پر نواب صاحب نے خصوصی طور پر خانم اور فضہ کو بھی مردانے میں مدد کیا ہوا تھا۔ خانم حیرت سے اس دوسری دنیا کے لوگوں کو دیکھتی رہیں اور فضہ اور ناہید آپس میں نہ جانے کیا سرگوشیاں کرتی رہیں۔ شاید دنیا کی ہر عورت عالم ارواح سے ہی دوسری عورت کی سیکلی ہوتی ہے۔ شرط صرف دنیا میں ملاقات کی ہے۔ خانم نے بھی ناہید کو ڈھیر سارا پیار کیا اور اسے بتایا کہ اس کا بھیا آیاں اب ان کا بیٹا بھی ہے لہذا اس ناطے سے اب وہ ناہید کی ماں ہوئیں۔ ناہید تو پہلے ہی اتنے سارے نئے رشتے دیکھ کر خوشی سے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ کھانے کے بعد عورتیں زنان خانے کی جانب چلی گئیں۔

ہم سب مرکزی ہال میں آ کر بیٹھے گئے اور ایرانی بزرگوے کے کئی دور چلتے رہے۔ رنگا کو اس قہوے کا ذائقہ بہت بھلا محسوس ہوا اور اس نے نواب صاحب سے یہ چائے ایران سے منگوانے کی فرماش بھی کر دی۔ نواب صاحب نے رنگا کو بتایا کہ حولی کے گوداموں میں چائے کی وافر مقدار موجود ہے جو کل صبح ہی یعقوب مینشن منتقل کر دی جائے گی۔ یونہی ادھر ادھر کی باتیں چلتی رہیں لیکن سارنگا نے رحیم شیر کا موضوع چھیڑنے سے جان بوجہ کراحتراز کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس موضوع سے نواب صاحب کے بہت سے دبے درد پھر سے ابھر آئیں گے۔ وہ نواب خاتون کی اس ناگہانی موت کے صدمے سے ابھی تک باہر نہیں نکل پائے تھے۔ عصر کے بعد ہم سب چہل قدمی کرتے ہوئے باہر دالان میں نہروالی طرف نکل آئے اور شہین نے جھٹ پٹ وہیں ہم سب کے لیے کریاں ڈلوا دیں۔ چھتری کی ضرورت تو یوں بھی نہیں تھی کیونکہ دھوپ کی نرم گرم ماہیت بھلی لگ رہی تھی۔ نواب صاحب نے چکے سے پاشا کونہ جانے کیا اشارہ کیا کہ وہ غیر محسوس طریقے سے کچھ دیر کے لیے مخالف سے غالب ہو گئے، اور پھر واپس لوٹے تو درمیانے سائز سے ذرا بڑا بریف کیس ان کے ہاتھ میں تھا۔ جسے انہوں نے نواب صاحب کے کہنے پر ایک طرف رکھ دیا۔ نواب دیر نے اپنے لفظ جوڑے۔

”سارنگا بھائی..... میں جانتا ہوں کہ آپ کے کسی ایک احسان کی قیمت بھی میں اپنی ساری زندگی لانا کر بھی ادا نہیں کر پاؤں گا..... لیکن اگر آپ برانہ مانیں تو یہ کچھ.....“

رنگا نے ہاتھ اٹھا کر نواب صاحب کی بات کاٹ دی۔ ”بڑے صاحب..... مارنا ہے تو جوتے سے مارلو..... لیکن یہ نوٹوں کا تھیڑر رنگا کونہ مارو..... بولو تو ہم ابھی یہاں سے اٹھ جاتے ہیں..... کیا آپ نے رنگا کو میں اتنا ہی سمجھا ہے.....“

نواب صاحب گھبرا گئے ”نہیں نہیں..... خدا نخواستہ میری ایسی مجال کہاں..... میں جانتا ہوں کہ یہ کاغذ کے چند لکڑے آپ کے لیے کتنے حقیر ہوں گے..... لیکن دنیا کی ایک ریت بھی تو ہے نا.....“

”دنیا کی ساری ریتی اور سب رواج ہم نے آپ کی حولی پر حاضری دے کر اور یہاں آپ کا نمک کھا کر پورے کر دیے ہیں..... ہاں اگر آپ کو اب بھی کوئی شک ہے تو اس بجانب سے پوچھ لیتے ہیں.....“ سارنگا نے میری جانب دیکھا ”کیوں رے..... کیا تجھے چاہیے یہ بکسا؟..... کیا تو اسی کے لیے یہاں آیا تھا؟“ میں گڑ بڑا سا گیا ”مجھے..... نہیں تو..... میں بھلا کیا کروں گا اس کا.....؟“ موی اور سارنگا دونوں ہی میری اس بوکھلا ہٹ پر ہنس پڑے۔

”دیکھا بڑے صاحب..... ہمارا سورما بھی نہیں چاہتا..... آپ ایسا کرو کہ اسے اپنی گڑیا بیٹیا کے سر سے وار کر صدقہ نیاز دے دو..... تاکہ حولی پر آتی بلا کسی بھی ہمیشہ کے لیے مل جائیں.....“

نواب صاحب کی آواز میں ممنونیت تھی۔ ”میں جانتا ہوں کہ میرا پالا کمال ظرف والوں سے پڑا ہے۔ میری گستاخی کو میری نادانی سمجھ کر معاف کر دیجئے گا.....“ بات آئی گئی ہو گئی اور نواب صاحب نے دوبارہ کسی معاوضے کی بات نہیں چھیڑی۔ رات کا کھانا مردانے اور زنانے میں الگ الگ چنا گیا البتہ کھانے کے بعد قہوے کے دور سے پہلے خانم، فضہ اور ناہید سمیت کچھ دیر کے لیے مردانے آئیں اور کچھ دیر بیٹھ کر پلٹ گئیں۔ فضہ شاید مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتی تھی لیکن ایسا کوئی موقع ہی نہیں مل سکا۔ مجھے بخار کی تھکن نے پھر سے ستانہ شروع کر دیا تھا جب کہ سارنگا، موی

اور نواب صاحب کا ابھی مزید محفل جمانے کا ارادہ تھا۔ میں ان سب سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ میرے ذہن میں بار بار اسی ناز آفریں کے آنسو اور بتیں کسی جھما کے کی طرح لپک جاتے تھے۔

میں آدھی رات تک بستر پر پڑا کروٹیں لیتا رہا۔ یہ محبت ہمیشہ انہی دلوں پر ڈاکہ کیوں مارتی ہے جہاں اگلے کے نصیب میں مقدر کی صرف خالی تجویاں ہی منہ چڑھتی ملتی ہیں۔ اسے یہ خوف تھا کہ کہیں اسے مجھ سے محبت نہ ہو جائے کتنی نادان تھی وہ جو یہ بھی نہیں جانتی کہ محبت ہمیشہ اپنے خوف سے پہلے دلوں میں ڈیرے ڈالتی ہے۔ یہاں کبھی کسی کامل جہاں نہیں ملتا۔ محبت کوئی جوئے کی بازی تو نہیں کہ ہر بازی کے بعد محبت کا جواری بھی یہی کہتا پھرے کہ چلو ”ایک محبت اور سہی.....“ یہ تو وہ بازی ہے جو ہر بار آخری بازی ہوتی ہے۔ جو اہوتا تو ایک بازی اور سہی کا کلیہ ہمیں ہر بار نیا داؤ کھینے پر مجبور کیے رکھتا اور شاید ہم بھی نہ کبھی اپنے من کی مراد کو جیت ہی لاتے، لیکن یہاں کے تو اصول ہی جدا تھے۔ فتحتہ مجھے ایک اور عجیب سا احساس بھی ہوا۔ فضہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے فرہاد کے سامنے کبھی اپنے جذبوں کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اگر وہ محبت ہی تھی تو پھر یہ کلیہ فضہ کی محبت پر کیوں لا گوئیں ہوا..... شاید دنیا کی ہر نئی محبت اپنی جگہ آپ بناتی ہے۔ کوئی بھی نئی محبت پھری محبت کے اثرات کوئی نہیں مناسکی نہ ہی اس کی جگہ لے سکتی ہے۔ شاید محبت کی مثال بھی بتتے پانی جیسی ہے جو ہر بار اپنا راستہ خود بناتا ہے، تو پھر میرے دل کی راہیں گھنا کے ساتھ ہی کیوں بند ہو گئی تھیں۔ اس کی ہر پگڑ مذہبی پر خاردار جھاڑیوں اور جنگلی گھاس کیوں اگ آئی تھی جس نے سبھی راستے اور ساری منزلوں کے نشان مناذ ا لے تھے..... صبح تک میرا بھار اتر گیا لیکن نواب صاحب نے ہمیں دوپھر کے کھانے کے بعد ہی روائی کی اجازت دی، لیکن قدرت ہمارے لیے کب واپسی کے راستے آسان اور کھلے چھوڑ کر رکھتی ہے۔ ہر قدم پر ایک نئی گھات، ایک نئی بیڑی ہمارے قدم روکنے کے لیے موجود ہوتی ہے۔

عصر کے وقت جب ہم حتی طور پر نواب صاحب سے رخصت ہونے کے لیے مرکزی دالان میں جمع تھے تو ماحول اداں تھا۔ خانم نے تاہید اور مجھ سے ہزار وعدے لیے کہاب ہم زمرد حوالی کی راہ نہیں بھلانیں گے اور آتے جاتے رہیں گے۔ فضہ صبح سے ہی کچھ خاموشی تھی۔ میں نے اسے ماحول میں واپس لانے کے لیے ٹوکا ”اور ہاں یاد رہے.....“ ابھی ہم دونوں پوری طرح اس بات پر متفق نہیں ہوئے کہ مغل آرکی ٹکری زیادہ بہتر ہے یا پھر ان کی اس دور کی مصوری..... یہ مدعایا بھی باقی ہے.....“ فضہ دھیرے سے مکائی ”ابھی بہت سے دوسرے مدعا بھی ادھورے تھے جنہیں چھوڑ کر آپ جا رہے ہیں.....“ میں نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور ابھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ حوالی کے مرکزی دروازے کی جانب سے ایک کڑک دار اور بھاری آواز ابھری ”ایسی بھی کیا جلدی ہے رنگا بھائی..... ہم سے ملے بنائی چلے جاؤ گے کیا.....؟.....“ سب نے چونک کر پلٹ کر دروازے کی جانب دیکھا۔ موئی کی زبان سے سرسراتی سی سرگوشی نکلی۔

” یہ تو کالی ہے..... یہ یہاں کیا کر رہا ہے.....؟“

کتاب گھر کی پیشکش

۲۷

# کتاب گھر کی پیشکش باب 27

میں نے آج تک کالی دادا کا صرف نام ہی سنا تھا، اور یہ جانتا تھا کہ زیرِ میں تقسیم کے اصول کے مطابق زمرِ حولی کا علاقہ کالی کے حصے ہی آتا ہے، لیکن وہ اس طرح اور اچانک یہاں حولی تک کیسے پہنچ گیا۔ یہ معہ ابھی تک حل طلب تھا۔ ہم سبھی دم بخود کھڑے تھے۔ کالی نے حولی کے دروازے کو دھکیلا اور اس کے عقب میں ہمیں اس کے دوسرا تھی اور دور کھڑی جیپ بھی نظر آئی۔ رنگانے بنا کسی مرعوبیت سے کہا ”تیری بن بلائے نے جانے کی عادت نہ گئی کالی..... یہ شریفوں کا گھر ہے..... یہاں منہ اٹھا کر اندر آنا منع ہے.....“

کالی نے طنزیہ لبھے میں جواب دیا ”واہ استاد..... شرافت کی بھی تم نے خوب کہی..... اگر یہ شریفوں کی جگہ ہے تو پھر رنگا اور مویٰ یہاں کیا رہ رہے ہیں.....؟“ نہ ہے تیرا کوئی نیا سورما بھی نہیں ہے اسی حولی میں ”کالی کی نظریں سب پر سے پھسلتی ہوئی مجھ پر آ کر نکل گئیں“ اچھا تو یہ ہے تیرا چھیار..... انو بھائی..... بڑا بانگا سپاہی ڈھونڈا ہے استاد“ سارنگا نے خواتین کی موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی آواز کو بڑی مشکل سے دھیما دھیما ”کام کی بات کر کالی..... اپنے پاس زیادہ وقت نہیں ہے.....؟“

کالی مسکرا یا ”پر اپنے پاس تو وقت ہی وقت ہے استاد..... تم چلے جاؤ..... ویسے بھی اپنا کام نواب صاحب کے ساتھ ہے..... کچھ لمبی باتیں

اب نواب صاحب کے غصے میں آنے کی باری تھی ”لیکن میں تمہیں نہیں جانتا..... تمہیں اندر آنے کی اجازت کس نے دی .....؟.....“  
”میں خود نہیں آیا نواب صاحب..... آپ کے بڑے بیٹے نے نیوتا بھیجا تھا مجھے بلانے کے لیے .....“ ہجوم میں سے وقار دو قدم آگے  
لاہ آیا ”انہیں میں نے بلا یا ہے ابا جان .....“ نواب صاحب گنگ سے رہ گئے ”لیکن کیوں .....؟.....“ وقار کی جگہ کالی نے جواب دیا ”میں بتا  
وں ..... آپ کا صاحب زادہ اپنا حق چاہتا ہے جو آپ اسے دے نہیں رہے ..... اسی لیے اسے ہماری مدد کی ضرورت پڑی ہے اور کالی کی سرکار نے اس  
یہ شدید حق داروں کو ان کا حق دلایا ہے۔ لہذا اب حوصلی اور جائیداد کا بٹوارہ کرہی دو تو بہتر ہے نواب صاحب .....“  
حوصلی کی خواتین اور ملازموں کی جانب سے دبی دبی سرگوشیاں ابھریں۔ معاملہ اتنا سیدھا نہیں تھا جتنا نظر آ رہا تھا۔ سارنگا کے اشارے پر  
نواب صاحب نے تاہید سمیت دیگر خواتین کو واپس زنانے میں جانے کا کہہ دیا۔ کچھ ہی دیر میں یہ عقدہ بھی کھل گیا کہ وقار نے اپنے اوباش دوست  
نہیں کے مشورے پر کالی کو اپنے حصے اور جائیداد کے بٹوارے کے لیے طلب کیا تھا۔ نواب خاتون کی وصیت اور موت بھی اس تاثر کو ادا کر کریں  
کر سکتی تھی۔ نواب صاحب سرپکڑے بیٹھے تھے اور پاشا صاحب انہیں تسلیاں دے رہے تھے۔ کچھ دیر میں رئیس بھی وہیں بھکٹا نظر آیا۔

رنگانے کا لی کو مخاطب کیا ”دیکھ کالی..... یہ باپ بیٹے کا جھگڑا ہے..... اس میں تو اپنی ناگز نہ تھی اڑا تو بہتر ہے.....“ کالی نے وقار کے گاندھے پر ہاتھ رکھا ”نہ رنگا استاد نہ..... ابھی تو میں نے تجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ میرے علاقے کے کسی گھر یہ لو جھگڑے میں تیرا یہ بانکا کہاں سے

ٹپک پڑا.....؟.....ابھی تو تیری پیشی اپنی کابینہ کے سامنے ہوئی باقی ہے.....اور تو جانتا ہے کہ کالی کے قدم ایک بار جس چوکھت کو پار کر جائیں.....وہاں کا قصہ نپٹا کر ہی پلٹتے ہیں.....نواب صاحب بنوارہ کر دیں تو کالی اپنا حصہ لے کر ابھی پلٹ جائے گا.....”  
رنگا کا پارہ چڑھ گیا ”کتنے میں سودا کیا ہے تجھے سے اس نواب زادے نے .....گدھ آخ ر گدھ ہی ہوتا ہے کالی .....حرام اور مردار خوری سے باز نہیں آتا.....”

<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com>

نواب صاحب کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی ”تم سے وقار نے جتنے کا وعدہ کیا ہے وہ میں تمہیں یونہی دینے کو تیار ہوں .....میں نہیں چاہتا کے حوالی کے جھگڑے باہر پکھری اور عدالتوں میں طے ہوں۔ تم اپنا معاوضہ اور واپس لوٹ جاؤ.....”

<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com>

کالی نے زہر خندان اداز میں نواب کو دیکھا ”ایسے کیسے واپس لوٹ جاؤ نواب صاحب .....اپنے وہندے کا اصول ہے کہ کام لے لو تو پورا کر کے ہی جاؤ.....ہاں اگر رسوائی کا ایسا ہی خوف ہے تو ٹھیک ہے ایک سودا کر لیتے ہیں۔ آپ یہ زمرد حوالی نواب زادے کے نام کرو اور رنگا استاد سے کہو کہ وہ اپنا علاقہ میرے حق میں خالی کر جائے .....پھر کچھ بات بن سکتی ہے .....بولو .....منظور ہے یہ سودا.....؟”

<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com>

کالی کی بات سن کر ماحول پر ایک سنا ناطاری ہو گیا۔ رنگا نے کالی پر ٹھڑکیا ”واہ رے کالی .....بل سے علاقہ نہ حاصل کر سکتا تو اب چھل پر اتر آیا .....پھر بھی خود کو استاد کہتا ہے .....تف ہے تیری مردانگی پر .....”

<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com>

کالی سکرایا ”استاد وہی ہوتا ہے جو ٹھیک وقت پر ٹھیک ہتھیار استعمال کرنا جانتا ہو .....چھل کے وقت چھل اور بل کے وقت بل .....ہر جگہ طاقت ہی کام نہیں آتی رنگا استاد .....میں تو کہتا ہوں تو بھی کچھ وقت میری صحبت میں گزار لے .....فائدہ ہو گا ”دفعۃ نواب کی آواز ابھری ”حوالی کا بنوارہ ہو بھی گیا تو یہ دو بھائیوں میں تقسیم ہو گی۔ ان کی سوتیلی بہن اور ماں پہلے ہی اپنے حصے سے دست بردار ہو چکی ہیں۔ اگر دونوں بھائی اس تقسیم کے لیے تیار ہیں تو ٹھیک ہے .....یہ کام بھی ہو جائے گا .....”چھوٹا بیٹا سجادا پنی جگہ پر ساکت کھڑا تھا۔ کہتے ہیں کہ شر میں سے بھی بھی خیر کا پہلو نکل آتا ہے، اور اس وقت یہ بات سچ ثابت ہوتی نظر آ رہی تھی۔ سجاد نے مجبور باپ کے ساتھ کا نندھا مالیا اور تن کر بولا ”مجھے کچھ نہیں چاہئے .....یہ فیصلہ اباجان کا ہو گا کہ وہ حوالی کا کیا انجام چاہتے ہیں۔ میں ہر صورت اباجان کے ساتھ ہوں .....”نواب کی آنکھیں بھرا آئیں۔ اس نے سجاد کے کانہ سے پر ہاتھ رکھ دیا ”کاش .....میرے دونوں بازوں آج میرے ساتھ ہوتے .....جیتے رہو سجاد بیٹا .....”کالی نے زور سے ایک تالی بجائی ”چلو جی .....یہ مسئلہ تحل ہوا۔

<http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com> <http://kitaabghar.com>

چلو نواب صاحب .....اب جلدی سے اسٹامپ پیپر اور قلم منگو اکر اس قصے کو ختم کرو .....میں اپنا حساب بعد میں نواب زادے سے خود کرلوں گا.....”

نواب صاحب نے لمبی اسی سانس بھری اور پاشا صاحب کو کچھ کہنے کے لیے مڑے .....لیکن ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی رنگا کی کڑک دار آواز گونجی .....”ٹھہر جا کالی بادشاہ ایسی بھی کیا جلدی ہے .....ابھی کچھ دری پہلے تو تجھے میرا علاقہ بھی بھیک میں چاہئے تھا، اتنی جلد صرف حوالی پر ہی راضی ہو گیا .....؟ ایک سودا تو نے پھینکا تھا۔ اب ایک سودا رنگا کا بھی سن لے .....یہ حوالی اور میرا علاقہ چاہئے تو فیصلہ چاقو کے بل پر ہو گا ..... تو مجھ سے نجی گیا تو میرا سارا علاقہ اور یہ حوالی تیرے نام ہو جائے گی اور اگر بازی میرے نام رہی تو پھر تجھے سے تیرا علاقہ تو جائے گا۔ ساتھ میں ہمیشہ کے لیے در بدر بھی ہو جائے گا .....بول منظور ہے رنگا کا یہ سودا.....”

زیریں میں دنیا کے اصول کے مطابق کالی کے پاس اس لکار کے جواب میں سوائے ہاں کرنے کے اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا کیونکہ اس کے بہت سے کارندوں کے سامنے رنگانے اسے چیلنج کیا تھا اور یہ بات اب چھپنے والی نہیں تھی۔ رنگانے بہت بڑا جواہر میں کافی صلہ کیا تھا کیونکہ چاقو پر گرفت کے معاملے میں کالی بھی رنگا سے بس انہیں بھی تھا اور کون جانے کے اس نے خود رنگا کو اسانے کے لیے یہ سارا کھیل کھیلا ہو، کیونکہ ان کی دنیا کے قانون کے مطابق ایک بار جب کوئی علاقہ کسی کے نام ہو جائے تو ہارے والا حریف کم از کم دوسال تک دوبارہ اسے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ دوسرا فریق خود اسے چیلنج نہ کر دے۔ رنگا کو کالی سے وہ علاقہ چھینے بھی صرف چھ ماہ ہی ہوئے تھے اور شاید کالی اس ہر زیست کو بھلانہیں پایا تھا اور کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا جب رنگا زوج ہو کر خود کالی کے مقابل آجائے۔ اگر زمرد ہو یہی کا قصہ درمیان میں نہ آتا تو شاید کالی کا یہ خوب بھی پورا نہ ہوتا، لیکن قدرت نے وقار کی نافرمانی کی صورت میں اسے یہ موقع جلد فراہم کر دیا۔ اچانک میری نظر اس سازش کے مرکزی کروار رنگیں کے چہرے پر پڑی، اور اس کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ اور کالی کے ساتھ ہوتے اشاروں نے مجھے یہ بھی باور کر دیا کہ رنگیں کو کسی سوچ سمجھے منصوبے کے تحت ہی نواب کے بڑے بیٹے پر دوستی کا جال چھیننے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ مطلب کالی کی نظر شروع سے ہی زمرد ہو یہی پر تھی جب میرے اور رنگا کے قدم بھی یہاں نہیں پڑے تھے۔ اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا کہ معاملہ آگے چل کر یہ کروٹ لے لے گا۔ اب جانے یہ ان کی بدستی تھی یا خوش قسمتی کہ سارنگا بھی اس معاملے میں ملوث ہو گیا تھا۔ کالی کے چہرے پر ایک آسودہ ہی مسکراہٹ ابھری جیسے اسے اپنا مقصد حل ہوتے نظر آ رہا ہو۔

”ٹھیک ہے رنگا استاد..... جیسے تمہاری مرضی..... آج ہی یہ خبر نیچے کے سب بڑوں تک چیلنج جائے گی..... تم دنگل کی تارخ اور جگہ طے کر لو.....“ رنگا نے سکون سے جواب دیا ”تارخ میں دیتا ہوں..... آج ہفتہ ہے..... اگلے ہفتے کے روز اسی وقت، جگہ بھی تمہاری اور علاقہ بھی تمہارا جا..... جا کر اپنی بربادی کی تیاری کر لے.....“

نواب صاحب پریشانی سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ان کی آواز میں سراسیمگی تھی ”رنگا بھائی آپ کو یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے..... آپ کے اس ہو یہی پر پہلے ہی کئی احسان ہیں اور میں خود یہ ہو یہی وقار کے نام کرنا چاہتا ہوں..... اب تو سجاد بھی اپنے حق سے دست بردار ہو گیا ہے..... کوئی ابھسن باقی نہیں رہی..... پھر آپ یہ سب کیوں .....“

رنگا نے نواب کی بات کاٹ دی ”ہمارے سامنے کوئی مردار خور آپ کی ہو یہی چھین کر لے جائے..... ایسا کیسے نواب صاحب..... اور پھر بعد میں وہ نواب زادے کے پاس ہی رہے گی اس کا آپ کو کیا پڑے.....؟.....؟.....“ اس کے اتنے حصے بخڑے ہوں گے کہ خود آپ کے بیٹے کے ہاتھ میں صرف وراثت کا گaudرہ جائے گا..... اب جو ہو گا، سو دیکھا جائے گا.....“ کالی اور وقار دونوں واپس جا چکے تھے۔ رنگا نے بھی پریشانی میں گھرے نواب سے رخصت چاہی اور اسے تسلی دے کر ہم ناہید کو لے کر شہراوٹ آئے۔ ناہید کے چہرے کارنگ بھی اڑا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں بتاری تھیں کہ وہ روتوں رہی ہے۔ موی اور سارنگا یعقوب میشن جا چکے تھے۔ میں اسماعیل کے ساتھ ناہید کو گھر اتارنے کے بعد واپسی کے لیے پلٹا تو ناہید نے آواز دے کر مجھے روک لیا ”آیاں بھیا.....“ میں جاتے جاتے رکا..... ”ہاں بولو.....؟.....“

ناہید کسی کش کمش کا شکار تھی ”آپ بابا کو یہ سب کرنے سے روک کیوں نہیں دیتے..... میرا دل اندر سے کانپ رہا ہے.....“ اس کی آواز روہانی ہو گئی۔ ”ارے ارے..... یہ کیا.....؟..... اتنے بہادر بابا کی بیٹی یوں پریشان ہو رہی ہے..... کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا.....“ ناہید روپڑی ” یہ

خوف آج کا نہیں ہے بھائی..... بچپن سے میں دن میں اس خوف اور ان وسوسوں کے ہاتھ سو بار مرتبی آئی ہوں اگر بابا کو کچھ ہو گیا تو میں جیتے جی زندہ درگور ہو جاؤں گی۔ میں اپنا ایک بھائی پہلے ہی کھو چکی ہوں۔ اب کوئی اور نقصان سہہ نہیں سکتی۔ میری آپ سے بھی یہی التجا ہے کہ اس اندر ہری دنیا کو چھوڑ دیں۔ جس کا اندر ہر انسان کا ہر رشتہ نگل جاتا ہے۔ میں آپ دونوں کے ہاتھ جوڑتی ہوں..... میری یہ اجتماعان لیں، ناہید واقعی ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ میں نے جلدی سے اس کے بندھے ہاتھ کھول دیے ”بہنیں ہاتھ نہیں جوڑتیں..... بس حکم دیا کرتی ہیں۔ میں اور تمہارے بابا..... شاید ہم دونوں ہی اپنی مرضی سے اس دنیا کا حصہ نہیں بنے..... ہمیں ہماری دنیا نے دھکیل کر ان اندر ہوں کا حصہ بنایا ہے..... لیکن اتنا یقین رکھو کہ تمہارے بابا اس کالی دنیا کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اندر سے بہت اجلے ہیں..... اپنے اوپر جھوٹ کی سفیدی کا ملمع چڑھائے ہوئے ظاہری دنیا کے ان منافقوں سے کہیں زیادہ سچے ہیں.....“

”میں جانتی ہوں..... اسی لیے تو زیادہ ڈرتی ہوں کہ ان کی دنیا میں ان جیسے طرف والے بہت کم ہیں اور اگر کسی کم ظرف نے انہیں کوئی نقصان پہنچا دیا تو میں جی نہیں پاؤں گی۔ وہ آپ کی بہت سنتے ہیں۔ آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ ان سے بات ضرور کریں گے.....“

”ٹھیک ہے..... وعدہ کرتا ہوں..... اور یہ وعدہ بھی کرتا ہوں کہ جب تک میں ان کے آس پاس ہوں کسی بھی خطرے کو مجھ سے ہو کران تک پہنچنا ہوگا۔ چلو اب تم یہ ادا سی پیر یہ ختم کر دو..... اور مجھے ہستے ہوئے رخصت کرو.....“

میں ناہید کو تسلی دے کر وہاں سے چلا تو آیا مگر خود میرا دل اندر سے انجان و سوسوں کا شکار تھا۔ یعقوب میشن میں کافی چہل پہل تھی۔ خبر عام ہو چکی تھی کہ ٹھیک چھوپن بعد رنگا اور کالی ایک بار پھر ایک دوسرے کے مقابل ہوں گے۔ بڑے احاطے میں سارنگا موی کے ساتھ مشق میں مصروف تھا۔ میں نے پہلی بار رنگا کے ہاتھ میں چاقو کی دھار کو بچل کی طرح اور ادھر پکتے دیکھتا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرا یا۔ ”آجا ساجن..... تو بھی کچھ ہاتھ صاف کر لے..... موی تو اب بوڑھا ہوتا جا رہا ہے۔“ میں نے بہت انکار کیا مگر موی نے اپنا چاقو میری طرف پھینک دیا اور خود دائرے سے باہر نکل گیا۔ احاطے کے بزرگ استادوں نے بھی موی کو بوڑھا دیا اور بھی اس شرارت میں شامل ہوتے چلے گئے، لیکن میں رنگا کے سامنے چاقو کیسے اٹھایتا؟ میں نے چاقو اس کے قدموں میں ڈال دیا۔ رنگا اب بھی مسکارہتا تھا ”جانتا ہوں تو میرے سامنے کھڑا نہیں ہونا چاہتا۔ پر مجھے ذرا دیر مشق تو کرو سکتا ہے نا..... ہر نیا حریف پچھلے کو کچھ نہ کچھ سکھا ہی جاتا ہے..... چل اب آجا.....“ میں نے تجھے اپنا خون معاف کیا۔“ میرے پاس اب کوئی چارہ باقی نہیں رہا تھا۔ مجبوراً میں نے رنگا کے قدموں میں پڑا چاقو اٹھا لیا، اور کرتے کی آستینش چڑھا کر دائرے میں آ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر تک میں اور رنگا ایک دوسرے کو نظر ہوں میں تو لتے رہے اور پھر رنگا نے تیزی سے چاقو دائیں سے باکیں ہاتھ میں منتقل کیا۔ میں نے اچانک ہی غیر ارادی طور پر چاقو کو یوں منتقل ہوتے دیکھ کر رنگا کی بائیں کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ شاید ہم میں سے کسی کو بھی مجھ سمت میری اس پیش رفت کا اندازہ نہیں تھا کیونکہ یہ انتہائی اقدام تھا۔ رنگا کو بھی مجھ سے اس پھرتی کی توقع ہرگز نہ تھی اور ایک لمحے کے لیے اس کی کلائی میرے پنجے کی مضبوط گرفت میں آ گئی لیکن تب تک رنگا کا چاقو میرے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہو چکا تھا۔ کچھ دیر کے لیے شور مچاتا مجمع یک دم ساکت سا ہو گیا۔ اب میرا دیاں ہاتھ اور چاقو آزاد تھا اور جو فون چاقو بازی سے واقف ہیں وہ یہ بات خوب جانتے ہیں کہ حریف کا چاقو والا ہاتھ قابو میں کر لینے کے بعد اگر دیاں ہاتھ وار کے لیے کھلا ہو تو یہ ایک بوس پوائنٹ مانا جاتا ہے، اور وار کرنے کی آزادی بازی ختم بھی کر سکتی ہے، لیکن میری گرفت صرف لحاظی ثابت ہوئی۔ رنگا نے لمحے کے

ہزاروں حصے میں میری چال سمجھ کر اپنی کلائی کو ایک زور دار جھٹکا دیا اور یہیں مجھ سے بنیادی غلطی ہو گئی۔ قاعدے کے مطابق مجھے فوراً ہی رنگا کے چاقو کے چاقو کی پہنچ سے دور ہو جانا چاہئے تھا، لیکن مجھے ایک پل کی دیر ہو گئی اور چاقو کے کھیل میں ایک پل ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اگلے ہی لمحے رنگا کے چاقو کی تیز دھار میرے بازو کو کلائی سے اوپر کھینچ تک چیرتی چلی گئی۔ خون کی ایک تیز پھوار نے رنگا کا چہرہ اور میرا سارا وجہ دیا۔ ایک شور سامچ گیارہ کانے چاقو پھینک کر اپنا کرتہ وامن سے پھاڑا اور جلدی سے میرے بازو پر باندھ کر خون روکنے کی کوشش کی۔ موی نے لپک کر قریب پڑی زہر کش دوا کا پرے میرے زخم پر کر دیا اور مجھے اپنے گھاؤ میں تیز مرچیں ہی بھرتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ سارنگا نے فوراً گاڑی نکلوائی اور موی اور دوسرے کارندوں سمیت مرہم پٹی کے لیے مجھے قربی کلینک لے جایا گیا۔ سبھی بے حد پریشان تھے لیکن رنگا اور موی کی بوکھلا ہٹ سب سے سو احتی۔ بڑی مشکل سے واپس پہنچ کر میں نے ان دونوں کو تسلی دی کہ میں اب کافی بہتر ہوں اور ہفتہ دس دن میں یہ گھاؤ بھی بھر ہی جائے گا۔ لیکن انہیں بھلامیری تسلی سے آرام کہاں نصیب ہو سکتا تھا۔ رنگا بار بار خود کو ملامت کر رہا تھا کہ اس نے مجھے دائرے میں اترنے پر مجبور ہی کیوں کیا۔ وہ بار بار کف افسوس مل رہا تھا ”بڑی بھول ہو گئی رے سنجاں..... پر تو نے تو پہلا داؤ ہی ایسا کھیل دیا تھا کہ آدمی جیت اپنے نام کر لی تھی۔ رنگا کی کلائی پر آج تک کسی نے ہاتھ ڈال کر پنج بند کرنے کی مہلت نہیں پائی..... پر تو نے تو مجھے جکڑ ہی لیا تھا۔ پرواپس پلنے میں دیری کیسے ہو گئی تجھ سے میں تو سمجھا تھا کہ اسی پھرتی سے تو با تھو واپس بھی کھنچ لے گا.....“

میں نے اسے تسلی دی ”آپ خود کو ہلکا نہ کریں۔ کھیل میں تو ایسا ہو ہی جاتا ہے..... اور پھر جب چاقو اٹھا ہی لیا تو پھر کاث سے کیا ڈر..... دھار کا تو کام ہی چیر دینا ہوتا ہے.....“

”ٹھیک کہتا ہے تو..... پر دھار اگر اپنوں کو چیر دے تو ایسی دھار کو پہلے سے کند کرنا ضروری ہوتا ہے.....“ میں نے غور سے سارنگا کی طرف دیکھا۔ ”دھار بھلا اپنے پرانے کا فرق کرنا کب جانتی ہے..... اپنے اگر ہاتھ روک بھی لیں تو پرانے کاٹ ڈالتے ہیں..... ہماری دنیا کا تو یہی اصول ہے تا.....“ میری بات سن کر رنگا اور موی دونوں ہی کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے۔ موی سے پہلے رنگا بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ ”لگتا ہے آج تو بھی لاڈلی کی زبان بول رہا ہے..... یہ اسی کی بولی ہے.....“ میں نے اقرار میں سر ہلا کیا اور رنگا کو ناہید کے سبھی وسوسوں اور پریشانیوں سے آگاہ کر دیا۔ جواب میں رنگا بہت دیر تک خاموش رہا۔

”تو نے اسے بتایا نہیں کہ یہ کافی دنیا ایک ایسی بند سرگ کی مانند ہے جہاں اندر آنے کے ہزار پرواپسی کا ایک بھی راستہ نہیں ہے۔ وہ بھولی یہ بھی نہیں جانتی کہ زور کی اس دنیا میں صرف زور آور ہی جیتا ہے۔ جو تھک کر قدم واپس موڑے اسے یہ خود مار ڈالتے ہیں،“ میں دھیرے سے بولا ”میں نے اسے یہ سب کچھ نہیں بتایا..... ابھی اس کے پاس ایک خواب باقی ہے کہ اس کا بابا بھی نہ کبھی اس دنیا سے لوٹ آئے گا۔ اگر میں یہ سب بتا کر اس کا یہ خواب بھی توڑ دیتا تو پھر شاید وہ بالکل ہی ہار جاتی۔ اس کے پاس یہ آس باقی رہنے دیں.....“

ماحول پر یا سیست طاری ہونے لگی۔ رنگا اور موی میرے کمرے سے باہر نکلے تورات آدمی سے زیادہ بیت چکی تھی، اور پھر دن اور رات آپس میں ملتے چلے گئے۔ میرا زخم تو ٹھیک نہ ہوا پر وہ دن آپنچا جب کالی اور رنگا کو شاید آخری بار ایک دوسرے کے مقابل آتا تھا۔



## کتاب گھر کی پیشکش

### باب 28

ہم سب اپنی اپنی جگہ گاڑیوں میں یعقوب مینشن سے نکلے تو مویٰ کچھ بجھا بجھا ساتھا۔ ہم سب زمرد حولی کے پیر و فی میدان کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔ میں نے مویٰ سے اس کے دھیسے پن کی وجہ پوچھی تو اسے کچھ الجھا ہوا ساپاپا۔ ”کچھ نہیں شہزادے..... رنگا استاد پچھلا پورا ہفتہ تیرے زخم کی پریشانی میں من لگا کر مش نہیں کر پاپا..... دراصل جب سے ناہید بٹیا جوان ہوئی ہے ویسے بھی اس کے اندر کا وہ رنگا کہیں کھو گیا ہے جو

اپنے شکار پر جھپٹ کر اسے پہلے ہی وار میں ادھیڑا لتا تھا۔ اب استاد صرف اس وقت وار کرتا ہے جب ضرورت ہوتی ہے..... اور کالی جیسے خبیث کے ساتھ مقابله کرتے وقت یہ دیری بہت نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے.....“ میں پریشانی سے مویٰ کی بات سنتا رہا۔ مویٰ کے کہنے کے مطابق چاقو کا بازی کے مقابلے میں انسان کے اندر مقابل کو مار دینے کی فطری جبلت (Instinct Killer) کا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اس کلرنسینکٹ کے

بغیر کوئی بھی اپنے مقابلے کے سامنے ادھورا پڑ جاتا ہے اور رنگا کے اندر سے یہ حیوانی جبلت بیٹی کے جوان ہونے کے ساتھ ساتھ تم ہوتی جا رہی تھی۔

اب وہ زیادہ تراپنا دفاع کر کے مقابلے کو لمبا کرتا ہے اور حریف کے تھک جانے پر اسے کم سے کم نقصان پہنچا کر زیر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر رنگا کا حریف کوئی عام چاقو باز ہوتا تو یہ سستی برداشت کی جاسکتی تھی لیکن آج اس کے مقابلے کا میں جیسا شاطر اور کائیاں حملہ آور تھا۔ مویٰ کو یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ خدا نخواستہ آج کوئی انہوں نہ ہو جائے۔ بقول اس کے جب رنگا نے کالی سے اس کا یہ علاقہ چھینا تھا تب بھی رنگا نے مقابلے بہت لمبا کھٹیج دیا تھا اور وہ کالی کے چاقو کی زد میں آنے سے کئی بار بال بال بچا تھا۔

میں مویٰ اور اسماعیل ایک گاڑی میں، جب کہ سارنگا اڈے کے دیگر استادوں کے ساتھ اگلی گاڑی میں تھا۔ ہمارے پیچھے تین اور بڑی گاڑیاں بھی دیگر کارندوں کے ساتھ رواں دواں تھیں۔ کالی نے مقابلے کے لیے زمرد حولی کے باہر والے بڑے میدان کو چنا تھا۔ شاید وہ اس طرح رنگا پر کوئی نفیاتی دباؤ بھی برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ ہم صبح گیارہ بجے سے پہلے زمرد حولی کے پیر و فی میدان میں پہنچا تو کالی اپنے ہر کاروں سمیت پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ نواب صاحب اور پاشا بھی حولی کے تمام عملے کے ساتھ باہر آچکے تھے اور مجھے دور حولی کی فصیل پر بھی کچھ چہل پہل نظر آئی۔

شاید خانم اور فضہ بھی منڈر کی کسی بڑی درز سے یہ عجیب و غریب اور خونی مقابلہ دیکھنا چاہتی تھیں جس کی ہار یا جیت پران کی جدی پشتی حولی کے قبضے کا دار و مدار تھا۔ کچھ ہی دیر میں میدان میں سفید قلعی سے ایک دائیہ ڈال دیا گیا۔ آج اس میدان میں رنگا اور کالی کی سرکار کی پوری کابینہ، ریناڑڈ ناپ پر بزرگ استاد اور زیر زمین دنیا کے سمجھی دادا مدعو تھے اور مقابلہ شروع ہونے سے پہلے وہاں ایک بہت ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ ایک بوڑھے استاد (Don) نے دائیے میں کھڑے ہو کر سارنگا کا دیا ہوا چیلنج پڑھ کر سنایا اور تصدیق چاہی۔ رنگا نے اثبات میں سر بلایا تو اس نے مقابلے کے اصول پڑھ کر سنائے اور کسی بھی فریق کی جان جانے کی صورت میں کسی بھی خوب بھایا کو تو اسی کے حق کی نفعی ظاہر کی۔ یعنی یہ کھیل زیر زمین کی سرکار کے رواج کے مطابق کھیلا جائے گا۔ آخر دائیے کے اندر کھڑے بزرگ نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ایک سرخ رومال اہر ایا اور رنگا اور کالی دائیے میں داخل

ہو گئے۔ بزرگ استاد نے ہوا میں تین بار رومال لہرا یا۔ سینیٹ ارائیں نے صوفے سنجال لیے اور ہاتھ اٹھا کر اجازت دی۔ بزرگ نے رومال ہاتھ اوپنچا کر کے ہوا میں اچھا ہاں دیا۔ موی زور سے چلا یا ”کچل ڈالا استاد.....“ میرے دل سے آواز نکلی ”یا اللہ رحم.....“ نواب اور حولی کے باقی مرد ارائیں اور عملہ حیرت اور پریشانی سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ یہ شاید ان کی زندگی کا سب سے حیرت انگیز دن تھا۔

چاقو نکالنے سے پہلے رنگا اور کالی میں زور کا مقابلہ ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے دو چنانیں اپنی جگہ جامد کھڑی ہوں۔ نتور نگا اور نہ ہی کالی اپنی جگہ سے انچ بھر بھی ہے۔ دونوں کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چھکلنے لگیں اور میں اتنے فاصلے سے بھی ان دونوں کے بازوؤں کی رگیں چھیننے کی آواز سن سکتا تھا۔ کالی کے اندر واقعی بڑا دم خم تھا کیوں کہ سارے نگا استاد کے سامنے اتنی دریک پانا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ میرے اندر موی کی ڈوبتی آواز ابھری ”استاد کو اپنے اندر پھر سے مار دینے کی حیوانی جبلت پیدا کرنا ہو گی..... ورنہ کالی انہیں مار دے گا.....“ زور کا مقابلہ بنا کسی نتیجے کے ختم ہو گیا۔ ایک کارکن گول طشت میں دو چاقو رکھ کر بزرگ رہنماء کے پاس آیا۔ بوڑھے استاد نے دونوں چاقوؤں کو چھو کر اپنی دعا اور اجازت ظاہر کی۔ طشت رنگا اور کالی کے پاس لے جایا گیا جنہوں نے ایک ایک چاقو اٹھالیا اور اسے چوم کر کھلے سے کھول لیا۔ ہم سب یوں دم سادھے کھڑے تھے جیسے اگر کسی نے بھی ذرا زور سے سانس بھی لی تو یہ خواب بکھر جائے گا۔ دونوں حریفوں نے کچھ دیر تک فضائیں تیزی سے چاقو لہرا کر اور پینٹرے بدلت کر ایک دوسرے کے داؤ کا اندازہ لگانے کی کوشش کی اور پھر یہاں ایک کالی نے ہوا میں اپنے اچھا لے چاقو کو دوسرے ہاتھ تک پہنچنے سے قبل ہی ہوا میں دوبارہ دبوچ لیا۔ عام حالات میں حریف دائیں سے بائیں ہاتھ تک چاقو کے سفر کا وقت شمار کر کے پینٹر ابدتا ہے لیکن کالی کی تیزی دیکھ کر میں خود بھی ششد رہ گیا۔ اگر عین لمحے پر نگا اپنے اوپری جسم کو فوراً پیچھے نہ جھکایتا تو کالی کا چاقو ضرور اس کے سینے کے آر پار ہو جاتا۔ فضائیں کالی کے جماعتیوں کے نعرے اور نگا کے ساتھیوں کی بے چین سرگوشیاں ابھریں۔ موی نے بے چینی سے اپنی انگلیاں چھٹا کیں ”دھیان سے رنگا استاد“ اس کی اپنے آپ سے کی گئی یہ سرگوشی صرف میں ہی سن سکتا تھا۔ نگا نے خود کو اگلے ہی پل سنجال لیا، اور اس نے نظروں نظروں میں کالی کو داد بھی دی، اور ابھی کالی رنگا کی نظروں کی داد ہی سیمیٹ رہا تھا کہ رنگا کا ہاتھ اسی تیزی سے لہرا یا کہ کالی کو جھکنے کا وقت بھی نہیں ملا مگر نگا نے شاید جان بوجھ کر چاقو کی نوک کو صرف چھونے کی استعداد تک بڑھایا تھا۔ زیادہ قریب آنے میں کالی کے چاقو کی زد میں آنے کا خطرہ بھی اس کے پیش نظر ضرور ہو گا، لیکن اس نے پہلے تسلی وار میں بھی وہ کالی کے کرتے میں سینے کی جگہ ایک بڑا سا سوراخ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب چینخے کی باری رنگا کے حامیوں کی تھی۔ موی زور سے چلا یا ”واہ استادواہ..... کاٹ ڈالاں حرام خور کو بیہیں .....“

اپنے پھٹے کرتے کو دیکھ کر کالی کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے پے در پے رنگا پر کئی آڑھے ترچھے وار کیے۔ دور سے ہمیں فضائیں چاقو کی دھارا دھرا دھر لپکتی نظر آ رہی تھی، لیکن رنگا اس بار پوری طرح ہوشیار تھا۔ اس نے خود کو دائیں باسیں جھکایاں دے کر بڑی مہارت سے کالی کے چاقو کی پہنچ سے دور کھا اور پھر وقت جیسے ہم سا گیا۔ دونوں حریف ایک دوسرے پر جھپٹتے اور وار کرتے رہے۔ گھنٹہ بھر ہونے کو تھا۔ دونوں کے چاقو کی نوکیں اب ایک دوسرے کو چھونے لگی تھیں۔ فضائیں دونوں کے خون کے چھیننے تھوڑی تھوڑی دیر بعد اچھل جاتے تھے۔ دونوں ہی اہولہاں ہو چکے تھے ہر گھاؤ پر نواب صاحب اپنی آنکھیں بحق لیتے تھے اور پاشا صاحب کی تسبیح اور زیریں پھونگی جانے والی دعا کیں تیز تر ہو جاتی تھیں۔ موی اب باقاعدہ

التجا کرنے لگا تھا ”استاد…… لمبامت کھینچو…… بس کاٹ ڈالو……“ لیکن کالی بھی رنگا کے وار کی زد میں کب آنے والا تھا۔ تھکن دونوں کے چہروں سے واضح تھی اور دونوں کی نظر ایک پل کے لیے بھی دوسرے حریف سے نہیں ہٹی تھی۔ دفعتہ کالی نے اپنا چاقو ابتدائی حملے کے انداز میں ہی دوبارہ فضامیں اچھالا۔ شاید وہ اس بار بھی رنگا کو باسیں ہاتھ کا جھما کا دے کر چاقو کو داسیں ہاتھ سے ہی فضامیں دبوج کر پھر سے وہی اپنا آزمودہ نسخہ آزمانا چاہتا تھا لیکن جانے رنگا نے اس کی آنکھوں میں کیا پڑھ کر اپنی زندگی کا سب سے بڑا جواہر کیلئے کافی صلمہ کر لیا۔ تھیک جس طرح میں نے رنگا کے چاقو فضامیں بلند کرتے ہی اپنا آزاد پنجہ رنگا کی کلامی پر ڈال دیا تھا رنگا نے بھی اپنا پنجہ کالی کی اس کلامی پر ڈال دیا جس کی طرف اس نے چاقو اچھالا تھا شاید کالی کے ذہن میں بھی یہی چال تھی کہ اس بار وہ رنگا کو دھوکہ دے کر چاقو واقعی دوسرے ہاتھ میں تھام کر رنگا کو کاری ضرب لگانے میں کامیاب ہو جائے گا لیکن اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ رنگا اس کا وہی ہاتھ دبوج لے گا۔ کالی کا چاقو اور رنگا کا پنجہ تھیک ایک ہی وقت میں کالی کی ہتھیلی اور کلامی سے گمراہے۔ کالی کی کلامی رنگا کی گرفت میں آئی اور فضامیں ہڈی ترخنے کی آواز گوئی۔ کالی کے چہرے پر شدید اذیت کے آثار نظر آئے لیکن رنگا کی گرفت سے اپنی کلامی نکالنا اس کے لیے ناممکن ہو چکا تھا۔ رنگا کی نظر میری نظر سے ٹکرائی اور اس نے اپنی باسیں آنکھ دبادی۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ اسے میرا داؤ اب بھی یاد ہے۔

دوسرے ہی لمحے اس نے کالی کی کلامی موڑ دی اور اس کے پچھے میں جکڑا چاقو ناکارہ ہو گیا۔ ہجوم چلا رہا تھا ”کاٹ ڈال رنگا استاد…… ختم کر دے…… مار ڈال اسے……“ رنگا کالی کا بازو پشت پر موڑنے کے بعداب خود اس کے عقب میں یوں کھڑا تھا کہ اس کا چاقو کالی کی شرگ کو چھوڑ رہا تھا۔ ہجوم کا شور بڑھتا گیا رنگا کے حمایتی چین چین کر اسے کالی کی شرگ پر چاقو پھیر دینے کی دہائی دے رہے تھے۔ کالی نے ایک نظر سب کو دیکھا، اور پھر اس نے آنکھیں بند کر کے زیر لب کچھ پڑھا۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔ کالی نے بھی آنے والی قضا کے استقبال میں اپنی آنکھیں موندھ لیں اور دوسرے ہی لمحے رنگا نے کالی کی شرگ پر اپنے چاقو سے عمر بھر کے لیے ایک گہرا شان ڈال کر اسے لات مار کر سفید دائرے سے باہر دکھیل دیا۔ کالی مقابلہ ہار چکا تھا لیکن رنگا نے اس کی جان بخش دی تھی۔ کالی دائرے کے باہر ہی تھکن اور زخموں سے چور ٹھہرال سا پڑا رہا اور پھر سب سے پہلے موی چلاتے ہوئے رنگا کی طرف دوڑا اور اسے اپنے بازوؤں میں انھالیا پھر تو یکے بعد دیگرے سبھی رنگا کی طرف لپکے اتنا شور چاکر کا ان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ نواب صاحب نے شکرانے کے طور پر وہیں اپنے ہاتھ فضامیں بلند کر دیے اور پاشا صاحب کی تسبیح رک گئی۔ خود سار رنگا کی حالت بھی تھیک نہیں تھی اور اس کے زخموں سے تیزی سے خون بہہ رہا تھا۔ نواب صاحب نے احتیاط کے پیش نظر اپنے ذاتی معانج کو ایسی بولیں سمیت پہلے ہی سے وہاں بلار کھا تھا، لیکن رنگا واقعی اعلیٰ ظرف دشمن تھا۔ اس نے خود سے پہلے معاجمین کو کالی کی طرف بھیجا۔

سار رنگا کو فوراً حولی کے مردانے میں منتقل کر دیا گیا لیکن رنگا کی حالت سنبھلنے میں تین روز لگ گئے۔ نواب صاحب کے معاجمین نے موی کو آخری لمحے تک یہی مشورہ دیا کہ وہ رنگا کو فوراً کسی بڑے ہسپتال لے جائے لیکن اڈے کی مصلحتوں کے تحت موی نے حولی میں ہی علاج جاری رکھنے پر زور دیا۔ وہ تو رنگا کو لے کر فوراً یعقوب میشن پہنچا چاہتا تھا لیکن نواب صاحب نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر موی کو رنگا کا علاج زمرد حولی میں ہی جاری رکھنے پر مجبور کر دیا۔ تیسرے روز ناہید کی بے انتہا ضد پر اساعیل اسے بھی زمرد حولی لے آیا۔ حالانکہ اسے سار رنگا کی شدید ناراضگی کا بھی علم تھا

لیکن اس سے ناہید کی حالت بھی نہیں دیکھی گئی۔ ناہید نے رنگا کو پیٹوں میں جکڑا یوں بستر پر پڑے دیکھا تو وہ پھوٹ کر روتی ہوئی باپ کے گلے لگ گئی۔ رنگا اسے روکتا ہی رہ گیا ”یہ حرام خور اسماعیل کبھی نہیں سدھرے گا۔ اب کیوں روتی ہے رہی۔۔۔ لاڈی کا بابا بھی بالکل ٹھیک ہے۔۔۔ بس چند کھروں پھیں ہی تو آئی ہیں۔۔۔“ لیکن ناہید کی آنکھوں کا ساون اب تھمنے کا نام نہ لیتا تھا وہ سارنگا کے بستر سے ہٹنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے زنانے سے خانم کو بلا کر اسے رات گزارنے کے لیے ان کے ساتھ بھیجا گیا۔ سارنگا کی کچھ دریکے لیے آنکھاں کی تو میں بھی دبے پاؤں باہر جو یہی کے دالان میں آگیا۔ رات کے اندر ہیرے میں چمکتے تارے اور کھلا آسمان بہت بھلا محسوس ہو رہا تھا میرے ذہن میں ایک عجیب ساختیاں آیا کہ یہ رات نہ ہوتی تو ستاروں کو بھی یہ چمک نصیب نہ ہو پاتی۔ ہم ظاہر پرست انسان ہمیشہ چاند اور ستاروں کی خوبصورتی کو سراحتے ہیں کبھی کسی کی نظر اس رات کی سیاہی پر کیوں نہیں پڑتی جس کے دالان کے بغیر یہ محترم یا آنچل کبھی جنمگاہی نہ پاتا۔ شاید دنیا کی ہر چمک کسی اندر ہیرے کی قربانی کی مر ہوں منت ہے۔ میں انہی سوچوں میں گم چلتا ہوا نہر کی پرلی جانب جانکلاتب مجھے خیال آیا کہ میں چلتے چلتے زنان خانے کے عقب میں بہتی نہر کی شاخ کے قریب آپنچا ہوں۔ جو یہی کے محافظوں نے بھی مجھے نوکرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ ان کی نظر میں اب ہم سب بھی جو یہی کے ہی فرد تھے لیکن خود مجھے تو احساس تھا کہ جو یہی کی چار دیواری کے اندر کی حد بندیوں کا خیال رکھنا اب پہلے سے بھی کہیں زیادہ ضروری ہے میں جلدی سے واپسی کے لیے پلانا اور تجھی میری نظر نہر کے قریب پچھی سنگ مرمر کی سل کے اوپر گم سمیٰ بیٹھی فضہ کے ہیو لے پر پڑی۔ وہ میری آہٹ سن کر چونکی ”کون ہے وہاں۔۔۔“ پہلے میں نے سوچا کہ خاموشی سے پلٹ جاؤں کیونکہ اس طرح رات کی تہائی میں کوئی مجھے فضہ کے ساتھ باتیں کرتا دیکھے لے تو نہ جانے کیا سوچ گا، لیکن پھر بے اختیار میں جواب دے بیٹھا ”میں آیاں ہوں۔۔۔“ میں چند قدم بڑھ کر اس کے سامنے آ گیا۔ اس کی آواز میں ہلکی سی شرارت تھی۔

”کیا آپ اب تک راتوں کو جاگ کر زمرد جو یہی کی حفاظت کرتے ہیں۔۔۔“ میرے ہونٹوں پر بھی مکان آگئی ”اور کیا آپ ابھی تک اندر ہیرے میں چھپ کر کتنا بیس تلاشتی ہیں۔۔۔“ وہ بھی نہ پڑی۔ اس کی بُنی اور پاس بہتی نہر کے پانی کی جھنکار میں کتنی ماشمت تھی ”بُنستی رہا کریں۔۔۔ اچھی لگتی ہیں۔۔۔“ ہم سنگ مرمر کی سل پر بیٹھ گئے۔ اس نے غور سے میری جانب دیکھا ”اب مجھے پتہ چلا کہ آپ اپنے وجود میں اتنی حیرتیں سینئے کیے پھرتے ہیں۔ آپ کے آس پاس کبھی لوگ جو اتنے حیران کن ہیں۔۔۔ میں نے اس روز جو بھی دیکھا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ ساتھا کہ پرانے دور میں گلیڈ یہڑہوا کرتے تھے جنہیں بادشاہ وقت کی تفریح کی خاطر اکھاڑوں میں اتارا جاتا تھا۔ میں وہ مقابلہ دیکھتے ہوئے ٹھیک اسی دور میں پہنچ گئی تھی لیکن آیاں۔۔۔ مجھے آپ کی بہت فکر ہو رہی ہے۔۔۔ یہ سب بہت خطرناک ہے۔۔۔ اور آپ کے بازو پر کلائی کے قریب یہ زخم کیسا ہے۔۔۔ ضرور یہ بھی ایسی ہی کسی ہم جوئی کی یادگار ہو گا۔۔۔ یہاں سے جاتے وقت تو آپ کا بازو بالکل ٹھیک تھا۔۔۔“ میں نے بات ٹالنے کے لیے اس سے سوال کیا ”لیکن آپ یہاں کیا کر رہی ہیں اتنی رات گئے۔۔۔“

”بس۔۔۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ ناہید کو مومونے آج اپنے کرے میں ہی روک لیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے سوئی ہے۔ اس لیے میں باہر آگئی ورنہ مومو سے باتیں کر کے وقت بتاتی۔۔۔“ پچھو دریکے لیے ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ خاموشی صرف باتیں ختم ہو جانے کے بعد ہی درجیں آتی۔ کبھی کبھی جب کہنے کے لیے بہت

زیادہ ہو۔ تب بھی ہمارے لفظ کھو جاتے ہیں۔ پھر اسی نے لب کھولے ”آیاں..... میں آپ سے اپنے اس دن کے رویے کے لیے بھی معافی مانگنا چاہتی تھی۔ میں پہلے بھی شدید دباو کے باوجود بھی اتنی جذباتی نہیں ہوئی لیکن جانے اس دن مجھے کیا ہو گیا تھا۔ مجھے یوں ایک لمحے میں ہی آپ کے سامنے اپنا من الٹ کر آپ کو پریشان کرنے کا کوئی حق نہیں تھا..... ہو سکتے تو مجھے.....“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”آپ حق کی بات کر کے مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ بات اگر حق کی ہے تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں آپ کی کسی عنایت کا حق دار نہیں.....“ وہ الجھی گئی ”آخر آپ ایسا کیوں کہتے ہیں..... اگر کسی ایک شخص نے آپ کے کوئی جذبے کو پہچاننے میں بھول کر دی تو کیا آپ اس کی سزا زندگی بھر خود سمیت دوسروں کو بھی دیتے رہیں گے.....؟..... کیا کبھی بھی ایسا کوئی نہیں آئے گا جو آپ کے پرانے زخم مندل کر پائے.....؟..... کیا کوئی گھاؤ ایسا گھرا ہو سکتا ہے کہ اس کا مسیح ڈھونڈنے سے نہیں پائے۔“

وہ اپنے معصوم سوالات کے جواب کے انتظار میں میرا چہرہ سمجھتی رہی۔ میخا خود گھائل سے شفا کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ اب میں اسے کیسے سمجھاتا کہ وہ تو خود وہ طبیب ہے کہ جس کی ایک شفا یاب نظر کی طلب میں ہزاروں مریض عمر بھراں کی چوکھت پر پڑے رہیں۔ پر میرا تو مرض ہی جدا تھا۔ میں نے اسے اپنی زندگی کے پہلے ہنگامے سے لے کر اب تک ہر بات دھیرے دھیرے بتانا شروع کی۔ امی، ابا، ریحان، چھوٹی، پھر کیفے فراق، میرے دوست، گھنٹا سے میری پہلی ملاقات، شیخ صاحب، ستارہ، حمید، تنوری اور پھر شوکی کے ساتھ میرا پہلا جھگڑا اور وہاں سے لے کر زمرد جویلی تک کے اس لمبے سفر کی ایک ایک بات اس کے سامنے کھول کر رکھ دی۔ درمیان میں سانس لینے کو کہیں نکلتا تو صرف سامنے بہتی ندی کے پانی کی سرسر اہٹ ماحول کو زندہ رکھتی۔ فضہ خود ممادھے، بالکل خاموش میری کہانی سنتی رہی۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ درمیان میں کہیں ٹوکنے پر میں کچھ بھول نہ جاؤں، اور پھر جب میری داستان ختم ہوئی تو زمرد جویلی کے اوپنے برجوں کے درمیان سے صبح کی پییدی اندر ہرے پر غالب آنے کو تھی۔ صح ہے کہ ہماری زندگی میں اندر ہٹ کیے یار و شنی سمیت کسی شے کو دوام حاصل نہیں.....

جس طرح ایک بھر پور روش دن گزار چکنے کے بعد ڈھلتی شام اور رات کا اندر ہٹراہمیں ادا کر دیتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ایک بھر پور کالی رات اور چاند ستاروں کے ساتھ کے بعد صبح کا دھیرے دھیرے چھاتا ہوا جالا بھی انسان کو بے چین کر دیتا ہے۔ آنکھوں آنکھوں میں شپ کائٹے کا لطف تو کوئی کسی شب گزیدہ سے پوچھنے۔ ہم دونوں بھی اس رات کے شب گزیدہ تھے اور اب یہ صبح کی آمد میں ایک دوسرے سے نظریں چڑھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ رات کا فسوں ٹوٹ رہا تھا اور ہماری زبان میں ہمارے الفاظ کا ساتھ دینے پر مائل نہیں تھیں۔ میں نے فضہ سے اجازت چاہی۔ واپسی کے لیے قدم بڑھائے تو اس نے مجھے آواز دی ”آیاں.....“ میں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی ”میں اس رات کو زندگی بھر کسی سرمائے کی طرح اپنی یادوں میں سمیٹ کر رکھوں گی..... اب میرے حافظے کو کسی مزید یادداشت کی ضرورت نہ ہو شاید.....“ میں نے اسے نظر بھر کر دیکھا ”میں اس اعزاز کو ہمیشہ یاد رکھوں گا.....“ میں پلٹ کر چل دیا۔ وہ وہیں کھڑی رہی ایک شہزادی کی طرح۔۔۔ اپنی سلطنت کے ایک بخارے کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ جب میں اپنے کمرے میں پہنچا تو صبح کا اجالا زمرد جویلی کے وسیع والانوں میں اتر رہا تھا۔ شب بیت چکی تھی لیکن یاد شب ابھی باقی تھی اور شاید سدا باقی رہنے والی تھی۔

## باب 29

## کتاب گھر کی پیشکش

اور پھر صبح جب دیر سے میری آنکھ کھلی تو شمن کو فخر مند سا اپنے دروازے کے باہر کھڑا پایا "اچھا ہوا آپ جاگ گئے۔ ناہید بٹیا کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ سخت تیز بخار نے آگھرا ہے انہیں۔" میں فوراً بس تبدیل کر کے شمن کے ساتھ ناہید کے کمرے میں پہنچا۔ خانم خود اس کے ماتھے پڑھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھیں۔ فضہ مجھے وہاں نظر نہیں آئی۔ شاید وہ دوسرا جانب حولی کے مہماں کے ناشتے کا انتظام دیکھ رہی تھی۔ ناہید اپنے پیارے بابا کو پٹیوں میں جکڑا دیکھ کر گزشتہ شام سے ہی سخت تاؤ کا شکار تھی اور اس کے ذہنی دباو کا کچھ ایسا ہی نتیجہ متوقع تھا۔ میں نے ماحول بدلنے کی خاطر اسے چھیڑا "خود اپنی خدمت کروانے کا خوب بہانہ ہے یہ بخار بھی..... لیکن وہیان رہے ہم یہاں مہماں ہیں بلی....." خانم اور ناہید دھیرے سے مکرا میں "آیاں بھائی..... میں پہلے ہی اپنے میز بانوں سے بہت شرمند ہوں..... آپ اور شرمندہ نہ کریں مجھے....." خانم نے پیار سے اسے ڈانت دیا "بٹیاں اپنے گھر میں کبھی پرانی نہیں ہوتیں..... تم میری فضہ جیسی ہی تو ہو....." کچھ دیر میں شمن رنگا کا پیغام لے کر آگیا اور میں مردانے میں چلا آیا۔ مجھے دیکھتے ہی رنگا نے پوچھا "کیسی ہے وہ....." اسے شاید ناہید کی خبر مل چکی تھی "تیز بخار ہے۔ خانم تمارداری کر رہی ہیں اس کی".....

"ای لیے میں نہیں چاہتا تھا کہ لاڈلی یہاں آئے۔ اس حرام خورا سماعیل کی کھال کھنچوانی پڑے گی....."

"کس کس کی کھال کھنچوانیں گے آپ..... ان زخموں کے نشان تو جاتے جاتے اپنی داستان سارے زمانے کو سنا جائیں گے..... ناہید کہیں اب آپ کو کھونے کے ڈر سے خود کو ہی نہ کھو دے....." رنگا نے موی کی طرف دیکھا "دیکھ رہا ہے موی..... یہ دونوں بھائی اب مل کر میری طناب میں کتنا چاہتے ہیں..... تو انہیں سمجھاتا کیوں نہیں کہ ہمارے دھنڈے میں واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا..... اپنی دنیا کے راجہ گدھوں سے جان چھڑا بھی لوں تو پولیس اور کوتولی ساری زندگی جان نہیں چھوڑے گی۔ باقی ساری عمر یا سلاخوں کے پیچھے ہی کٹ جائے گی..... وہ تو نادان ہے ساجن..... پرتو کیوں نہیں سمجھتا.....؟" ہماری باتوں کے درمیان نواب صاحب بھی پاشا کے ساتھ کمرے میں آچکے تھے "بھئی کون کس کو نہیں سمجھ رہا.....؟" رنگا نے نواب کو دہائی دی "دیکھونہ سرکار..... یہ بھی لاڈلی کے ساتھ مل گیا ہے..... کہتا ہے دھندا چھوڑ دوں....." نواب صاحب نے گھری سانس لی "بھائی رنگا استاد..... اس معاملے میں تو میں بھی آیاں میاں کا ہی ساتھ دوں گا۔ ہم میں سے کوئی بھی آپ کو اپنی جان یوں جو حکم میں ڈالنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اگر آپ کو شہر میں رہنے میں کوئی اعتراض ہے تو آپ یہاں میرے پاس رہ سکتے ہیں۔ یہ ناہید بٹیا کا بھی اتنا ہی گھر ہے جتنا ہماری فضہ کا....." سارنگا نے بے چارگی سے موی کی جانب دیکھا "لو جی..... ہم دو کو رو رہے تھے، یہاں تو بڑے سرکار بھی انہی کے ہم نوا نکلے..... نواب صاحب..... ہماری دنیا میں زور کو سلام پڑتا ہے..... کمزور کونگل جاتے ہیں..... اور رنگا کا زور اس کے اڈے کے بل پر ہی قائم ہے" میں نے اپنا خیال ظاہر کیا "بات اگر صرف طاقت کی ہے تو طاقت حاصل کرنے کے اور بھی بہت سے ذرائع ہیں مثلاً سیاست..... آپ ہمیشہ بادشاہ

گر بنے رہے اور آپ کے مل پر لوگ تخت حاصل کرتے رہے۔ ایک بار خود سیاست کی بادشاہ گری کیوں نہیں اپناتے۔ طاقت پھر بھی آپ کے پاس رہے گی۔ ہاں البتہ اڑے کی زندگی ترک کرنے کا اور اپنی دنیا کے لوگوں سے کنارہ کشی کا ایک بہت اچھا بہانہ ضرور مل جائے گا۔ ”رُنگا نے میری بات سن کر موسیٰ کی طرف دیکھا اور دونوں ہنس پڑے ” یہ لو۔ اب ہمیں کون دوٹ ڈالے گا۔ کیوں رے موسیٰ۔ تو کھڑا ہو گا میری طرف سے ایکشن میں۔؟ بس تین ماہ ہی باقی ہیں ” موسیٰ نے جلدی سے کانوں کو ہاتھ لگایا ” نہ استاد نہ۔ میں نے تو پانچوں بھی پاس نہیں کی۔ آج کل تو سناء ہے صرف چودھویں پاس ایکشن لڑکتا ہے۔ ” رُنگا نے ہاتھ پر ہاتھ مارا ” دھت تیرے کی۔ میں بھی تو صرف دسویں فیل ہوں۔ یہ بیل تو منڈھنے نہیں چڑھنے کی سجنوا۔ ”

رُنگا اور موسیٰ دونوں ہی ہنستے رہے۔ اچانک نواب صاحب نے لقدمہ دیا ” تو کیا ہوا۔ آیاں نے بھی توپی اے کا امتحان دے رکھا تھا۔ شاید نتیجہ بھی نکل گیا ہے۔ میرے ذہن میں نہیں رہا اس پر یہاں میں۔ میں نے کچھ دن پہلے ہی اخبار میں سرخی دیکھی تھی۔ پاشا صاحب۔ آپ پرانے اخبار تو نکلوں میں شہین کو کھلاوا کر۔ ہاتھ لکن کو آرسی کیا۔؟ ” بات کہاں سے کہاں نکل گئی اور کچھ ہی دیر میں شہین پرانے اخباروں کا پلنڈہ اٹھائے کرے میں داخل ہوا۔ کچھ دیر بعد وہ سبھی اس تندھی سے اخبار میں بی اے کا نتیجہ ڈھونڈ رہے تھے، جیسے میرے پاس ہونے سے ہی ان کے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ میرا روں نمبر پاشا صاحب پہلے ہی مجھ سے پوچھ چکے تھے جو بے حد آسان ہونے کی وجہ سے ہمیشہ زبانی یاد رکھتا۔ 1985 میری پیدائش کا سال ہی میرا روں نمبر تھا، اور پھر اچانک ہی شہین چلا یا۔ ”حضور کہیں یہ اخبار تو نہیں۔ اس میں بہت سے نمبر کے ہوئے ہیں۔ ” پاشا صاحب نے لپک کر اخبار پکڑ لیا اور تیزی سے نظریں اخبار کے صفحے پر دوڑا گئیں۔ نہ جانے کیوں میرا دل بھی زور زور سے دھڑ کے لگا تھا۔ مجھے اب یاد آگئے جو اسی طرح بے چینی سے میرا نتیجہ اخبار میں تلاش کیا کرتے تھے اور عام طور پر انہیں بدالے میں مایوسی ہی ملا کرتی تھی۔ لیکن آج جب وہ میرے ساتھ نہیں تھے تو نتیجہ وہ نکلا جس کا انہیں ہمیشہ سے انتظار تھا۔ پاشا صاحب زور سے چلائے ” ہا۔ یہ رہا۔ انہیں سو پچا سی۔ بھی واہ۔ ہا۔ سیکنڈ ڈویشن آئی ہے۔ اپنے آیاں میاں پاس ہو گئے۔ ” وہ چاروں اس طرح خوشی منارہ ہے تھے اور بچوں کی طرح بار بار میرا روں نمبر اخبار میں دیکھ رہے تھے جیسے کبھی پاس ہونے پر میرے سارے دوست بلہ مچاتے تھے۔ میں نے لپک کر پاشا صاحب کے ہاتھ سے اخبار لے لیا۔ مجھے بالے، مشی اور راجہ کا روں نمبر بھی یاد تھا۔ ہم سب ایک ہی قطار میں ہی تو بیٹھے تھے۔ بالا، مجھ سے پیچھے تھا اور راجہ اور مشی میرے آگئی تھی۔ میں نے اپنے تصور میں ان تینوں کو کیفے فراق میں اپنی مخصوص میز کے گرد بیٹھا لڑتے جھگڑتے دیکھا۔ بالا ضرور ان دونوں کو مجھ سمت غداری کے طعنے دے رہا ہو گا کہ ہم سب نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے، اور وہ دونوں اسے منارہ ہے ہوں گے کہ جب تک بالا سارے پرچے پاس نہ کر لے ہم اگلی جماعت میں نہیں بیٹھیں گے۔ ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا تھا ایک دوسرے کے ساتھ جماعت میں بیٹھنے کے چکر میں بی اے کرتے کرتے ہم سب چوپیں سے اوپر کے ہو چکے تھے۔ میں اپنے خیالات کی رو میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ مجھے اس بات کا احساس ہی نہیں ہوا کہ نواب صاحب مجھے تیسرا بار مبارک باد دے چکے ہیں ” کہاں کھوئے ہو میاں۔ لگتا ہے دوست اور گھر بار بار یاد آگئے تھیں۔ ” رُنگا نے غور سے میری طرف

دیکھا" لے چلیں گے اسے اس کے باوا کے پاس..... اب تو اس نے امتحان بھی پاس کر لیا ہے..... شاید اب وہ اسے معاف کر دیں....."

موئی نے مجھے چھپیرا" کیوں شہزادے..... لڑے گا ایکشن ہمارے لیے ؟" میں نے سارنگا کی طرف دیکھا" ہاں..... اگر آپ دونوں یہ وعدہ کریں کہ میری جیت کی صورت میں ہمیشہ کے لیے اڑہ ترک کر دیں گے۔ یعقوب میشن ہمارا ہیڈ کوارٹر بنے گا اور وہاں موجود سارے شاگردوں استاد اور تمام کارندے ہمارا سیاسی عملہ ہو گا۔ وہاں کلائی اور زور کی مشق ہمیشہ جاری رہے گی لیکن وہ طاقت اب ہم سیاست کے میدان میں استعمال کریں گے۔ بولیں..... منظور ہے میری شرط..... ؟" ہنسی مذاق میں شروع ہونے والی ایک بات نے اتنا سمجھدہ رخ اختیار کر لیا تھا کہ خود ہم نے بھی کبھی نہیں سوچا تھا۔ رنگا کسی گھری سوچ میں گم تھا" ایکشن لڑنا آج کل اتنا آسان کام نہیں رہا ساجن..... یہ پرانے گدھ کسی نئے پتھر کو اس آسان پر کہاں اڑنے دیتے ہیں بھلا..... ؟ تیری جان خطرے میں پڑ جائے گی..... ہماری دنیا میں تو پھر بھی للاکار کروار کرتے ہیں پھر وہاں پینچھے میں چھرا گھوپنے کی ریت ہے پیارے..... تجھے کیسے اس دوزخ میں جھوک دوں جنم....."۔

"میری زندگی اتنی قیمتی نہیں ہے..... لیکن آپ کی زندگی سے ناہید کی زندگی جزی ہے۔ سینکڑوں خاندان ہیں جن کا چولہا قدرت نے آپ کے دم سے جلا رکھا ہے۔ میں اس آگ میں کوئے کے لیے تیار ہوں..... اب آخری فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے....." میں ان سب کو گھری سوچ میں ڈوبا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

کالی کا علاقہ بھی اب رنگا کی راج دھانی میں شامل ہو چکا تھا۔ نواب کا بڑا بیٹا وقار کالی کی شکست کے بعد سے غائب تھا۔ موئی نے تیرے دن ہی کالی کے اڑے کا انتظام سنچال لیا تھا۔ نواب صاحب کو بھی حویلی کے انتظامات سنچالنے کے لیے اب کسی نئے فیجر کی ضرورت تھی کیونکہ رحیم کے جانے کے بعد اب اس کی ذمہ داریاں نبھانے والا کوئی نہیں تھا۔ میرے ذہن میں بہت پہلے ستارہ کی کہی ہوئی بات گوئی کہ شیخ صاحب حمید کی بے روزگاری کی وجہ سے بہت پریشان رہتے ہیں۔ تیرے روز موئی اکسی ضروری کام سے شہر جانے کے لیے زمرد حویلی سے نکلا تو میں بھی اس کے ساتھ تھا میں کیفے فراق کے پاس اتر اتو وقت تھم سا گیا۔ شام کی چائے کا وقت ہو رہا تھا اور میرے تیزی سے فٹ پاٹھ پر گلی میزوں کی جھاڑ پوچھے میں مصروف تھے۔ کیفے کاریکار ڈپیٹری اپنی مخصوص چرچا ہٹ کے ساتھ سر بکھیر رہا تھا

کیسے قت میں ہائے..... دل کو دل کی لگنی بیماری

مہنگائی کے دور میں مہنگی ہو گئی یار کی یاری

دل کی لگنی دل کو جب لگائی مار گئی

راشن والی لائن کی لمباںی مار گئی

پاؤڑ روائے دودھ کی ملائی مار گئی

اور جتنا جو چینی چلائی مار گئی.....

باقی کچھ بچا تو مہنگائی مار گئی..... مہنگائی مار گئی

## کتاب گھر کی پیشکش

ہائے مہنگائی..... مہنگائی مہنگائی..... تو کہاں سے آئی

تجھے کیوں موت نہ آئی..... کہ باقی کچھ بچا تو مہنگائی مار گئی..... مہنگائی مار گئی

آس پاس بیٹھا بابا اور کلرک طبقہ گانے کے بولوں پر سرد ہم رہا تھا۔ غریب جب غربت سے لڑتے تھک جاتا ہے تو پھر وہ اپنے دل کی بھڑاس ایسی ہر بات اور شعر کو دادوے کرنا تھا ہے جس میں غربت اور مہنگائی کا رونارویا گیا ہو۔ یہ شاعر اور سیاست دان ایسی ہی باتیں کر کے ان کے دلوں میں پلتے کسی لوئے لگڑے انقلاب کے غبارے سے بھی ہوانکال دیتے ہیں اور غریب رات کو تھکا ہارا پھر سے آنے والے خیالی ہہانے دنوں کی یاد میں بستر پر جا پڑتا ہے۔ کچھ ہی دیر میں میری آمد کی اطلاع سارے علاقوں کو ہو چکی تھی اور پھر سب سے پہلے راجہ اور پھر مشی اور بالا دوڑتے ہوئے کیفے فراق کے ہال میں داخل ہوئے اور مجھے سے لپٹ گئے۔ میں نے مرزا کو شیخ صاحب اور ریحان کو اطلاع دینے کے لیے بھی کہلوا بھیجا تھا، کیونکہ میرے پاس وقت کم تھا اور مجھے موی کے ساتھ زمرد ہو یہی بھی پہنچتا تھا۔ میرے مستقبل کے منصوبے سن کر راجہ چلایا ”یہ تو کیا کہہ رہا ہے انو..... الیکشن..... نہیں نہیں.....“ مشی نے غور سے میری طرف دیکھا ”کیا تم سنجیدہ ہو.....؟“ میں نے گھری سانس لی ”شاید تین دن پہلے تک میں نے اس بارے میں سوچا بھی نہیں تھا لیکن اگر یہی ناہید کےطمینان اور خوشی کا واحد ذریعہ ہے تو ہاں..... میں سنجیدہ ہوں.....“ بالے نے فکر مندی سے کہا ..... ”لیکن سیاست خود ایک بہت بڑا گندہ تالاب ہے پیارے ..... جو اس میں اترنا ..... وہ داغ دار ہی ہوا.....“

”ہاں..... جانتا ہوں میں..... ہم خود بھی تو تمام عمر اپنے ہی چنے ہوئے سیاست دلوں کو برآجھلا کہتے گزار دیتے ہیں لیکن ہم میں سے کوئی آخر یہ کیوں نہیں سوچتا کہ اگر یہ گندہ ہے تو اسے پاک کرنے کے لیے ہمیں خود اس جو ہڑ میں اترنا پڑے گا۔ ہمارے مسئلے حل کرنے کے لیے آسمان سے کوئی فرصتہ تو اترنے سے رہا..... جب تک ہم سیاست کو گندہ تالاب سمجھ کر اس کے کنارے بیٹھ کر اندر والوں پر صرف تقید کرتے رہیں گے یہ پانی اور طاقت کے بل پر کی جاتی ہے..... لیکن آج قدرت کی مرضی سے یہ دلوں لوازمات میرے ہمدردوں کے پاس موجود ہیں..... تو پھر یہ بازی کھینچنے میں بھی کیا حرج ہے..... ہم چاروں نے آج تک صرف اپنے دل کی مانی ہے..... ایک بار زمانے کی مان لینے میں کیا حرج ہے.....“ وہ سب میری بات سن کر خاموش ہو گئے لیکن ان کے چہروں پر چھائی فکر اور پریشانی صاف نظر آ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ریحان بھی وہاں پہنچ گیا۔ شیخ صاحب البتہ مرزا کو گھر میں نہیں ملے۔

میں نے اسے اپنی آمد گھروں سے چھپانے کی ہدایت کی تھی۔ ریحان نے مجھے بتایا کہ ای میری غیر موجودگی میں کافی یہاں پڑ گئی تھیں۔ البتہ میرا رزلٹ دیکھ کر ان کی طبیعت قدرے سنبھالی ہے۔ ابا میرا نتیجہ دیکھ کر اندر ونی طور پر خوش ہوئے پرانہوں نے اپنی خوشی گھروں سے ظاہر نہیں کی۔ چھوٹی روزانہ شام کو میرا انتظار کرتی ہے اور امی حسب معمول ہر جمعرات کی شام میرے نام کا صدقہ نکالتی ہیں۔ ریحان نے میرا ہاتھ تھام لیا ”انویار..... تم کب گھر واپس آؤ گے..... بس اب یہ ضد چھوڑ دو..... ہم سب تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ تمہاری واپسی کی راہ تکتے رہتے ہیں.....“ میں نے ریحان کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”کیا ابا بھی.....؟“ ریحان نے نظریں جھکا لیں۔ مجھے میرا جواب مل گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا ”جس

دن ابا کو بھی میری کمی محسوس ہو گی میں ضرور لوٹ آؤں گا،” میں نے مرزا کو شیخ صاحب کے لیے ایک رقہ لکھ کر دیا کہ وہ اپنے طور پر حید کو پاشا صاحب سے رابطے کے لیے کہیں۔ اسے معقول تجوہ پر حویلی کی نوکری مل جائے گی۔ کچھ دیر بعد موئی کی گاڑی مجھے لینے کے لیے پہنچ گئی اور میں ان سب سے جلد ملنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا۔

نواب صاحب سارنگا کے زخم پوری طرح مندل ہونے تک اسے وہاں سے منتقل کرنے کے حق میں نہیں تھے لیکن رنگانے اپنی مجبوری ظاہر کی کہ اسے یعقوب میشن سے لٹکے بہت دن ہو چکے ہیں وہاں کا نظام درہم برہم ہو چکا ہو گا لہذا اس کا جانا ضروری ہے۔ نواب صاحب نے جاتے جاتے دو الفاظ میں رنگا کو پیش کش کی کہ میرے الیشن لڑنے کی صورت میں ان کی خواہش یہی ہو گی کہ میرا سارا خرچہ وہ خود برداشت کریں۔ رنگانے مسکرا کر ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھا ”میرے اور آپ کے پیسے میں کوئی فرق ہے بھلا..... ویکھیں گے وقت آنے پر..... ابھی تو میرا دل نہیں مانتا اس فیصلے کو..... ہم غنڈے ہیں سکی..... پر سیاست دان نہیں ہیں.....“

لیکن جب ناہید کو پتہ چلا کہ میں نے رنگا کو اس دلدل سے نکالنے کے لیے سیاست کا درمیانی راست نکالا ہے تو اس نے وہیں زمرد حویلی کے بستر پر بخار کے دوران ہی بھوک ہڑتاں کا اعلان کر دیا اور اس وقت تک اناج کا ایک بھی دانہ منہ میں نہ رکھنے کی قسم کھائی کہ جب تک اس کے بابا میرے پیش کردہ منصوبے کی منظوری کا اعلان نہ کر دیں۔ آخر کار باپ کو اپنی بیٹی کی ضد کے آگے ہار ماننا ہی پڑی۔ رنگانے خود زنانے میں جا کر ناہید کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور اس روز سارنگا نے اپنی لاڈلی کو بہت عرصے بعد اپنے ہاتھوں سے ناشتہ کرو کر اس کی قسم توڑی۔ ہم سب زمرد حویلی سے رخصت ہوئے تو حویلی کے سبھی مکین بہت دریک مرکزی گیٹ پر کھڑے ہمیں رخصت کرنے کے لیے ہاتھ ہلاتے رہے، لیکن ان سب میں فضہ شامل نہیں تھی۔ الوداع کہنے کے بعد میں نے اس کی آخری جھلک زمرد حویلی کے اوپر برج کی ایک منڈیر کے پیچے دیکھی تھی۔ وہ وہیں سے کھڑی ہمیں رخصت ہوتے دیکھتی رہی۔

اگلے چند روز بے حد مصروف گزرے۔ رنگانے یعقوب میشن پہنچتے ہی با قاعدہ اخبار والوں کو چائے کی دعوت پر بلا کر یہ اعلان کر دیا کہ وہ اس بار انتخابات میں کسی بھی پارٹی کا ساتھ دینے کے بجائے خود اپنا نام اسندہ کھڑا کر رہا ہے، اور وقت آنے پر اس نام کا اعلان بھی کر دیا جائے گا۔ رنگانے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ وہ کسی بڑی پارٹی سے نکٹ لینے کے بجائے اپنے امیدوار کو آزاد میدان سے لڑانے پر بھی غور کرے گا۔ رنگا کے اس اعلانیے کے ساتھ ہی زیر زمین اور سیاست کے ایوانوں میں تحریری سی مجھ گئی اور دونوں جانب سے اس پر شدید دباو ڈالا جانے لگا کہ وہ اپنایہ فیصلہ واپس لے لے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ سارنگا کس قدر دور اندیش تھا۔ اگر وہ اڈے کی گدی چھوڑ کر یہ اعلان کرتا تو واقعی دونوں اطراف کے ”بڑے“ اس کی بڑیاں تک چجا جاتے، لیکن رنگانے اڈے اور اپنے زیر زمین سرکار کے مل پر یہ فیصلہ لیا تھا لہذا رفتہ بھی خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہوتے گئے لیکن رنگا اب بھی ہر قدم نہایت پھونک کر اٹھا رہا تھا اور اس نے کاغذات جمع ہونے کے آخری وقت تک میرے نام کا اعلان نہیں کیا، اور سب سے پہلے اپنے چار اطراف کے کلے مضبوطی سے گاڑنے کے بعد آخری تاریخ سے صرف ایک دن پہلے میرا نام سب کے سامنے ظاہر کر دیا۔ آیاں احمد کے ہزاروں پوٹر چھپ کر آگئے اور علاقے کی ہر درود یا وار پر میرا نام چپاں ہوتا چلا گیا۔ اس تمام عمل کے دوران

میرے سب سے تیز اور پر جوش و رکر علاقے کے وہی نوجوان ثابت ہوئے جن کو کبھی ہم نے ہفتہ خوری کے خلاف اکٹھا کیا تھا۔ مشی، بالے اور راجہ کی سربراہی میں ہمارے علاقے کے سینکڑوں نوجوان صبح شام میرے حق میں لوگوں کی رائے بد لئے کے لیے لوگوں کے دروازے کھلکھلارہے تھے۔ وہ جنمیں لوگ لوفر، آوارہ، ناکارہ اور نکما کہہ کر سدا دھکارتے آتے تھے۔ آج اپنے جیسے ایک لوفر اور آوارہ کے لیے اپنا تن من لگا کر اپنے دن رات ایک کیے دے رہے تھے۔ ان کے اندر کہیں نہ کہیں یہ بات بھی ضرور پاچل مچاتی ہو گی کہ یہاں بھی جیسے ایک آوارہ کی شناخت کی بازی ہے، اور وہ سب یہ بازی اپنی بازی سمجھ کر کھیل رہے تھے۔ ان کے پاس دنیا پر یہ ثابت کرنے کا آخری موقع تھا کہ وہ ناکارہ نہیں ہیں..... اگر انہیں موقع دیا جائے تو وہ بھی زمانہ جیت کر دکھا سکتے ہیں۔ میری فرمائش پر نگانے خصوصی طور پر انہی بھی کے لیے روزانہ اور ہفتہ وار خصوصی معاوضے کا بندوبست بھی کر دیا تھا تاکہ انہیں گھروالوں کے طعنوں اور اعتراضات کا سامنا کرنا پڑے۔ ان میں سے خود کسی نے کوئی مطالبہ نہیں کیا لیکن میں جانتا تھا یہ سب نوجوان ہیں جو ہر گھر میں کہیں کسی عضو معطل کی طرح بکھرے پڑے رہتے ہیں ان کے لیے کبھی کوئی خاص برداشت نہیں ہوتا۔ ان کو کبھی اپنا کرہ میسر نہیں آتا۔ کبھی کوئی خصوصی تقریب منعقد نہیں کی جاتی۔ ان کی فرمائش پر کبھی گھر میں کچھ خاص پکوان تک نہیں پکایا جاتا۔ ہر بار کسی چھوٹے یا بڑے بھائی یا کسی چچا زادیا پھر کسی دور پار کے رشتے دار کی کامیابی پر انہیں طنز، طعنوں اور جلی کئی باتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انہیں اپنی مرضی سے کسی کی مدد کرنے کا حق تک حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان کا شمار گھر کی سب سے ناقص احقل قسم کی حقوق میں کیا جاتا ہے۔ ایسے میں اگر وہ گھر میں چار پیسے لا کر دیں گے تو کم از کم انہیں راتوں کو آوارہ گردی کے طعنے تو نہیں ملیں گے۔ گھر میں یہ پیسے نہ بھی دیں تو کچھ دن کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی شرمندگی سے تو نج جائیں گے۔ وہ سب اب میرے ساتھی تھے اور میں ان سب کا آیاں بھائی تھا۔ آخر کار وہ دن بھی آگیا جب میرا پہلا جلسہ ہونا تھا۔ مقام وہی تھا جہاں سے میری کہانی شروع ہوئی تھی..... کیف فراق کے سامنے والی سڑک اور بابو کا لونی۔

## کتاب گھر کی پیشکش

### عشق کا شین (III)

**عشق کا عین اور عشق کا شین** کے بعد کتاب گھر اپنے قارئین کے لیے جلد پیش کرے گا..... **عشق کا شین (II)** ناول ایک مکمل کہانی ہے۔ امجد جاوید کی لازوال تحریروں میں سے ایک بہترین انتخاب۔ **عشق کا شین (II)** کتاب گھر کے **معاشرتی رومانی ناول** سیکشن میں پڑھا جاسکے گا۔

## باب 30

## کتاب گھر کی پیشکش

اس روز صبح سے ہی آسمان پر گھنے سیاہ بادلوں اور ہلکی بدلوں کے درمیان ایک دوسرے کو چھونے کی شرط بندھ چکی تھی اور سہ پہر تک ان سب نے مل کر آسمان کو پوری طرح ڈھک لیا۔ میں جب کیفے فراق کے سامنے پہنچا تو بارش کی بوندیں موٹی اور تیز تر ہو چکی تھیں۔ موئی نے برسات کے پیش نظر خدشہ ظاہر کیا کہ شاید لوگ زیادہ تعداد میں جمع نہ ہو پائیں لیکن جب میں نے مرزا کو باہر فٹ پاٹھ پر کوئی میز رکھنے کا اشارہ کیا جس پر کھڑے ہو کر میں اپنے لوگوں سے بات کر سکتا تب تک چھتریوں کا ایک انبار ہمارے اگر واکھا ہو چکا تھا۔ مرزا جلدی سے وہی میز اٹھا لایا جس کے گرد ہم دوستوں نے بچپن سے لے کر اب تک جانے کتنے اور ان گنت لمحے ہنستے مسکراتے گزارے تھے۔ میں میز پر کھڑا ہوا تو مشی، بالے اور راجہ نے اسے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ آج بھی میرے ساتھ ہمیرے وہی پرانے سہارے جڑے ہوئے تھے۔ بارش کی بوچھاڑنے مجھے پل بھر میں نہلا سا دیا، لیکن بابو کا لونی، سادات محلے اور آس پاس سے جوان، بزرگ، بوڑھے اور بچے لگلے چلے آرہے تھے۔ میری فورس کے نوجوان ایک جانب جمع تھے اور سڑک پر دور دور تک صرف سیاہ چھتریاں بچھی نظر آ رہی تھیں۔ پچھا فراق نے سردی کے پیش نظر چائے کا خصوصی انتظام بھی کر رکھا تھا۔ راجہ نے ان سے ادا نیگی کا پوچھا تو وہ روپڑے کہ ”ادا نیگی کرنی ہے تو پہلے ان چار سو ستر روپوں کی کرو جوانوں کا اب تک کا ادھار ہے۔ بولو کر پاؤ گے ادا؟“ راجہ لا جواب ہو گیا۔ واقعی ہم ساری عرب بھی کما کر پچھا فراق کی محبت کا وہ ادھار نہیں چکا سکتے تھے۔

میرے سامنے ان چہروں کا ہجوم اکٹھا ہوتا جا رہا تھا جنہیں میں بچپن سے اپنے اردو گرد دیکھا آیا تھا۔ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو مجھے اپنی گود میں کھلا چکے تھے وہ اپنے کانہوں پر مجھے بٹھا کر کیف فراق سے واپس میرے گھر تک چھوڑ کر آیا کرتے تھے۔ آج وہ سب یہاں جمع ہو کر یہ سننے آئے تھے کہ ان کا انوان سے کیا کہنا چاہتا ہے میں جانتا تھا کہ اب انہیں آئیں گے نہ ہی وہ ریحان کو میرے جلسے میں آنے کی اجازت دیں گے لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں میری نظر میں ان دونوں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ تقریر کے لیے کھڑے ہوتے ہی میرے لفظ کھونے لگے۔ جنہوں نے مجھے بولنا سکھایا تھا ان کے سامنے بھلا تقریر کیسی؟؟ بڑی مشکل سے میں نے خود کو مجتمع کیا۔

”میں آج یہاں آپ لوگوں کے سامنے کوئی تقریر کرنے نہیں آیا۔ نہ ہی میں نئے وعدوں اور امیدوں کا کوئی پرانا جال لے کر آیا ہوں میں جو بھی ہوں..... آپ کے سامنے ہوں اور جو تھا وہ بھی آپ سے بھی چھپا نہیں رہا..... میں کوئی لیدر، سیاست دان یا انقلابی بھی نہیں ہوں کہ اگلے چند ماہ میں اس سڑک اس محلے اور اس علاقے کی ہر برائی کسی انقلاب کے ذریعے ختم کرنے کا دعویٰ کر سکوں۔ میں تو بس آیاں ہوں۔ وہی پرانا انوجس نے یہاں کے بزرگوں کی انگلی پکڑ کر چلانا سیکھا ہے۔ وہی نالائق آیاں جس کی شرارتیوں پر آپ میں سے کہوں نے اس کے کان بھی کھینچے ہیں۔ جس کی حرکتوں سے تنگ آ کر خود اس کے اپانے اسے گھر بدر کر ڈالا۔ ہاں..... میں وہی آیاں ہوں..... اور میں یہاں آج آپ کے سامنے صرف ایک عہد کرنے آیا ہوں کہ میں منتخب ہو کر بھی ہمیشہ یہیں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ کوئی محل مجھے میرے جھونپڑے سے دور نہیں کر سکے گا۔ میں چلکی بجائے ہی

مہنگائی تو شاید دور نہ کرسکوں لیکن راشن کی لائن میں آخر میں آپ مجھے بھی قطار میں کھڑا دیکھیں گے۔ گھنی، آنا، چینی مہنگی ہوں گی تو میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ سڑک پر احتجاج کے لیے نکلوں گا جب آپ کے گھر اندر ہیرا ہو گا تو میں بھی اسی لوڈ شیڈنگ میں اپنے آنکن میں مچھروں کا سامنا کروں گا۔ باش کا پانی آپ کے کچے گھروں میں داخل ہو گا تو میرا کوارٹر بھی سوکھا نہیں رہ پائے گا۔ جس بس اسٹاپ پر آپ گھنٹوں سرکاری ٹرانسپورٹ کا انتظار کریں گے میں بھی اسی نوٹے شیڈ کے نیچے کھڑا رہوں گا، اور وہی بس مجھے بھی میرے دفتر پہنچایا کرے گی، اور ہم اسی طرح ساتھ رہ کر اپنی بات اور پرکی سرکارتک پہنچائیں گے۔ یاد رکھیں مجھے یہ سوچ کرو وہ ہرگز نہ ڈالیے گا کہ میں راتوں رات اس علاقے کی تقدیر بدل دوں گا۔ ہاں اس اعتماد کے ساتھ ضرور ڈالیے گا کہ تم پیر کرنے والوں میں سے کل آپ کا ایک اپنا بھی ہو گا۔ جو ہمیشہ آپ کے ساتھ اور آپ کے اندر موجود ہے گا۔“

میں بات ختم کر کے خاموشی سے نیچے اتر آیا۔ کچھ دیر تک چاروں طرف ایک سناٹا چھایا رہا اور پھر سب سے پہلے مرزا کے ہاتھ آپس میں مکراۓ اور پھر چند لمحوں میں تالیوں، نعروں اور سیٹیوں کا ایسا شور اٹھا کہ آس پاس سے گزرتی ٹریک رک گئی۔ راجہ، بالا اور مشی تینوں مجھے کھینچتے ہوئے کیف فراق کے ہال میں لے گئے ”یار انو..... تو نے یہ باتیں کہاں سے سیکھیں۔ کیا تیرانگا استاد وہاں اٹے پر یہ تعلیم بھی دیتا ہے؟.....“۔ میں مسکرایا۔ ”نہیں..... یہ باتیں وقت خود ہمیں سکھا جاتا ہے۔ البتہ مجھے یہ تعلیم ایک دوست سے ملی ہے..... ایک ایسا استاد جو خود کچھ سیکھنے کی چاہ میں مجھے بہت کچھ سکھا گیا.....“ میرے ذہن میں فضہ کی کوئی ہیئت نہ رہی۔ واقعی..... یہ لفظ اور یہ سوچ اسی کی چند روزہ رفاقت کی دین تھے۔ شام کو میں ریگل چوک اور ریلوے اسٹیشن پر دو مزید جلسے کرنے کے بعد یعقوب میشن واپس پہنچا تو رنگا احاطے میں ہی وہ راستادوں کے ساتھ موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ سب مسکرائے۔ رنگا نے مجھے اپنے قریب بٹھایا ”آگیا میرا سورا..... پہلے ہی دن جھنڈے گاڑ کے..... نہ ہے با بوكالونی میں بڑا زبردست بولا ہے تو..... تیرے مخالفوں کی نیندیں تو پہلے دن سے ہی حرام ہونے لگی ہیں۔ آیا تھا علاقے کا پرانا ایم پی اے کچھ دیر پہلے یہاں..... نوٹوں کا بریف کیس لے کر.....“ میں نے حیرت سے رنگا کو دیکھا ”نوٹ لے کر..... لیکن نوٹ کس لیے.....“۔

”تجھے اپنے حق میں بٹھانے کے لیے اور تیری حمایت کا رخ اپنی طرف موڑنے کے وعدے کے لیے.....“ میں اب بھی الجھا ہوا تھا ”لیکن ملک صاحب تو پچھلے کئی ایکش وہاں سے جیتنے آرہے ہیں میری حمایت تو بس علاقے کے ڈیڑھ دو سو بے روزگار نوجوان ہی کر رہے ہیں جنہیں سارا علاقہ لوفر کے نام سے پکارتے ہے۔ پھر مجھ سے خوف زدہ ہونے کی وجہ.....؟.....“ رنگا نے مسکرا کر موئی کی جانب دیکھا ”دیکھ لیا موئی..... یہ تیرالا ڈلا شاگرد بھی ابھی تک تیری ہی طرح نادان ہے..... تو دیکھ لینا..... آگے چل کر یہی ڈیڑھ دو سو کئی ہزار کے لشکر میں تبدیل نہ ہوئے تو میرا نام بھی رنگا نہیں..... اپنے ملک کی عوام کو بس ایک امید کا ہی تو سہارا رہتا ہے..... اور آج تو نے وہ امید ان کے دلوں میں جگاؤی ہے..... اب بہت دھیان سے رھیو..... تیرے دوستوں کے ساتھ ساتھ تیرے دشمنوں کی تعداد بھی روز بروز بڑھتی جائے گی.....“

اور پھر اگلے چند ہفتوں میں رنگا کی بات کچھ ثابت ہوتی گئی۔ میرے جلوں کا جنم بڑھنے لگا اور مخالفوں کی جانب سے مجھ پر مختلف الزامات کی بوچھاڑ بھی شروع ہو گئی۔ کسی نے مجھے مافیا کا ایجنسٹ قرار دیا تو کسی نے اسے رنگا استاد کی جانب سے اپنے بھاؤ بڑھانے کا گرتبا یا۔ بوزہ ہے گدھ آسمان پر ایکا کرنے کے لیے جمع ہونے لگے تھے اور مختلف اتحاد بننے اور ٹوٹنے لگے۔ سارنگا کو مختلف بڑی پارٹیوں کی جانب سے اپنے زنگ زدہ

اور پرانے آزمائے ہوئے دھڑوں کے ساتھ انضام کی پیش کش ہونے لگی۔ بڑے بڑے پارسا اور برائے نام اصولی سیاست کرنے والے اپنا ظاہری چولا اتار کر میدان میں مختلف تر اغیب کے ساتھ کو دپڑے۔ کچھ ”بڑے شرف“ نے پولیس اور قانون کی دھمکیاں بھی دیں اور کچھ چھپے ہوئے غنڈوں نے مصلحت کے انداز میں میری جان کو خطرہ ظاہر کرنے کا ڈھونگ بھی کیا۔ میں یہ سب حیرانی سے دیکھتا اور سوچتا رہتا کہ اگر رنگا میری پشت پر موجود نہ ہوتا تو شاید میں پہلے قدم پر ہی یا تو کسی ہسپتال میں گھائل یا پھر کسی حوالات میں مرغی یا بکری چوری کرنے کے الزام میں پڑا جھہ ماہ کی کاث رہا ہوتا۔ سارنگا نے موی کو کہہ کر امتحابی مہم کے دوران میری حفاظت کا غیر معمولی بندوبست بھی کروادیا تھا۔ پولنگ میں اب کچھ روز ہی باقی رہ گئے تھے۔ نواب صاحب بھی درمیان میں دو مرتبہ شہر کا چکر لگا چکے تھے۔ اسی دوران مجھے پاشا صاحب نے فضہ کا یہ پیغام پہنچایا کہ اسے میری کامیابی کا شدت سے انتظار ہے، اور وہ اب اسی دن مجھے سے آ کر ملے گی جب میری جیت کا ڈنکا چاروں طرف نک رہا ہوگا، لیکن ہمارے ہاں ایسی تبدیلیاں خون مانگتی ہیں اور ابھی میری کامیابی پر میرے کسی اپنے کے خون کا یہک لگانا باقی تھا شاید اس روز ہمیں ڈاک یارڈ کے ایریا میں جلسہ کرنا تھا۔ موی صبح سے انتظامات میں مصروف تھا۔ راجہ، مشی اور بالے نے اٹیج کا انتظام سنجال رکھا تھا اور باقی لڑکے پنڈال کے دیگر انتظامات کا جائزہ لے رہے تھے، لیکن جانے اس روز حکومت کی جانب سے فراہم کردہ سپاہیوں کی تعداد نصف سے بھی کم تھی۔ حوالدار نے بتایا کہ نفری کی کمی کی وجہ سے یہ مسئلہ درپیش تھا۔ اس روز بجوم بھی معمول سے کچھ زیادہ تھا اور لڑکوں سے سنجال نہیں منجل رہا تھا میں اٹیج پر چڑھا اور میں نے ہاتھ اٹھا کر لوگوں سے خاموش ہو جانے کی درخواست کی۔ ٹھیک اسی وقت فائر کی ایک آواز گونجی اور میرے دامیں جانب کھڑا ریگل چوک کا سلیم عرف سلوپٹ کر پیچھے گرا میں نے گھبرا کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کے شانے سے خون ابل ابل بہہ رہا تھا۔ فوراً ہی دوسرے فائر کی آواز آئی لیکن تب تک میرے دامیں کھڑا موی مجھے زور سے دھکا دے کر گرا چکا تھا۔ مگر گرتے گرتے بھی میں نے موی کے سینے سے خون کا ابلتا فوارہ دیکھ لیا تھا ایک افرافری مجھ گئی اور اڑے سے دابستہ لوگوں نے اگلے لمحے ہی انہا وہند ہوائی فائر گک شروع کر دی تاکہ حملہ آور ہمیں نہتا سمجھ کر مزید پیش رفت نہ کریں۔ گولی پر لی جانب کی کسی اوپنجی عمارت کی جانب سے چلتی ہی اور لڑکے پل بھر میں ہی اس عمارت کی چھت پر پہنچ چکے تھے لیکن وہاں انہیں سوائے دو چلی ہوئی گولیوں کے خالی خول کے علاوہ اور کچھ نہ ملا۔ چند لمحوں بعد ہی ہم موی اور سلوکو اپنی وین میں ڈالے قریبی ہسپتال کی جانب اڑے جا رہے تھے۔ موی کا سر میری گود میں تھا اور میرے کپڑے اس کے خون سے تربتہ ہو چکے تھے میں موی کے گال تھیچھا کرا سے ہوش میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ نہیں ہو گا تمہیں..... میں تمہیں اتنی آسانی سے نہیں جانے دوں گا..... ہوش کرو استاد.....“ موی نے ذرا دیر کے لیے آنکھیں کھولیں مجھے دیکھ کر مسکرا یا اور پھر بے ہوش نے اسے بے سدھ کر دیا۔ سلوکا شانہ بھی بری طرح گھائل تھا لیکن وہ ابھی ہوش میں تھا لیکن اذیت کے مارے شدت سے آنکھیں میچے وین کے فرش پر راجہ کی گود میں سر ڈالے پڑا ہوا تھا۔ سارنگا کو کسی نے جلسہ گاہ سے ہی اطلاع کر دی تھی اور وہ تقریباً ہمارے ساتھ ہی اڑے کے سینکڑوں لوگوں سمیت ہسپتال کے گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ ہسپتال میں ایک ساتھ اتنے بجوم کو دیکھ کر ایک سر ایمگی کی سیکیفیت پیدا ہو گئی اور ڈاکٹروں نے بہشکل ان سب کو ایک جنسی کے باہر والے گھاس کے میدان میں رکنے کی ایجاد کیں کر کے بجوم کو اندر آنے سے روکا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار رنگا کی آنکھیں بھیگی ہوئی دیکھیں ”ہوش کر موی..... اپنے استاد کے ساتھ یہ کھیل نہ کھیلنا..... ساتھ رہ ہیں ہیں ہمیشہ، ساتھ ہی چلیں گے سا جن.....“ لیکن رنگا کی باتوں کا جواب

دینے والا اور اس کے ہر حکم پر بلیک کہنے والا موسیٰ آج ہر سوال کے جواب میں خاموش تھا۔ سلوکو گھنٹے بھر بعد ایر جسی سے وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ وہ اب کچھ بہتر تھا لیکن موسیٰ کو جس آپریشن تھیز میں لے جایا گیا تھا اس کی سرخ میتی پانچ گھنٹے سے زیادہ جلتی رہی اور ہم سب کسی سولی پر منگے باہر راہداری میں خود اپنے ہی چہرے نوچتے رہے۔ کچھ ہی دیر میں ریحان بھی راجہ کے ساتھ ہانپتا کانپتا وہاں آگیا لیکن میری حالت کے پیش نظر وہ خاموش ہی رہا اور بس میرے شانے دبا کر اور گلے لگا کر تسلیاں ہی دیتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ میرے رشتؤں کی کتنی گہری گانٹھ ان انجانوں کے ساتھ بندھ چکی تھی۔ رات گئے نواب صاحب اور پاشا بھی شدید پریشانی کے عالم میں راہداری میں غمودار ہوئے، لیکن موسیٰ ابھی تک آپریشن تھیز میں تھا۔ جانے اس کی اندر کیا حالت تھی لیکن ہم سب یہاں باہر پل پل میں سو سوار جی کر رہے تھے۔ ہسپتال کے باہر جمع ہوتا علاقہ کے نوجوانوں کا ہجوم بے قابو ہوا تھا۔ اچانک میں نے اسی پی بلاں کو پریشانی کے عالم میں راہداری میں داخل ہوتے دیکھا۔

”ریگل چوک اور پابوکا لوٹی کے آس پاس ہنگامہ آرائی اور جلا و گھیرا و شروع ہو چکا ہے۔ وہاں کے نوجوان شر انگیزی پر آمادہ ہیں اور باہر ہجوم بھی بے قابو ہو چکا ہے۔ میری آپ لوگوں سے درخواست ہے کہ کوئی میرے ساتھ چل کر ان سے بات کرے ورنہ آج سارا شہر جل جائے گا.....“ گم سم بیٹھے سارنگا نے شاید اے ایس پی کی بات سنی ہی نہیں۔ مجبوراً میں دھیرے سے اٹھ کر بلاں کے ساتھ باہر گھاس کے میدان میں جمع پھرے ہجوم کے پاس پہنچا۔ ان سب نے مجھے دیکھ کر میرے حق میں نفرے لگانا شروع کر دیے۔ ایک جوشیلا لڑکا چیخ کر بولا ”ہم سارے شہر کو آگ لگادیں گے انو بھائی..... آج کوئی سرمایہ دار غدار نہیں بچے گا ہمارے ہاتھوں سے“ وہ سب ایک ساتھ چیختے گئے۔

میں نے بڑی مشکل سے ان سب کو چند لمحوں کے لیے خاموش کرایا۔ ”اس وقت موسیٰ بھائی کو آپ کی دعاوں کی ضرورت ہے۔ سلوکی جان اللہ نے بچالی ہے، لیکن اس کا خون بہت بہت بھی گیا ہے وہ بھی بستر پر پڑا اس منزل کو پانے کا انتظار کر رہا ہے جس کے لیے اس نے اپنا سیروں خون بھایا ہے“ دفعتہ ایک نوجوان آگے بڑھا اور اے ایس پی کی جانب اشارہ کر کے چلایا ”اس پولیس افسر سے پوچھ آیاں بھائی۔“ یہ اس وقت کہاں تھا جب تم پر گولیاں چل رہی تھیں تب ساری علاقہ پولیس کہاں غائب تھی۔ یہ سب ملے ہوئے ہیں آپس میں۔“

ایک بار پھر شور مج گیا۔ میں نے چلا کر کہا ”خدا کے لیے آپ سب ہوش میں آ جائیں۔“ دشمن یہی چاہتا ہے کہ ہم غصے میں اپنے حواس کھو کر ان کے منصوبے کے مطابق شہر میں ہنگاموں کے لیے نکل کھڑے ہوں تاکہ ہمارے درکار و وہر پولنگ کا دن جیل یا ہسپتال میں گزاریں۔ اپنا یہ غصہ ایکشن والے دن کے لیے بچا کر رکھیں اور اسے دشمن کے خلاف اپنے ووٹ کی صورت میں نکالیں۔ ایک بار ہم جیت گئے تو پھر ان سب سے بھی نہت لیں گے تب ہم اس پولیس سے بھی جواب مانگیں گے کہ جس دن ہم پر حملہ ہوا خاص اسی روز نفری کم کیوں ہوئی۔ ہم گولی چلانے والوں کو جواب دیں گے لیکن اپنے ووٹ کی صورت میں۔ یہ صرف میری نہیں، رنگا استاد کی بھی خواہش ہے۔ آپ سب چاہیں تو یہیں خاموشی سے دھرنادیں لیکن اس وقت بس دعا اور صرف دعا کریں یہی میری آپ سب سے التجا ہے۔“ میں نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ ان کے سامنے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ان سب نے سرجھ کا دیے اور پھر ہجوم میں سے ایک بزرگ نے باہر نکل کر دعا کے لیے ہاتھ فضا میں بلند کر دیے۔ باقی سب نے اس کی تقليد کی اور پھر ہم سب کی دعا نیں عرش سے نکرانے کے لیے آسمانوں کی جانب پرواز کرنے لگیں اور پھر نہ جانے کس کی دعا عرش پار کر گئی اور جب میں دوبارہ راہداری

میں پہنچا تو پاشا صاحب نے جلدی سے بڑھ کر میرے کان میں سرگوشی کی کہابھی ایک ڈاکٹر نے باہر آ کر بتایا ہے کہ موی نے کچھ دیر کے لیے آنکھیں کھوئی تھیں، لیکن ابھی اگلے چوبیس گھنٹے بہت زیادہ اہم ہیں۔ حالت بگڑ گئی تو سنبھالنا تقریباً ناممکن ہو جائے گا۔ میں نے کونے میں گم سم کھڑے سارنگا کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا ”وہ حرام خور ٹھیک تو ہو جائے گا ناساجن..... ایسا بے وفا تو بھی نہ تھا.....“ میں نے رنگا کا ہاتھ پکڑ لیا ”اے کچھ نہیں ہو گا..... قدرت اتنی بے رحم نہیں ہو سکتی استاد..... موی کو واپس لوٹا ہو گا۔ آپ کے لیے..... ہم سب کے لیے.....“ دفعہ تھا میرے کہنے پر بلوے کیے۔ لوگوں کو اٹھایا۔ انہیں مارا پیٹا، کاٹ ڈالا ہر آگ میں آنکھیں بند کر کے کو دتا چلا گیا۔ پر آج میں کتنا بے بس ہوں کہ جب اسے میری ضرورت ہے تو میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اس حرام خور کا تو خون بھی الگ نمبر کا ہے..... میرا خون بھی اس کے کسی کام کا نہیں..... اگر وہ اس طرح اوپر چلا گیا تو میں اوپر والے کو کیا جواب دوں گا؟..... اس کو تو کوئی جواب دینا بھی نہیں آتا..... خدا نے اس سے کچھ پوچھا تو وہ نیچے میری جانب ہی دیکھے گا۔ اور میرے پاس اس کے کسی سوال کا جواب نہیں ہو گا۔“

میں رنگا کی پیٹھے چھپتار ہا۔ سارے زمانے کے لیے دہشت کی علامت سارنگا کو آج کوئی یوں معصوم بچوں کی طرح روتے دیکھتا تو شاید کبھی یقین نہ کرتا لیکن زندگی ایسی ہی انہوں نوں کا نام ہے۔ کہیں پھر وہ سے چشمے نکل آتے ہیں اور کہیں آنکھوں کا پانی بھی سوکھ کر پھر بن جاتا ہے۔

## کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

## دو بوندیں ساون کی

### کتاب گھر کی پیشکش

دو بوندیں ساون کی، ترجمہ ہے جیفری آرچر کے شہرہ آفاق ناول کیں اینڈ ایبل کا جسے اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے علیم الحق حقی نے۔ دو بوندیں ساون کی کہانی ہے دو ایسے افراد کی جو ایک دوسرے سے شدید لغافت کرتے تھے اور ایک دوسرے کو شکست دینے اور بتاہ و بر باد کرنے کے درپے تھے۔ ان میں سے ایک منہ میں سونے کا چیج لے کر پیدا ہوا اور دوسرا در بدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ ایک شخص نے دنیا کے بہترین تعلیمی اداروں سے تعلیم پائی اور دوسرے کا استاذ زمانہ تھا۔

### کتاب گھر کی پیشکش

یہ ناول کتاب گھر کے **معاشرتی اصلاحی ناول** سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

## باب 31

## کتاب گھر کی پیشکش

اور پھر مویٰ نے دوبارہ آنکھیں کھولنے میں پورے تین دن لگا دیے اور یہ تین دن ہم سب نے اس کے کمرے کی باہروالی راہداری کے حفظت کی کڑیاں گئتے، اپنے پیروں پر کھڑے کھڑے گزار دیے، راجہ، فرشی اور بالے نے میری انتخابی مہم سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن میری غیر موجودگی کی وجہ سے اس کا گراف تیزی سے یخچے گرتا چلا گیا۔ میرے ورکرلٹ کے چلاتے رہے کہ ان آخری چند دنوں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور میرے جلوسوں سے غیر موجودگی کا فائدہ علاقے کا پرانا ایم پی اے خوب اٹھا رہا ہے اور وہ لوگوں میں یہ تاثر پھیلا رہا ہے کہ میں مقابلہ شروع ہونے سے پہلے ہی میدان چھوڑ گیا ہوں لیکن میرے لیے اس وقت مویٰ کی جان اور صحت سے بڑھ کر اور کچھ نہیں تھا۔ رنگانے بھی مجھ سے کئی بار کہا کہ منزل کے اتنے قریب پہنچ کر اب میں اُسے اپنے ہاتھ سے کیوں کھو رہا ہوں، مویٰ کا معاملہ اللہ کے پروردگر کے اپنے محاذ پر نکل پڑوں لیکن رنگا خود بھی جانتا تھا کہ میں مویٰ کو یوں زندگی اور موت کی سرحد کے درمیان چھوڑ کر ہمیں نہیں جاؤں گا، اور پھر قدرت کو ہم پر رحم آہی گیا اور تیرے دن شام کو ڈاکٹرنے آ کر ہمیں اطلاع دی کہ مویٰ کو ہوش آ گیا ہے، لیکن فی الحال ہم اُسے بے آرام نہ کریں تو بہتر ہے۔ یعقوب میشن میں سات روز کے لیے نیاز کا لٹکر کھوں دیا گیا، رنگا کچھ یوں سجدے میں گرا کر پھر ہم نے اُسے گھنٹوں اٹھتے نہیں دیکھا۔ جامع مسجد کے جس امام کو مویٰ کی صحت یابی کے لیے خصوصی دعا کی درخواست کی گئی تھی۔ اُن سے ملنے کے لیے سارا یعقوب میشن رنگا سمیت پیدل چل کر جامع مسجد پہنچ گیا۔ شہر کا ہر ضرورت مند، مفلس اور بھکاری اس روزاڑے کے دروازے سے سارنگا کے ہاتھوں کچھ نہ کچھ لے کر ہی گیا۔ اگلی صبح ہمیں تھوڑی دیر کے لیے مویٰ کے کمرے میں جانے کی اجازت ملی۔ ہمیں دیکھ کر مویٰ کے زرد چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ رنگانے اس کا ہاتھ تھام لیا "اوکتنی روٹیاں توڑے گا تو اس ہسپتال کے لٹکر کی مویٰ چل اب گھر چلیں....."۔ مویٰ پنس دیا، لیکن اس کی آواز نقاہت سے بھر پورتھی "ہسپتال کا لٹکر پکھے بھی تو کتنے سال بیت گئے ہیں استاد..... یاد ہے پچھلی مرتبہ ہم دونوں ایک ساتھ ہی بھرتی ہوئے تھے....." رنگا کی آنکھیں نہ ہونے لگیں "ہاں..... پاس بارٹونے بڑی غداری کی مویٰ ..... پڑا ستایا ہے ٹو نے ہم سب کو..... اور یہ تیرا شہزادہ..... دیکھا پنا سارا راج پاٹ چھوڑ کر تیرے سرہانے سے لگا کھڑا ہے کتنے دن سے..... یہ بھی تیری طرح بڑا ضدی ہے..... کسی کی نہیں مانتا ب ٹو خود ہی اسے سمجھا دے ذرا....."

مویٰ کو جب پتہ چلا کہ میں نے تقریباً اپنی ایکشن مہم ختم ہی کر دی ہے تو وہ شدید بے چیں ہو گیا۔ "نہیں شہزادے..... یہ کیا کیا تم نے لڑے بغیر ہی جگ ہار دی..... کیا تم میرا بہا خون بھی ضائع جانے دو گے..... میرا بدلتے نہیں لوگے ان لوگوں سے....." میں نے مویٰ کا ہاتھ خپچھپایا "تم ٹھیک ہو کر گھر واپس آ جاؤ..... یہی میری سب سے بڑی جیت ہو گی..... ویسے بھی۔ میرے بہت سے دن ضائع ہو چکے ہیں اور کل تو انتخابی مہم کا آخری دن ہے،" لیکن مویٰ کہاں مانتے والا تھا "چاہے کچھ بھی ہو جائے..... لیکن یوں لڑے بغیر ہم کسی کے لیے میدان خالی نہیں چھوڑیں گے..... ہر استاد اپنے شاگرد سے اپنے گر کی کوئی بھینٹ چاہتا ہے..... آج میں بھی تم سے اپنی اسٹادی کا معاوضہ مانگتا ہوں، اور میری بھینٹ یہی ہے کہ تم اپنی

جنگ آخوند لڑو..... ہاریا جیت کے نتیجے کی پرواد کیے بغیر ڈٹ کر مقابلہ کرو....."

اتنے میں پاشانے کرے میں آ کر نواب صاحب کو اطلاع دی کہ حولیٰ کامینیجر خانم کا کوئی پیغام لے کر آیا ہے۔ نواب صاحب نے اسے کرے میں ہی بھالیا اور جب حمید کرے میں داخل ہوا تو وہ ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھ کر تھیں جس کو رکھ کر رک گیا۔ میں خود بھی بالکل ہی بھلا بیٹھا تھا کہ خود میں نے ہی شیخ صاحب کو کھلوا کر حمید کو زمرد حولیٰ کے مینیجر کی نوکری کے لیے نواب صاحب کے ہاں بھجوایا تھا۔

<http://kitaabghar.com>

حمید نے جلد ہی اپنے حواس پر قابو پا کر خانم کا پیغام نواب صاحب کو دے دیا۔ دراصل خانم مویٰ کی صحت یا بی کے بارے میں فکر مند تھیں اور انہوں نے اپنے طور پر نواب صاحب سے اجازت بھی طلب کی تھی کہ وہ مویٰ کی صحت کے لیے حولیٰ میں ختم قرآن اور خصوصی دعا کی محفل منعقد کرنا چاہتی ہیں۔ نواب صاحب مسکرائے "ہاں ہاں بھی کیوں نہیں..... اس میں بھلا اجازت طلب کرنے والی کیا بات ہے..... اور میاں تم جا کر خانم بی کو یہ بھی بتا دینا کہ مویٰ استاد کی حالت اب بہت بہتر ہے، اور ہم سب انہی کے ساتھ ہیں۔" حمید نے سر ہلا کیا۔ وہ بھی تک اس حرمت سے ہی نہیں نکل پایا تھا کہ نواب صاحب جیسے وضع دار شخص کا ان اؤے کے لوگوں کے ساتھ بھلا کیا رابطہ؟ اور تعلق بھی ایسا کہ گذشتہ تین دن سے وہ اسی ہستال میں ایک ایسے شخص کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے تھے کہ جسے سارا زمانہ ایک غنڈے کی حیثیت سے جانتا ہے۔ میں چپ رہا۔ نواب صاحب نے خانم کا بھیجا ہوار قعہ پڑھنے کے بعد اپنی شیر و انی کی جیب میں ڈال لیا اور میری طرف پلٹے "اور آیاں میاں..... تمہارے لیے بھی خانم بی کا خاص حکم نامہ ہے کہ انتخابات کے بعد پہلی فرصت میں زمرد حولیٰ کا چکر لگاؤ۔ وہاں سب تمہیں اور نہ ہمید بٹیا کو بہت یاد کرتے ہیں۔" میں سر ہلا کر رہا گیا۔ نواب صاحب نے حمید کو حولیٰ کے انتظامی معاملات کے بارے میں چند مزید ہدایات دے کر واپس بھیج دیا۔ کچھ دیر بعد میں کسی کام سے باہر نکلا تو حمید بھی تک حولیٰ کے پرانے ڈرائیور کے ساتھ ہستال کے احاطے میں موجود تھا۔ مجھے باہر نکلا دیکھ کر وہ تیزی سے میری جانب بڑھا "میں سوچ رہا تھا کہ آپ کو کس طرح کرے سے باہر آنے کا کہوں..... اسی شش و پنج میں بھی تک میہیں کھڑا ہوں....." میں نے اسے غور سے دیکھا "کیوں..... سب خیریت تو ہے..... آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں....." حمید اب بھی کچھ الجھا ہوا تھا "جب اب اے مجھے اپنے طور پر قعہ لکھ کر زمرد حولیٰ میں پاشا صاحب سے ملنے کا کہا، میں تب ہی سے سوچ رہا تھا کہ ان کی واقفیت اتنے بڑے لوگوں کے ساتھ کب اور کیسے ہوئی تھی کہ صرف ان کے ایک رقعے پر مجھے مینیجر کی نوکری دے دی گئی۔ آج مجھے اپنے اس سوال کا جواب تو مل گیا..... لیکن ذہن میں کچھ نئے سوال بھی جنم لے چکے ہیں....." میں نے اسے تسلی دی "اپنے دل میں کسی وہم کو جگہ مت دیجئے..... آپ کو آپ کی الہیت کے مطابق تو کری ملی ہے..... جسے آپ ثابت بھی کر رہے ہیں..... اور یقین جائیے کہ اس بار آپ کا پالا بہت اعلیٰ ظرف اور خاندانی لوگوں کے ساتھ پڑا ہے..... ان کی اؤے کے کسی شخص کے ساتھ وابستگی سے کوئی غلط اندازہ نہ لگا لیجئے گا۔" حمید گم سما کھڑا تھا "آج احساس ہو رہا ہے کہ میرے گذشتہ اندازے بھی کچھ درست ثابت نہیں ہوئے۔ ہو سکے تو میری معدودت قبول کر لیں۔ شاید میں بہت ظاہر پرست ہوں" میں نے حمید کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے سب بھول جانے کا کہا اور خود آگے بڑھ گیا۔ ہستال کے احاطے میں جمع چندور کر لڑکوں کو شام کے لیے ہدایات دے کر میں کرے میں واپس لوٹ آیا۔ میں نے مویٰ کی خاطر یہ ہاری ہوئی لڑائی لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ اب میرے پاس وقت تقریباً ختم ہو چکا ہے لیکن اپنے محسن اور اپنے استاد کو چڑھاوا چڑھانے کے لیے

میں نے یہ آخری بازی لڑنے کی ٹھان لی تھی شام کو میں نے کیفے فرق سے دوبارہ اپنی ہم کا آغاز کیا اور وہ رات ہم نے جاگ کر گزاری۔ میرے ساتھ رنگا کے دو ذاتی محافظ اور میرے کارندے لڑکوں کا ہجوم تھا اور ہم نے کیفے فرق ریگل چوک، ڈاک یارڈ، پھول گمرا اور سادات محلے کا ہر دروازہ کھلکھلا دالا۔ سادات محلے میں شیخ صاحب کی گلی میں داخل ہوتے وقت میرا دل اُسی وجہی انداز میں دھڑکا۔ وقت نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ کہاں وہ کھلنڈر لا پرواہ اور بے فکر انسانوں اور کہاں یہ ذمہ دار یوں اور فرانچ کے نیچے جھکا آیا۔؟

میں شیخ صاحب کے دروازے تک نہیں جانا چاہتا تھا لیکن گلی میں شور سن کروہ خود ہی باہر نکل آئے اور پھر مجھے دیکھ کر وہ یوں بتاپی سے میری جانب لپکے جیسے کوئی اپنے کسی صدیوں سے پچھرے عزیز کی جانب لپکتا ہے۔ ”کہاں چلے گئے تھے آیاں میاں..... بھی میں تواب تم سے ملنے کی امید ہی چھوڑ بیٹھا تھا..... بس شہر کی دیواروں پر لگے پوسٹرز پر ہی تمہارا دیدار ہوتا ہے اب تو..... کوئی ایسا بھی کرتا ہے بھلا اپنوں کے ساتھ ؟؟؟“ میں شیخ صاحب کے گلے شکوؤں کے جواب میں صرف مسکرا کر ہوں ہاں ہی کرتا رہا۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر اتنا تھا جیسے انہیں پھر سے میرے کہیں کھو جانے کا شک ہو۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ فرصت ملتے ہی ضرور ان سے تفصیلی ملاقات ہو گی لیکن وہ بگڑ گئے ”کیا مطلب..... اب کیا دروازے سے یونہی پٹ جاؤ گے..... ایسا ہر گز نہ ہو گا، دو گھنی کے لیے تو تمہیں گھر چلنا ہی ہو گا..... شیخانی جی کئی بار تمہارے بارے میں پوچھ چکلی ہیں..... اور وہ سب حمید کی توکری کے لیے بھی تمہارے بے حد شکر گزار ہیں..... ان سب کا دل توڑ دو گے کیا.....؟“

میں نے بے چارگی سے راجہ اور بالے کی طرف دیکھا۔ مشی نے سر بلکر مجھے ان کے ساتھ جانے کے لیے کہا کہ وہ جب تک سادات محلے کی دیواروں پر میرے بقیہ اشتہار چپاں کرتے ہیں، تب تک میں کچھ دیر کے لیے شیخ صاحب کے ہاں سے ہواؤں، میں شیخ صاحب کے ساتھ ان کے صحن میں داخل ہوا تو موہیے کی اُسی مخصوص خوبصورتی میرے حواس معطر کرنا شروع کر دیے جوان کے صحن کی کیاری میں ستون کے ساتھ لپٹنی بیل سے پھوٹتی تھی۔ ستارہ اور شیخانی جی برآمدے میں ہی کھڑی تھیں۔ شاید انہیں میری گلی میں آمد کی خبر پہلے ہی مل چکی تھی۔ شیخانی جی نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر میری کامیابی کے لیے بہت ساری دعا میں کرڈا ہیں۔ ستارہ نے شکوہ کیا، ”آپ تو ہمارے گھر کا راستہ ہی بھول گئے آیاں صاحب..... ابھی سے یہ حال ہے اپنے ووڑز کے ساتھ بے زخمی کا تو آگے چل کر کیا ہو گا.....؟“ ستارہ کی بات پر شیخ صاحب اور شیخانی جی زور سے نہ پڑے۔ گھنا کہیں نظر نہیں آ رہی تھی اور جانے کیوں آج میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ میرے سامنے نہ ہی آئے تو اچھا ہے کہیں برسوں کی ”مشقِ جدائی“ اور ریاضت پل بھر میں خاک نہ ہو جائے۔

شیخ صاحب مجھے بیٹھک میں بٹھا کر چند لمحوں کی اجازت لے کر باہر نکل گئے۔ میں گم سا بیٹھا کمرے کے درود دیوار کو نکتارہ۔ اچاک درمیانی پر دے کے پیچھے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ میں سمجھا ستارہ یا شیخانی جی چائے لے کر آئی ہیں، میری نظر اٹھی اور وہ مجھے دروازے کے پیچوں بیج کھڑی دکھائی دی۔ ہاں..... وہ گھنا ہی تھی، وہی..... سرتاپا گھنا..... سفید جوڑے پر وہی سیاہ شال..... گلابی مہتاب چہرے کو چھوٹی وہی ایک شریری لٹ..... کون کہتا ہے کہ بثات صرف ایک تغیر کو ہے زمانے میں..... اور بھی بہت کچھ ایسا ہے جو کبھی بدلتا نہیں..... اُس کا یہ حصہ بے پرواہ..... یہ بھی تو سدا یوں قائم رہنے والا تھا۔ میں گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا، لیکن آج اُس کی وہ روائی شوئی مفقودی تھی۔ وہ کچھ ابھی ابھی..... کچھ کھوئی کھوئی

تھی۔ آداب کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا ”بہت دنوں کے بعد آپ کو ہماری یاد آئی۔ اور وہ بھی شائد ابا کے اصرار پر۔۔۔“ میں چپ رہا اس نے میری خاموشی کو معنی پہنادیے ”حمدید بھائی آج سے پہلے کو کچھ دیر کے لیے گھر آئے تھے جو میلی لوٹنے سے پہلے۔ وہ آپ سے اپنی آخری ملاقات اور رویے پر بہت شرمندہ تھے۔۔۔“ میں نے چونکہ کراؤ سے دیکھا۔ اس کا مطلب جس دن اس بیٹھک میں میری حمید کے ساتھ آخری ملاقات ہوئی تھی، پر دے کے پیچھے ہماری بات سننے والی گھنائی تھی۔ میں نے اس کا بوجھ ہلاکا کرنے کی خاطر کہا ”آپ کے بھیانے اس روز بھی کوئی غلط بات نہیں کہی تھی۔ ایک بھائی کو اپنی بہنوں کے لیے اسی قدر فکر مند ہونا چاہیے۔۔۔“

”ہاں لیکن دوسرا کوئی اتنی اعلیٰ ظرفی کا شہوت نہیں دے سکتا تھا۔ آپ نے ان کی نوکری پکی کرو اکر ابا کی بہت بڑی فکر دور کر دی ہے۔

انہوں نے آج تک یہ بات حمید بھائی سے چھپا کر کھی تھی لیکن آج آپ سے ملاقات کے بعد یہ راز بھی ان پر کھل ہی گیا۔ وہ بتارہے تھے کہ اب تو آپ ایک طرح سے ان کے مالکوں میں شمار ہوتے ہیں۔ میں نے جلدی سے صحیح کی ”نہیں نہیں۔۔۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔۔۔ نواب صاحب تو بس ایک مہربان بزرگ کی طرح ہیں۔۔۔ اور یہ ان کا بڑا پن ہے کہ وہ مجھے اپنے قریب محسوس کرتے ہیں۔۔۔“ لیکن گھننا آج کچھ اور ہی تھی۔ ”نہیں۔۔۔ حمید بھائی نے بتایا کہ زمرد حویلی میں بھی سب چوبیں گھنٹے آپ ہی کے گن گاتے ہیں، اور نواب صاحب تو آپ اور آپ سے جڑے لوگوں کے بغیر سانس تک نہیں لیتے۔۔۔ آپ مجھے یہ بتائیں۔۔۔ اتنے بہت سے لوگوں کو کیسے جوڑے رکھتے ہیں آپ اپنے ساتھ۔ میں نے اپنی نظریں جھکائے رکھیں۔

”جو آپ سے چھوٹ گئے۔۔۔ یہ ان کی اپنی قسم ہے۔۔۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جلد وہ سب ایک بار پھر آپ کے ساتھ ہوں گے۔۔۔“

ہم سب نے آپ کی کامیابی کے لیے بہت دعا میں کی ہیں۔ میں نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی نظر جھک گئی۔ مجھے ہمیشہ کے لیے مات دینے والا آج میری جیت کی دعا کر رہا تھا۔ اس کے ہونٹ لرز سے گئے۔ وہ مزید کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ٹھیک اُسی وقت ستارہ اور شیخانی چائے کے اوازات کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور گہننا پکھ کہے اندر پلٹ گئی۔ کچھ دیر میں شیخ صاحب بھی تنوری سمیت بیٹھک میں داخل ہوئے ”معاف کرنا میاں۔۔۔“ میں ذرا سامنے والی گلی سے تنوری کو بلا نے گیا تھا۔ یہ آج کل وہیں چند دوسرے طالب علموں کے ساتھ مقابلے کے امتحان کی تیاری کرتے ہیں سارا دن۔ تحریری امتحان تو پاس کر لیا ہے اب اللہ کرے کہ زبانی امتحان میں بھی سرخرو ہو جائیں۔۔۔ میں نے تنوری کو تحریری امتحان کی کامیابی پر بہت مبارک باد دی۔ اس نے بتایا کہ اگلے ہفتے ہی اس کا زبانی امتحان (Viva) ہے، اور اس نے اپنی طرف سے تیاری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ میں نے اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کیا اور شیخ صاحب سے واپسی کی اجازت چاہی۔ چلتے چلتے شیخ صاحب نے مجھے یہ اطلاع بھی دی کہ حمید چاہتا ہے کہ اس کے گھر والے اب زمرد حویلی کے اس کوارٹر میں منتقل ہو جائیں جو نواب صاحب نے اُسے بطور مینجر الائٹ کیا ہے۔ کیونکہ اس کی نوکری کے فرائض کچھ ایسے ہیں کہ اُسے چوبیں گھنٹے حویلی میں ہی گزارنے پڑتے ہیں۔ شیخ صاحب کے بقول وہ ہفتہ بھر میں حویلی کے کوارٹر میں منتقل ہو جائیں گے۔

میں نے انہیں تسلی دی کہ وہاں ان کا پالاظرف والوں سے ہی پڑے گا ہذا وہ اطمینان سے روانگی کی تیاری کریں۔

میں رات کو دیر سے یعقوب میشن پہنچا، رات بارہ بجے بھی امیدواروں کی مهم ختم ہو چکی تھی لیکن مجھے لوٹنے لوٹنے منع گئے۔ میں

آخری جلے کے بعد مویٰ کو دیکھنے ہستال پہنچا تو وہ اور رنگا میرے ہی انتظار میں تھے۔ میں نے مویٰ کے سرہانے بیٹھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تحام لیا "میں نے تمہاری ضد پوری کر دی..... اور اب تمہیں میری مان کر جلد از جلد یہ بستر چھوڑ کر پھر سے ہمارے ساتھ کھڑا ہونا ہو گا۔ تم جانتے ہو مجھے تمہارے ہنا چلنے کی عادت نہیں ہے....." رنگا نے میرا شانہ دبایا، "یہ بڑا حرام خور ہے جما..... اسے کھینچ کر یہاں سے لے جانا ہو گا اور نہ اس کی بڑیوں کو بھی زنگ لگ جائے گا۔" مویٰ ہم دونوں کی باتیں سن کر مسکراتا رہا۔ رنگا نے زبردستی مجھے کچھ دیر کے لیے میشن بھیج دیا کہ میں کچھ دیر کے لیے کمرنا کا اول لیکن میں اپنے کمرے میں پہنچ کر بھی بقیہ ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتا رہا، گھنٹا کی وہ بے چین آنکھیں مجھے تمام شب ستاتی رہیں، اور میں خود کو کوستارا کہ سب کچھ جانتے بوجھتے میں بار بار پلٹ کر اس کو چڑھا میں جاتا ہی کیوں ہوں؟ اب تو تنوری نے اس جھاکش کی فرمائش پر مقابلے کا امتحان بھی پاس کر لیا ہے اور چند دن میں وہ آخری مرحلے سے گزرنے کے بعد افسر بن جائے گا..... ویسا ہی افسر جیسا گھنٹا کے خوابوں میں بتا تھا۔ جس وقت تنوری مجھے اپنے تحریری امتحان میں کامیاب ہونے کی نوید دے رہا تھا اس لمحے میں نے اس کی آنکھوں میں وہی خواب بسا ہوا دیکھ لیا تھا جو گھنٹا کی پلکوں تلے پلتا تھا، مگر آج گھنٹا کی آنکھیں بے خواب سی کیوں تھیں؟ یونہی آنکھوں آنکھوں میں میری رات بھی ہنا کسی خواب کے کٹ ہی گئی۔

کہتے ہیں خواب ہمیشہ بڑے دیکھنے چاہیں تاکہ تعبیر بھی بڑی ملے، لیکن مجھے جیسے سور یہ سر کیا کریں کہ جن کی قسمت میں کوئی خواب ہی نہ ہو.....؟" ایک دن کے بعد پولنگ تھی اور شہر کا ماحول تاؤ کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔ رنگا نے اس روز خاص طور پر مجھے ہستال سے تھا کہیں باہر جانے سے منع کر رکھا تھا اور میں دن بھر مویٰ کے کمرے میں ہی اس کے ساتھ بیٹھا رہا۔ جانے کیوں مجھے اب کسی بھی چیز کے نتیجے سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ امتحان کا مزہ تک تک ہی رہتا ہے جب تک ہمیں کسی اچھے نتیجے کی آس یا بدے نتیجے کا خوف رہتا ہے، لیکن اگر ہم اس آس اور خوف کی کیفیت ہی سے باہر نکل آئیں تو پھر کوئی امتحان، امتحان نہیں رہتا، بس ایک معمول بن جاتا ہے۔ میں بھی کسی "معمول" کی طرح بیٹھا اپنے سامنے اپنے باقی تمام ساتھیوں کو رنگا کی سربراہی میں اگلے روز ہونے والے اس امتحان کی تیاری کرتے ہوئے دیکھتا رہا، مگر خود میرے اندر ہاڑیا جیت کی تحریک شاہد ثتم ہو چکی تھی۔ جو اپنی زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار چکا ہوا سے پھر بھلا ان معمولی بازیوں سے کیا سروکار.....؟؟؟

آخر کار پولنگ کا دن بھی آن پہنچا۔ رنگا اپنی جیپ میں مجھے بٹھا کر خود ڈرائیور نگ کرتے ہوئے میرے حلقت کا جائزہ لینے کے لیے صبح سویرے اپنے باقی لشکر کے ساتھ نکل پڑا، مویٰ نے جاتے وقت میرے سر پر ہاتھوڑ کر دعا دی اور اس کی آنکھیں نہ ہو گئیں۔ مجھے سے پھر کمرے میں رکانہیں گیا اور میں تیزی سے باہر نکل آیا۔ دھوپ چڑھتے ہی پولنگ اور ووڑوں کا مزاج بھی گرم ہوتا چلا گیا۔

شہر میں جا بجا دنگے فساد کی خبریں پھیل رہی تھیں، اور مختلف اپنے حریفوں کو پچھاڑنے کے لیے اس روز ہر جربہ آزمائے کو تیار تھے۔ صبح سورے سے گیارہ بجے تک ہمارے پولنگ ایشیش تقریباً اور ان پڑے رہے، میری تین چاروں کی اپنی گہم سے غیر حاضری کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ سارنگا بھی کسی گھری سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آیا۔ "کیا کہتا ہے ساجن..... ٹو بولے تو لڑکوں سے کہہ کر تیرے حلقت کی ساری پولنگ بند کروا دوں.....؟" یہاں کا ایکشن ہی ختم کرائے دیتے ہیں..... میں نے نفی میں سرہلا یا، نہیں..... اگر دھاندی سے ہی جیتے تو پھر ہم میں اور ان میں فرق کیا رہ جائے گا جو آج سے پہلے بھی آپ کی طاقت کے بل پر جیتے آئے ہیں۔ میں آج ہار بھی گیا تو ہم سب اسے آپ کی طرف سے انہیں ملی

فوتوحات کا کفارہ سمجھ کر قبول کریں گے..... بے ایمانی کی جیت سے ایمان داری کی ہار ہزار ہا بہتر ہے۔ ”رنگا نے میرا شانہ تھپٹھپایا۔۔۔۔۔ ”ٹھیک ہے سجن۔۔۔ آج تیری خاطر یہ پہلی ہار بھی قبول ہے سارنگا کو۔۔۔۔۔“

سارنگا اور میں نے اپنا ووٹ کیفے فراق کے چیچے بنے پر ائمہ اسکول کے پونگ اشیشن میں ڈالا اور پھر اچاکنک ہی سے دوپھر بارہ بجے کے بعد رفتہ رفتہ لوگوں کا ہجوم بڑھنے لگا۔ میرے پونگ بوٹھس (Polling Booths) پر نوجوانوں کے ٹھکنے نظر آنے لگے۔ یہ سارے آس پاس کے علاقوں کے وہ نوجوان تھے جن کی آنکھی بارہ بجے دن کو ٹھلتی ہے۔ چند ایک اشیشنوں پر رنگا کے کارندوں اور دیگر امیدواروں کے ورکرز کے درمیان ہاتھا پائی اور سر پھٹوں بھی ہوئی لیکن رنگا کو ان حالات کا تجربہ باقی سب سے کہیں زیادہ تھا۔ لہذا اس کے بندوں نے جلد ہی حالات پر قابو پا لیا۔ سہ پھر تین بجے تک میرے اور میرے مخالفین کے حامیوں کی تعداد تقریباً برابر نظر آنے لگی تھی، لیکن صحیح کے تین گھنٹے کا وقت اب بھی میرے خسارے میں شامل تھا۔ شام ساڑھے چار بجے جب پونگ کا وقت ختم ہونے میں صرف آدھا گھنٹہ باقی رہ گیا تھا، رنگا مجھے لے کر کیفے فراق کے پچھلے اشیشن پر آگیا اور ہم وہیں صحن میں درخت تمل پچھی کر سیوں پر بیٹھ گئے۔ یہ وہی پر ائمہ اسکول تھا جہاں میں راجہ، بالا اور فرشی پڑھا کرتے تھے، اور آج بھی وہی تینوں اس پونگ اشیشن کے انتظامات سنجال رہے تھے۔ ہم اپنی بازی کا آخری داؤ کھیل چکے تھے اور اب صرف پتے پلٹے جانے کا انتظار باقی تھا، اور پھر اچاکنک میں نے جودی کھاواہ میرے ہوش اور گمان کی سرحد سے بالکل پرے تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا اور میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ریحان ابا کو لیے میرے پونگ اشیشن کے گیٹ سے اندر داخل ہو رہا تھا۔



## کتاب گھر کی پیشکش پارس کتاب گھر کی پیشکش

رخانہ نگار عدنان کی خوبصورت تخلیق..... معاشرتی اصلاحی ناول پارس کہانی ہے ایک لا ابالی کمن لڑکی کی، جس کی زندگی اچاکنک اُس پرناہ مہربان ہو گئی تھی۔ یہ ناول ہمارے معاشرے کے ایک اور چہرے کو بھی بخوبی اور واضح طور پر دکھاتا ہے اور یہ پہلو ہے ہائی سوسائٹی اور ان میں موجود برگ فیلمیز اور نئی گزی ہوئی نسل۔ پارس ایک ایسے نوجوان کی کہانی بھی ہے جو زندگی میں ترقی اور آگے بڑھنے کے لیے شارت کث چاہتا تھا۔ قسمت نے ان دونوں کو ملا دیا اور کہانی نے نیا رخ لے لیا۔ پارس ناول کتاب گھر کے **رومانی معاشرتی** سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

## باب 32

## کتاب گھر کی پیشکش

چند لمحوں کے لیے تو مجھے یوں لگا کہ جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں، لیکن وہ تعبیر تھی۔ میری زندگی بھر کے دیکھے ہوئے خوابوں کی تعبیر۔..... کہ کبھی ابا مجھ پر بھی اتنا ہی اعتقاد اور اعتبار کریں جتنا انہیں ریحان پر تھا، میں یونہی گم سم کھڑا ان دونوں کو دیکھتا رہا اور وہ چلتے ہوئے میرے قریب پہنچ گئے۔ رنگا بھی ابا کو دیکھ کر حیرت سے کھڑا ہو گیا۔ میرے منہ سے سلام کے لفظ بھی نہ نکل پائے۔ ریحان نے مجھے ہوش میں لانے کے لیے زور سے کھنکا کر کہا ”کہاں گم ہو..... ابا تمہیں ووٹ ڈالنے کے لیے یہاں تک چل کر آئے ہیں.....“ میرے حلق میں نمکین پانی کا پھنڈہ سا کستا چلا گیا اور میری آنکھیں بھی گینے لگیں، میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر میری آواز بیٹھ چکی تھی۔ ابا نے اپنی چھڑی کا دستہ میری گردن میں ڈالا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وہ بچپن میں ڈائٹ اور مجھے سرزنش کرنے کے لیے اُسے میری گردن میں پھنساتے تھے ”مجھے تمہاری جیت یا ہار سے کوئی غرض نہیں ہے نالائق..... لیکن اگر جیت کر تم نے اپنے وہ سارے وعدے پورے نہیں کیے جو تم نے اس علاقے کے لوگوں کے ساتھ کیے ہیں تو پھر اس چھڑی کو حسب معمول یا درکھنا..... کھال اور ہیڑ دوں گا تمہاری..... کیا سمجھے.....“ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ابادھاڑے ”اب روتا کیوں ہے گدھے..... چلو مجھے اپنا بوقتہ دکھاؤ.....“ ابادو قدم آگے بڑھے، سارنگا نے جلدی سے ان کی رہنمائی کی۔ میں اپنی جگہ جما کھڑا رہا۔ ابا نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور پھر میرے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے، میں بلک بلک کرونے لگا اور انہوں نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے سینے سے لگایا، جانے کتنے جنوں کے بعد مجھے ان کے شانے پر سر رکھ کر رونے کا موقع دوبارہ ملا تھا۔ شاید میں ساتویں جماعت میں تھا جب سائکل سے گرنے کے بعد چوت گلنے پر یوں ابا کے گلے لگ کر رویا تھا، ابا مجھے تھکتے اور ”ارے ارے“ کہتے رہے اور میں یونہی پھر رکتا رہا۔ آس پاس کھڑے میرے دوست بھی رونے لگے اور خود رنگا بھی مجھے اپنے آنسو پوچھتا نظر آیا۔ ریحان بھی میرے کاندھے سہلاتے ہوئے سکنے لگا۔ ابا کے لیے ہم دونوں کو سنبھالا مشکل ہو گیا۔ ”یہ لو..... چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں..... بڑے میاں بھی بس سبحان اللہ ہی ہیں..... اب بس کرو نالائقو..... مجھے بھی زلاو گے کیا ہے.....“ بڑی مشکل سے رنگا نے ہمیں سنبھالا اور ابا کے ہاتھوں میرے نام کی پرچی ڈبے میں ڈلوا دی۔ ”مشی باۓ اور راجہ نے زور زور سے تالیاں پیٹ کر آسان سر پر اٹھا لیا، اور پھر ان کی تالیوں کی گونج میں باقی افراد کی تالیاں بھی شامل ہوتی چلی گئیں۔ میں نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی سرخ رو ہو گیا۔ میرے ابا نے میرے حق میں ووٹ ڈال کر مجھے ہمیشہ کے لیے فتح یا ب کر دیا تھا، ریحان نے دھیرے سے میرے کان میں بتایا کہ امی اور چھوٹی کو وہ لوگ زنانہ پونگ اسٹیشن پر چھوڑ آئے تھے۔ جاتے جاتے ابا نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی ”جیتے رہو.....“ اور اس دعا کے بعد آج میری زندگی ختم بھی ہو جاتی تو مجھے کوئی گلہ اور قدرت سے کوئی شکوہ نہ ہوتا۔ واپسی پر وہ چند قدم دور سر جھکائے اور کسی گہری سوچ میں گم رنگا کے پاس چند لمحوں کے لیے ٹھہرے ”صرف جنم دینے سے ہی کوئی باپ نہیں بن جاتا..... آپ نے بھی اپنا فرض خوب نجایا..... اور کسی باپ کی طرح ہی آج تک اس کی حفاظت کی ہے..... میرا لوگوں کو پر کھنے کا نظر یہ شائد اس دور کے لیے فرسودہ ہو چکا ہے..... لیکن یعنی نسل اپنے راستے خود بنایتی ہے..... ہو

سکے تو اسے گھر واپس بیچج دیجئے گا..... اس کی ماں ہمیشہ خود کو ہلکان کیے رکھتی ہے۔ ”ابارنگا کا کامندھا تھی پھر کرا آگے بڑھ گئے، اور رنگا کسی فرمانبردار بچے کی طرح سرجھ کائے وہیں کھڑا رہا، اور ٹھیک اُسی لمحے نواب صاحب اور پاشا بھی پولنگ ایشیشن میں داخل ہوتے نظر آئے۔ ابا نے چند گھنٹیاں رک کر ان کے ساتھ سلام دعا کی اور آگے بڑھ گئے اور پھر نواب صاحب کی مسکراہٹ نے سارے بھید کھول دیے۔ وہ ہم سب کی لاعلمی میں جب ہم موی کی زندگی کے لیے ہسپتال کی راہداریوں میں سفر کرتے پھر رہے تھے، ابا سے مل آئے تھے۔ نواب صاحب کو اپنے دروازے پر ان کی گاڑی سے اترتا دیکھ کر چند گھنٹوں کے لیے ابا بھی پریشان ہو گئے ہوں گے، لیکن نواب صاحب نے انہیں الفتاے ساری کہانی سنائی اور ابا کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ جیسے ہر چیز کی تھی سونا نہیں ہوتی تھیک اُسی طرح ہر سیاہ کو نہیں ہوتا۔ کچھ ہیرے بھی اس کا لک میں دبے رہ جاتے ہیں نواب صاحب نے میرے حق میں دلائل دیتے وقت ضرور اپنا زور بیاں آخوند تقریر کا ذکر کیا جس میں میں نے مرتبہ دم تک ان کے ساتھ کھڑے رہنے کا وعدہ کیا تھا تو آخرا بکے کا مجھے بچاتے ہوئے خود کو قربانی کے لیے پیش کرنا بھی علاقے کی پولیس اور لوگوں سے حرف بہ حرف منتقل ہو چکا تھا، اور پھر جب سارے محلے والوں نے یک جا ہو کر ابا کا درکھنکھٹایا اور میری اس واحد تقریر کا ذکر کیا جس میں میں نے مرتبہ دم تک ان کے ساتھ کھڑے رہنے کا وعدہ کیا تھا تو آخرا بکے دل کا سرگ بھی پکھل ہی گیا۔ حتیٰ آج نواب صاحب کے دلائل نے فراہم کر دی جب انہوں نے ابا سے صرف اتنا پوچھا کہ کیا انہیں نواب صاحب کے خاندان ان اور ان کے حسب نسب پر کوئی شبہ ہے.....؟..... اگر نہیں تو پھر وہ اپنے بیٹے پر اتنا یقین ضرور قائم رکھیں کہ اگر اس میں اتنی صلاحیت نہ ہوتی تو آج وہ نواب صاحب کے گھر کا ایک فرد نہ بن چکا ہوتا۔ نواب صاحب نے ابا سے یہ بھی کہا کہ انہیں ہمیشہ یہ حسرت ہی رہے گی کہ آیاں احمد ان کا اپنا بیٹا کیوں نہیں ہے..... میں چپ چاپ ایک طرف بیٹھا پاشا کی زبانی رنگا کو سنائی جانے والی یہ داستان سنتا رہا جس نے ابا کی کایا پلٹ دی تھی۔ نواب صاحب کی فریاد اور دلائل کا نتیجہ آج میرے سامنے تھا۔ دونلوں کے درمیان بھی نہ مٹنے والے فاصلے اور سدا کی گھری طیج کو آج انہوں نے پاٹ دیا تھا۔ آج ابا نے تسلیم کر لیا تھا کہ شاہد ہم دونوں ہی کہیں نہ کہیں اور ہمیشہ درست ہوتے تھے، بس ہمارا نظر یہ جدا تھا۔

پولنگ کا وقت ختم ہو چکا تھا اور مغرب کے بعد سر کاری عملہ تمام مواد اور ڈبوں سمیت جا چکا تھا۔ ہم سب یعقوب میشن اوث آئے، رات گئے سر کاری ٹی وی پر دھیرے دھیرے ایک ایک کر کے نتائج بھی چلنے شروع ہو گئے۔ رنگا نے اتنے بڑے بھوم کے ساتھ واپس موی کے پاس ہسپتال جانے کے بجائے وہیں میشن کے بڑے احاطے میں کارندوں کوٹی وی لگانے کا حکم دے دیا تھا۔ ہسپتال انتظامیہ ہم سے پہلے بھی کئی بار درخواست کر چکی تھی کہ ہمارے ساتھ موجود ورکرز کی بھیز سے باقی مریضوں کے آرام میں بہت خلل پڑتا ہے، البتہ ہماری درخواست پر موی کے لیے اس کے کمرے میں خبریں لگا دی گئی تھیں۔ نواب صاحب اور پاشا وہیں موی کے کمرے میں ہی موجود تھے اور رات بھروسہ وہیں میرے آخری نتیجے کا انتظار کرنے والے تھے۔

یعقوب میشن میں ایک ہنگامہ برپا تھا اور ہر بار جب ہمارے حلقتے کے کسی نئے پولنگ ایشیشن کے نتائج جمع کر کے دو ٹوں کی گنتی بتائی جاتی تو چاروں جانب ایک شور سائج جاتا تھا۔ کچھ من چلے نوجوانوں نے باقاعدہ ڈھول بتابوں کا انتظام بھی کر رکھا تھا، لیکن شروع کے نتائج میرے حق میں نہیں تھے اور پہلی بار انہیں ڈھول بجانے کا موقع رات ایک بجے کے بعد ملا جب سول لاکن والے پولنگ ایشیشن پر دو ٹوں کی گنتی میں میرا شمار

میرے قریبی حریف اور حلقے کے پرانے ایم پی اے سے کچھ زیادہ لکلا۔ میں اور پرانا ایم پی اے تقریباً ساتھی شمار میں برابر تھے، اور پھر رات تن بجے کے بعد جب حتیٰ نتائج کا اعلان شروع ہوا تو میں کئی علاقوں میں اس سے ہار رہا تھا۔ رنگا کے شاگردوں اور میرے جوان کارندوں کے چہروں پر مایوسی چھانے لگی۔ مجھے یقین تھا کہ کچھ ایسی ہی پژمردگی مشی، راجہ، ریحان اور بالے کے چہروں سے بھی ٹپک رہی ہوگی جو اس وقت کیفے فراق کے ہال میں مرزا اور پچھا فرق سیست محلے کے سماں افراد کے ساتھ بیٹھ کر یہ نتائج دیکھ رہے ہوں گے، کالونی سے آنے والے ایک درکرنے مجھے یہ بتایا تھا کہ ہمارے محلے کے احاطے میں بھی ایک بڑاً وی رکھے محلے کی تمام خواتین اس کے گرد جمع بیٹھی یہ نتائج تک رہی تھیں۔ جبکہ امی اور چھوٹی کے بارے میں، میں یہاں بیٹھے ہوئے بھی یہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ دونوں حسپ معمول جائے نماز بچھائے گزگزاتی اور میری کامیابی کی دعا میں اور منتظر مانگنے کے لیے بجدے میں پڑی ہوں گی۔ اس روز مجھے یہ بھی پڑتے چلا کہ اپنوں کے چہروں پر لمحہ بلوچیلیت ہوئی مایوسی کو دیکھنا کس قدر اذیت ناک ہو سکتا ہے۔ مجھے بھی رنگا اور اڑے کے باقی ساتھیوں کے چہرے پر پھیلیت ہوئی یہ تاریکی زیادہ دیر تک دیکھنی نہ گئی اور میں نے احاطے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں جانے کا فیصلہ کر لیا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ میرا اس طرح وہاں سے اٹھ جانا ان سب کو مزید اداں اور دکھی کر دے گا لہذا میں خود پر جرکر کے وہیں بیٹھا رہا۔۔۔۔۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔۔۔۔۔ شاید امی اور چھوٹی کے سجدے قبولیت کی چوکھت پار کرنے لگے تھے، نتائج کے آخری لمحات میں میں اپنے حریقوں سے آگے نکلا گیا اور پھر میرے اور پرانے ایم پی اے کے درمیان صرف چند وٹوں کا فرق باقی رہ گیا۔ اب تک وہی ہر علاقے سے سب کو ہراتا آ رہا تھا لیکن جب خاص ریگل چوک، ڈاک یارڈ اور سادات محلے کی حتیٰ کفی ختم ہونے لگی تو میں اس کے قریب آتا گیا اور ایک لمحہ ایسا بھی آیا کہ ہم تقریباً برابر ہو گئے۔ رنگا سمیت تمام استاد، شاگرد، کارندے اور اڑے کا باقی سمجھی عملہ حتیٰ کہ مرکزی گیٹ کے دربان بھی اپنی ڈیوٹی بھلا کر دم سادھے ہی وی کے سامنے یوں بیٹھے تھے جیسے انہیں کوئی سانپ سوچنے گیا ہو۔ تقریباً تمام وارڈز اور کنسل گنتی کے معاملے میں بھگتا ہے جا کان سے ہی لگا رہا تھا لیکن اب بے دھیانی میں رنگا وہ فون بھی میز کے کنارے رکھ رجھوں گیا تھا اور اس کی سبز تی بار بار جل بجھ کر بند ہو رہی تھی لیکن اب فون سننے کا ہوش ہی کے تھا، اور پھر با بول محلے اور کیف فرق کی پولنگ اسٹیشن کا نتیجہ بھی آ گیا۔ گنتی کرنے والے اپنی گنتی بھوول چکے تھے۔ دور سے کسی پڑھا کونو جوان نے چیخ کر کہا۔ ”انو بھائی کے ووٹ برابر ہو گئے ہیں“، اس اعلیٰ چلایا

”نہیں۔۔۔۔۔ برابر نہیں۔۔۔۔۔ یہ تو کچھ زیادہ بنتے ہیں۔۔۔۔۔“ آپس میں کچھ تکرار ہوئی اور کوئی تیرا اٹھ کر رنگا کی طرف دوڑا ”مبارک ہو آستاد۔۔۔۔۔ اپنا انو بھائی توجیت گیا ہے۔۔۔۔۔ ہم سب نے بے یقین سے اس اعلیٰ کی طرف دیکھا اور پھر اچاک سکریں کے نیچے چلتی پڑی پر میرا نام جملگا کیا ”غیر حتیٰ نتائج کے مطابق آیان احمد پندرہ ہزار چار سو میں ووٹ سے اول اور ملک نذر پندرہ ہزار ستر ووٹ سے دووم رہے۔“ ایک لمحے کے لیے سب چپ ہو گئے اور ہم سب نے اپنی بصارت توں پر یقین کرنے کے لیے کچھ وقت لیا اور سب سے پہلے میرے مقابلے پر آنے والے استاد سلامی نے زور کا نعرہ لگایا ”اوے بادشاہو۔۔۔۔۔ انو جیت گیا ہے۔۔۔۔۔ پھاڑ ڈالو آج سارے نگاڑے۔۔۔۔۔ آواز آسمان تک جانی چاہیے نکمو۔۔۔۔۔“ اور پھر وہ طوفان آیا کہ واقعی یعقوب میشن کے درود یوارز میں بوس ہونے لگے، رنگا نے بھاگ کر مجھے سینے سے لگا لیا اور ہوائی فائرنگ ڈھول اور نگاڑوں کی آواز سے

آسمان لرزنے لگا۔

ابتدائی نتائج کے مطابق میں قریباً تین سو سو لوگوں کے فرق سے اپنے حریف سے آگے رہتے ہوئے جیت چکا تھا، نوجوانوں نے بڑھ کر مجھے اپنے کانڈھوں پر سوار کر لیا اور رنگا نے میشن کے باہر رات بھر سے میری جیت کی امید میں بیٹھے فقیروں پر نوٹوں کی بر سات کر دی۔ ٹھیک اس لمحے جب میرا نام دوسرا مرتبہ سکریں پر آیا اور روٹوں کا فرق چار سو سے زائد تایا گیا، تبھی قربی مسجد سے فجر کی اذان گونجی "اللہ اکبر... اللہ اکبر... واقعی العظیم ہے..... اس نے مجھے جیسے بے گھر، بے آسرا اور بے نوا کو آج اتنا نواز دیا تھا کہ جسے پانے میں لوگ اپنی عمر میں ضائع کر دیتے ہیں، اور پھر سب سے پہلے رنگا اور اس کے پیچھے تمام یعقوب میشن بھدے میں گر گیا۔ یعقوب میشن کے احاطے میں پہلی مرتبہ صافیں ڈال کر صبح کی نماز باجماعت ادا کی گئی جس میں بھی ایک ساتھ سر بخود ہوئے۔ ٹھیک یہی مناظر کیف فراق اور ہمارے محلے کی مسجد میں بھی درہائے گئے ہوں گے، آج ان کا انو بھی توجیتا تھا۔ وہی آیا۔ ..... جسے ہارنے کی عادت ہی پڑ گئی تھی، وہ آج جیتا تو یوں جیتا کہ اس نے اپنوں کے ماضی کی تمام شکستوں کا بدلہ بھی چکا دیا تھا۔

روشنی ہونے سے پہلے ہی سارا محلہ ریحان کی معیت میں مجھے مبارکباد دینے کے لیے یعقوب میشن کے دروازے پر جمع ہو چکا تھا، لیکن آج ان سب کے لیے دروازے کھلتے تھے، آج یہ کسی استاد کا اڈہ نہیں ان سب کا اپنا گھر بن چکا تھا۔ مشی، بالا، راجہ، ریحان، مرزا اور چچا فراق بھی تو وہاں موجود تھے مجھ سے لپٹ کر مبارکبادیں دیتے ہوئے، میرے بال سہلاتے ہوئے، میرے گال کھینچتے ہوئے، شیخ صاحب تو باقاعدہ گھر کی کیاری سے جلدی میں پیروئے گئے پھولوں کے ہار لے کر آئے تھے جو سوری نے آگے بڑھ کر میرے گلے میں ڈال دیے۔ ..... جانے اس تھنے کا نام کسی نے ہار کیوں رکھ ڈالا تھا، اس کا نام توجیت ہوتا چاہیے تھا، کہ اس کا تعلق تو سد فتح سے ہی رہا ہے، ابا کے بارے میں پوچھنے پر ریحان نے مجھے بتایا کہ انہوں نے شکرانے کے لیے کچھ نیاز مانگ رکھی تھی۔ امی وہ بانٹ دیں، تبھی وہ گھر سے نکلیں گے۔ میں نے اسی وقت رنگا سے گھر چلنے کا کہا اور ہم سب کچھ ہی دیر میں پیدل ہی گھر کی جانب چل پڑے تھے۔ راستے میں میری فتح کا جشن مناتے میرے نوجوان و رکار ساتھی ہمارے ساتھ چلتے گئے۔ ..... اور قافلہ بنتا گیا۔ ..... میں گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو میرے ذہن میں، گھر چھوڑتے وقت کا اپنا جملہ گونجا "اب میں اسی وقت یہاں قدم رکھوں گا جب آپ کو کچھ بن کر دکھاؤں گا....." غصے اور شدید جھنجڑاہٹ میں کہی گئی ایک بات کو قدرت نے میری دعا میں بدل دیا تھا۔ حق ہے آہیں کب دعاوں میں اور دعائیں کب آہوں میں بدل جاتی ہیں۔ ..... یہ کوئی نہیں جانتا۔ امی نے دعا ختم کر کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور پھر مجھے دروازے میں کھڑے دیکھ کر وہ وہیں بیٹھے بیٹھے روپڑیں۔ میں نے لپک کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔ "اپنے انوکونا شتے کا بھی نہیں پوچھیں گی کیا.....؟" ..... کچھ ہی دیر میں چھوٹی اور ابا بھی برآمدے میں میرے گرد جمع ہو چکے تھے، ریحان باہر گئی میں رنگا اور باقی ہجوم کے ساتھ کھڑا میرے حق میں راجہ اور مشی کے ساتھ مل کر نعرے لگا رہا تھا "اپنا انو..... آوے ہی آوے..... دشمنوں کے دل پر..... چھاوے ہی چھاوے....." ابا نے مجھے ایک بار پھر یاد دلا لیا "آیا۔ ..... اپنے کہے ہوئے وعدوں کو بھول نہ جانا..... آج تمہاری خاطریہ جو پورا علاقہ باہر آمدا پڑ رہا ہے..... انہیں تمہاری صورت میں ایک نئی امید نظر آرہی ہے..... وہ آس جو شام کہ برسوں پہلے مر چکی تھی، اب تمہاری صورت پھر زندہ ہونے لگی ہے..... اسے اب دوبارہ مرنے نہ دینا..... ورنہ یہ سب جیتے جی مر جائیں گے....."

”آپ مطمئن رہیں..... میں اپنا کوئی وعدہ نہیں بھولا..... یہی محلہ اور یہی گھر ہمیشہ میرا مرکز رہے گا۔ انہیں مجھ سے ملنے کے لیے کسی اوپر فصیل کو پانہیں کرنا پڑے گا.....“ ابا مسکرا دیے ”جیتے رہو.....“

باہر گلی میں لگتے نعروں میں تیزی آنے لگی تھی۔ میں جلدی سے اسی کے ہاتھ کی چائے اور چھوٹی کے ہاتھ سے بننے پر اٹھے کے چند لمحے لے کر باہر نکل آیا۔ پھر وہ سارا دن کیسے لمحوں میں گزر گیا مجھے پڑتے ہی نہیں چلا۔ ہم ہسپتال پہنچ تو موی اور نواب صاحب میرے ہی انتظار میں بے چین بیٹھے ہوئے تھے۔ رنگا موی کو دیکھتے ہی چلایا ”لے بھی موی..... تیرا شاگرد تو اسٹادوں کو بھی مات دے گیا..... ایم پی اے بن گیا ہے تیرالاڈلا.....“ آج موی کے پاس بھی مجھے دینے کے لیے وہی تخفہ تھا۔ یہ آنسو بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ خوش ہو یا چاہے غم..... دونوں موقع پر ہماری آنکھوں کا ساتھ بھانے کے لیے ان کے یہی ساتھی سب سے پہلے دستک دیتے ہیں۔ میں بس موی کو تھکلتا رہا۔ جانے یہ آہنی نظر آنے والے میرے بڑے اندر سے اتنے موم کیوں ہوتے جا رہے تھے۔ یا شاکر یہ موم سدا ہی سے ان کے اندر کا حصہ تھا، صرف کسی اپنے کی آنچ کی کمی تھی۔ نواب صاحب نے مجھے خانم اور فضہ کی جانب سے بھی ڈھیروں مبارک باد کا پیغام سنایا اور یہ بھی کہ وہ سبھی زمرد حولی کے تمام یکنیوں کے ساتھ میرا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ لیکن مجھے حولی جاتے جاتے بھی تین دن لگ ہی گئے، کیونکہ اگلے دن موی کے زخموں کے نانکے کھلانا تھا اور دو دن ابتدائی نتائج حاصل کرنے اور علاقے کے معتبرین سے ملنے میں نکل گئے۔ تیرے دن جب میں رنگا اور اسماعیل کے ساتھ حولی پہنچا تو سورج ماند پڑ رہا تھا اور عصر کے وقت کی نرم سردیوں کی دھوپ نے زمرد حولی کے کلش دہکار کھے تھے، چاروں طرف سہری دھوپ کا سونا بکھرا ہوا تھا۔ خانم اور نواب صاحب نے حولی کے والاں میں ہی میرا استقبال کیا۔ خانم بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ ”لڑ کے..... تم نے آخر کر دکھایا..... شاید تمہارے لیے ہی کہا ہے کسی نے کہ ناممکن لفظ کا وجود نہیں ہوتا.....“ میں نے ان کا شکر یہ ادا کیا ”سب آپ لوگوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔“ اچانک پیچھے سے فضہ کی شرارتی آواز اُبھری ”اچھا جناب آیاں احمد صاحب..... گویا ہماری دعاوں کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے سارے فسانے میں.....“ فضہ کی بات سن کر بھی مسکرا دیے۔ نواب صاحب رنگا کو لے کر خانم کے ساتھ اندر کی جانب بڑھ گئے۔ میں اور فضہ ان کے پیچھے چل پڑے، اچانک فضہ رُک گئی۔

”آیاں.....“ میں نے بھی رُک کر دو قدم پیچھے کھڑی فضہ کو دیکھا۔ ”میں نے آپ سے کہا تھا ان کہ یہ آوارہ جوگی اور بخارہ ایک دن زمانے بھر کو جیت لے گا۔ میری پیشین گوئی کا کوئی انعام نہیں دیں گے آپ.....“ میں مسکرا دیا ”انعام بھی آپ ہی بتا دیں نجومن جی،“ فضہ بھی نہیں پڑی۔ ”چلیں یہ طے رہا کہ وقت آنے پر یہ نجومن اپنا انعام مانگ لے گی.....“ اتنے میں اندر سے خانم ہمیں بلانے کے لیے باہر چلی آئیں، اور ہم دونوں ان کے پیچھے اندر ہال کی جانب بڑھ گئے، جانے کیوں اس روز مجھے خانم کا چہرہ اور آنکھیں یہ ہوتی ہوئی نظر آئیں کہ وہ اپنی فضہ کے دل کے ہر راز سے آشنا ہیں۔

## کتاب گھر کی پیشکش

## باب 33

## کتاب گھر کی پیشکش

اس روز کھانے کی میز پر میں نے نواب صاحب کے چھوٹے بیٹے سجاد کو بھی بہت دن کے بعد دیکھا، میں نے بڑے بیٹے کے بارے میں پوچھا تو نواب صاحب کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ ”وہ نا خلف اب مجھے معافی کی درخواستیں بھجوار ہا ہے، اور خانم بھی اُس کی طرف داری کرتی رہتی ہیں کہ مجھے اُسے معاف کر دینا چاہیے.....“ میں نے بھی خانم کی تائید میں کہا ”اگر وقار کو واقعی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے تو آپ کو اُسے معاف کر دینا چاہیے..... شاید یہ آخری ٹھوکر اُس کے لیے سبق آموختا بت ہوئی ہو.....“ نواب صاحب نے تھیار ڈال دیے ”ٹھیک ہے میاں ..... اگر سب کی یہی مرضی ہے تو پھر میں اُسے معاف تو کر دوں گا لیکن صرف ایک شرط پر کہ وہ ولایت جا کر اپنی ادھوری تعلیم سب سے پہلے مکمل کرے ..... تب ہی میں اس کی شکل دیکھوں گا۔“ وقار تک یہ پیغام پہنچانے کا فریضہ خانم نے سجاد کے سپرد کر دیا اور ہم ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ حمید کی غیر حاضری کے بارے میں نواب صاحب نے بتایا کہ وہ اپنے گھروالوں کو زمر دھولی کے پچھلے حصے میں بنی میجر کی رہائش گاہ میں منتقل کروانے کے مقصد سے آج ہی شہر گیا ہے۔ حمید کے گھروالوں کی حوالی منتقلی کا سن کر فضہ نے چونک کر میری جانب دیکھا، میں اُسے اس رات حمید اور شیخ صاحب کے تمام خاندان کے بارے میں تفصیل سے بتاچکا تھا اور اُسے گہنا کو دیکھنے کا شدید اشتیاق بھی تھا۔ خانم نے رنگا سے ناہید کے بارے میں بھی بہت بار پوچھا اور اصرار کیا کہ رنگا اُسے چند دن کے لیے زمر دھولی چھوڑ جائے تو کتنا اچھا ہو.....

تمن دن پہلے جب میری کامیابی کا اعلان ہوا تھا اور میں اور سارے نگاہ ناہید کی کوئی پہنچ تو اس نے وہاں دن میں بھی چراغاں کر رکھا تھا۔ رنگا اپنی لاڈلی کے دیوانے پن پر مسکراتا رہا اور وہ بھاگ بھاگ کر اپنے بابا اور بھیا کی خدمت میں ہلاکاں ہوتی رہی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اگر میں ہار جاتا تو پھر وہ کیا کرتی تو اس نے رک کر اٹلی یقین اور عزم سے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا ”آپ کو کبھی ٹکست نہیں ہو سکتی تھی آیاں بھائی..... یہ ایک بہن کا اُس کے خدا کے ساتھ معاملہ تھا..... اور مجھے یہ یقین بھی اُسی خدا نے بخشتا ہے کہ آپ کی فتح یقینی تھی.....“

رنگا نے خانم سے وعدہ کیا کہ وہ جلد ناہید کو حوالی بھجوادے گا۔ رات کے کھانے کے بعد ہم نے نواب صاحب سے رخصت طلب کی۔ وہ سب پورچ تک ہمیں چھوڑنے کے لیے آئے اور گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے فضہ نے دھیرے سے مجھے کہا ”تو گہنا جی یہاں آ رہی ہیں۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ آپ کا خواب کیسا تھا.....؟“ میں نے پلٹ کر فضہ کو دیکھا ”وہ میرا خواب ضرور تھی لیکن اُس خواب کی تعبیر میرا مقدر نہ بن سکی..... کاش وہ خواب نہ ہوتی..... صرف تعبیر ہوتی.....“ ہم یعقوب میشن واپس پہنچنے تو رات ڈھل چکی تھی، اگلے چند دن حکومت سازی اور جوڑ توڑ میں گزر گئے اور کامیاب ارکان کا باقاعدہ اعلامیہ جاری کر دیا گیا، موی بھی بھی ہسپتال سے فارغ ہو کر دوبارہ میشن آپ کا تھا اور پھر ایک صحیح ریحان اور ابا مجھے باقاعدہ لے جانے کے لیے میشن آگئے، اب انے رنگا کی ادائی دیکھ کر کہا۔ ”میں جانتا ہوں یہ آپ سب کے لیے بہت مشکل ہو گا لیکن آیاں نے سب سے وعدہ کیا تھا کہ وہ چاہے حکومت میں بیٹھے یا چاہے مخالفت میں..... لیکن وہ اپنا ماحلہ نہیں چھوڑے گا.....“ رنگا نے ایک گہری سانس لی ”جی ماشر صاحب

مجھے سب یاد ہے..... لیکن یہ جاتے جاتے اس چار دیواری سمیت ہم سب کو ہمیشہ کے لیے اداں کر جائے گا..... مویٰ کو تو ابھی سے ہول اٹھنے لگے ہیں..... ”لیکن وہ سب جانتے تھے کہ مجھے ایک نہ ایک دن یہاں سے جانا ہو گا۔ رنگانے ابا سے درخواست کی کہ اس کی خواہش ہے کہ مجھے باقاعدہ اعزاز کے ساتھ یعقوب میشن سے رخصت کیا جائے لہذا وہ ایک دن مزید صبر کر لیں، کل شام رنگا اور مویٰ مجھے خود بابو محلے چھوڑ جائیں گے۔ ابا کے جانے کے بعد جب میرے جانے کی خبر پھیلی تو ان سب کے چہرے واقعی مرجھا سے گئے اور رات تک میں ان سب کو یہی سمجھاتا رہا کہ میں چاہے یہاں رہوں یا چاہے اپنے گھر میں..... اب ہمارے درمیان جڑا رشتہ موت بھی نہیں توڑ سکتی۔ اگلے دن صبح سے یعقوب میشن میں مہماںوں کا تاباہی نہیں ہے لگا۔ رنگانے شائد سارے شہر کو ہی مدعو کر لیا تھا، اُوے کے پرانے ساتھی، سیاستدان، نوکر شاہی، پولیس، تاجر..... کون سا ایسا طبقہ تھا جو اُس شام رنگا کی دعوت میں مدعو نہیں تھا۔ شہر کے آئی۔ جی نے اس روز خاص طور پر یعقوب میشن کی سیکورٹی پر پولیس کے افسروں اور نفری کی ڈیوٹی لگائی تھی، میں کسی کام سے گیٹ سے باہر نکلا تو مجھے ایک جانب اے ایس پی بلاں کھڑا نظر آیا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے کھٹ سے سیلوٹ کیا ”آئی۔ جی صاحب نے کل سے میری ڈیوٹی آپ کے ساتھ لگادی ہے۔ سناء ہے آپ نے سرکاری رہائش گاہ لینے سے انکار کر دیا ہے لہذا کل سے میری نفری آپ کے اپنے گھر کے باہر موجود ہو گی۔ آپ سے درخواست ہے کہ کہیں بھی جانے سے پہلے اپنا پروگرام اور شیڈول پولیس کو ضرور بھجوادیا کریں..... ”میں نے بلاں کو نے بلاں کو غور سے دیکھا ”کیا صرف ایک ایکیشن جیت لینے سے کوئی مجرم سے محروم بن جاتا ہے، ”تم سے آپ ”کا سفر طے کر لیتا ہے..... ؟“ بلاں کو بھی شائد وہ دن یاد آ گیا جب اُس نے مجھے اسی اُوے کے ایک لڑکے سے لڑنے کے جرم میں حوالات میں بند کر کھا تھا۔ بلاں نے میرا اشارہ سمجھ لیا تھا۔ وہ سر جھکا کر بولا ”سب نظام کی بات ہے آیاں صاحب..... حق تو یہ ہے کہ یہی نظام بھی ہناتا ہے اور یہی مجرم..... ”میں نے بلاں کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ”میرا مقصد تمہیں شرمندہ کرنا ہرگز نہیں تھا۔ بس یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں آج بھی وہی آیاں ہوں جو کل تھا، اور تم بھی آج مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ نظام چاہے کتنا ہی زنگ آؤ دیکوں نہ ہو جائے، ہم حق کو حق اور جھوٹ کو جھوٹ کہنے کا حوصلہ سدا قائم رکھیں گے..... اور اس عمل میں مجھے تم ہمیشہ اپنی مدد کے لیے اپنے ساتھ کھڑا پاؤ گے..... ”بلاں نے مسکرا کر میرا اس کے آگے پھیلا ہاتھ تھام لیا ”ضرور..... ”مجھے چلتے چلتے کچھ یاد آیا۔ ”اور ہاں..... مجھے سیکورٹی کی قطعاً ضرورت نہیں ہے..... جس دن مجھے اپنے علاقے اور اپنے لوگوں کے درمیان سیکورٹی کی ضرورت محسوس ہوئی، میں اُسی روز استغفی دے دوں گا۔“

آخر کھانے کے بعد میرے الوداع کی کھڑی بھی آگئی۔ میں فرد افراد اُوے کے ہر فرد سے گلے مل کر رخصت ہوتا رہا۔ یہ الوداع اس قدر اذیت ناک بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے پہلے کبھی نہ تھا۔ اس اعمال اور مویٰ تو پہلے ہی احاطے کے دوسرے کونے میں جا کر اپنی بھیگی پلکیں سب سے چھپا رہے تھے، رنگا سب کو سنجالنے کی خاطر خود پر ضبط کیے کھڑا تھا لیکن مجھ میں بھلا اتنے ضبط کا یادا کہاں تھا..... میں آخری استاد سے مل کر تیزی سے پلتا اور لمبے قدم اٹھاتے ہوئے باہر کے احاطے میں کھڑی رنگا کی گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہ سب آخری گاڑی کے رو انہ ہونے تک وہیں کھڑے ہاتھ ہلاتے رہے، دوسری جانب جب ہم بابو کا لونی میں داخل ہوئے تو یکسر مختلف سماں تھا۔ سارے محلے میں میرے دوستوں نے چڑاغاں سا کر رکھا تھا۔ امی اور ابا نے چھوٹی اور ریحان سمیت گلی میں ہی میرا استقبال کیا۔ رنگا اور مویٰ نے میرا کاندھا چھپا یا رنگا بولا ”اچھا سا جن..... اب

چلتے ہیں۔ ماسٹر صاحب آپ کی امانت آپ کے پر دھے ہے..... دیکھ لوكوئی کی بیشی تو نہیں ہے..... ”اباہس پڑے“ آپ نے تو اس نالائق کو بیش قیمت بنا کر واپس کیا ہے..... کی کا تو کوئی سوال ہی نہیں امحتا..... ”رزگا اور موسیٰ نے بھاری دل کے ساتھ مجھے گلے لگایا۔ خود میرا دل بھی اندر سے کٹ رہا تھا۔ میں نے اسماعیل کی دل گرفتگی کم کرنے کے لیے وعدہ کیا کہ میں کم از کم ہر جمعرات کی شام ان سب سے ملنے ضرور آیا کروں گا۔

رزگا اور موسیٰ نے جاتے جاتے بھی کمی بار مجھے گلے لگایا۔ ان کے پلٹتے ہی مجھے محلے والوں نے گھیر لیا اور مجھے اپنے گھر کے صحن میں قدم رکھتے رکھتے نصف شب ہو گئی۔ چھوٹی کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ مجھ سے کوئی بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہے، لیکن پہلے محلے والوں کے رش اور پھر صحن میں دریتک ابا اور امی کی موجودگی کی وجہ سے اسے یہ موقع بہت دیر سے ملا۔ اس کی آواز سرگوشی میں بدل گئی۔ ”بھائی..... دو دن پہلے گھنٹا اور اس کے گھروالے آئے تھے یہاں..... آپ کی کامیابی کی مبارکباد دینے.....“ میں نے چونک کر چھوٹی کو دیکھا ”اور کون کون تھا.....“

”بھی تھے، ستارہ، گھنٹا ان کی امی اور ابا..... وہ بتا رہے تھے کہ وہ لوگ اُسی دن زمرد حولی منتقل ہو رہے ہیں..... اور ستارہ نے یہ بھی بتایا کہ تنور یہ بھائی نے مقابلے کا امتحان بڑے اچھے نمبروں سے پاس کر لیا ہے اور وہ جلد ٹریننگ کے لیے اکیڈمی جا رہے ہیں.....“ میں کچھ دیر خاموش رہا، اور پھر بولا تو خود میری اپنی آواز مجھے اجنبی لگی۔ ”چلو اچھا ہوا..... تنور یہ کی محنت رنگ لائی“ میں چھٹ کی سیر ہیوں کی جانب بڑھنے لگا تو چھوٹی نے پھر مجھے روک لیا۔

”پوری بات تو سن لیں آیاں بھائی..... گھنٹا جاتے جاتے آپ کے لیے پیغام دے گئی ہے کہ آپ ایک بار زمرد حولی آکر اس سے ضرور مل لیں۔ وہ آپ کا انتظار کرے گی.....“ میں چونک سا گیا، اب گھنٹا کو مجھ سے بھلا کیا کام.....؟..... شاید تنور یہ کی خوش خبری خود مجھے اپنی زبانی سنا تھا ہتھی ہو.....؟..... میں انہی سوچوں میں گم اوپر اپنے پرانے کمرے میں جا کر بستر پر پڑ گیا۔ ابا اور ریحان نے بہت کوشش کی تھی کہ میں نیچے برآمدے میں ریحان والا کمرہ لے لوں، لیکن میں نے انہیں بڑی مشکل سے یقین دلایا کہ مجھے اپنی پرانی شناسادیوں کے درمیان اور اس مہربان چھٹ کے نیچے ہی سب سے اچھی نیند آئے گی، لیکن چھوٹی نے گھنٹا کا پیغام دے کر میری رہی کہی نیند بھی اڑادی تھی، لہذا میں کھلے آسان تھے آکر لیٹ گیا اور پھری ساری رات میرے اپنے دوست تاروں کے ساتھ گلے ٹکوے چلتے رہے۔ وہ سب مجھ سے روٹھے روٹھے تھے کہ میں تو انہیں بھلا ہی بیٹھا تھا، میں نے انہیں بڑی مشکل سے منایا کہ میں بھلا کب اُن سے جدا ہوں..... ہاں بس کچھ دن کے جوگ کی وجہ سے کچھ دور ضرور ہو گیا تھا، اور پھر اسی روٹھنے منانے میں صبح ہو گئی، اور سب ستارے اگلی رات کے وعدے پر ماند پڑ گئے۔

آج میری نئی زندگی کی پہلی صبح تھی۔ ابا نے ریحان کو بھیج کر مجھے جلدی نیچے بلوالیا۔ ناشتے کے بعد چھوٹی نے میرے بازو پر امام ضامن باندھا اور امی نے میرے سر پر قرآن کا سایہ کر کے مجھے گھر سے رخصت کیا۔ باہر گلی میں میرے تینوں دوست میرا انتظار کر رہے تھے، وہ میرے ساتھ بس اسٹاپ تک چلے آئے۔ مجھے اسٹاپ جانے والی روٹ کی بس کا انتظار تھا، اس دن سفر کرنے والے کم اور میرے ساتھ جانے والے لوگ زیادہ تھے۔ بس حسب معمول اپنے وقت سے پندرہ منٹ لیٹ پہنچی، اور میشی نے اپنی کاپی میں درج کر لیا ”بس کے اوقات درست ہونے چاہیں.....“ بس میں ہمیشہ کی طرح شدید بھیڑ اور خواتین والے حصے میں بھی مرد گھٹے ہوئے تھے۔ کاپی میں درج ہو گیا۔ ”ٹرانسپورٹ کی حالت زار.....“ اور یوں

اس بیلی تک پہنچتے پہنچتے وہ تینوں وہ سب درج کرتے گئے جس کو دیکھ دیکھ کر ہم بچپن سے کڑھتے آئے تھے، صفائی، ٹریفک، سگنل، تیز رفتاری، زیرا کراسنگ کی کمی، بوڑھوں اور بزرگوں کے لیے سڑک پار کرنے کے لیے سیرھی والے پل، اور وہ سب کچھ جو میرے حلقے میں بندھی کا شکار تھا۔ اس بیلی کے اندر وہی مردہ ماحول تھا، اونچھتے ہوئے وزیر اور بے زار سے اپنیکر اور ڈپی سپیکر، وقت گزاری کی خاطر آنے والی اور تماشوں کی منتظر اپوزیشن اور نوکر شاہی کے ٹالنے والے جوابات، پہلے دن تو اس بیلی کو دیکھ کر مجھے اپنے پرائمری اسکول کی جماعت یاد آگئی جہاں بیٹھتے ہی ہمیں گھروپی کی فکر پڑ جاتی تھی اور ہم کسی طرح اسکول کا وقت بے زاری بے دلی اور انگڑا ہیاں لیتے ہوئے سرے اتار کر پہنچنے کے انداز میں گزار کر فوراً گھر بھاگنے کی کیا کرتے تھے۔ واپسی کی بس پر پھر وہی معمول دھرا یا گیا اور گھر پہنچ کر میں نے کچھ آرام کے بعد ایسی سے بھلی کاتازہ بل لانے کو کہا۔ کچھ دیر بعد میں محلے کی بیرونی سڑک پر گلی لمبی قطار میں بل جمع کروانے کے لیے کھڑا تھا۔ ان سب نے مجھے قطار میں اپنی الگی جگہ کی پیشکش کی لیکن میرا مقصد تو خود کو انہی جیسا ثابت کرنا ہی تو تھا، سو میں مسکراتا ہوا اپنی جگہ پر کھڑا رہا، شام کی چائے ہم سب دوستوں نے کیفے فراق میں ہی پی اور وہیں مرزا کے کرے کو میں نے اپنا ففتر ہنانے کا اعلان بھی کر دیا۔ پہلے دن ہی میرے پاس قریباً دو درجن درخواستیں جمع کرائی گئیں۔ میرے حلقے کے مسائل بھی میرے گھر کے مسائل کی طرح معصوم اور چھوٹے چھوٹے سے تھے، کسی کی بھلی کا بل زیادہ آیا تھا تو کسی کا بل جمع کروانے کے باوجود بھی میٹرکٹ گیا تھا۔ کسی کی گیس آتی ہی نہیں تھی اور کسی کے نکشناں کا لیچ سال بھر سے بند نہیں ہوا تھا۔ کسی کے بچے کو سرکاری اسکول سے لمبی غیر حاضری پر نکال دیا گیا تھا اور کوئی اسکول کے دروازے سے اندر ہی داخل نہیں ہوا تھا کہیں سڑک بن کر ٹوٹی تھی اور کہیں ٹوٹی سڑک پر ہی بھری ریت ڈال کر بھر دیا گیا تھا۔ کسی کو پولیس صرف شک کی بنیاد پر اٹھا لے گئی تھی اور کوئی پولیس کے سامنے دہائیاں دے دے کر تھک گیا تھا مگر اس کی واورتی نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے مشی، بالے اور راجہ کو مختلف محلے بانٹ دیے اور مرزا کو اپنا سیکر ٹری مقرر کر دیا پچھا فراق نے ہمارے منتظم اعلیٰ کی ذمہ داریاں سنچال لیں اور یہ سب کچھ ہناء کسی تھواہ یا معاوضے کے طے ہوا۔ وہ سب جانتے تھے کہ اس وقت مجھے ان سب کی کتنی ضرورت ہے اور میرے ساتھ قابل اعتماد ساتھیوں کا ہونا کس قدر اہم ہے۔ سارنگا میری اس نئی پتوار کا تاخدا اور موئی کھے دیا تھہرا۔ یعقوب میشن ہمارا ہید کو اڑھا جہاں اب رنگا اور موئی سارا دون لوگوں کے مسئلے سنتے اور انہیں طاقت کے بجائے سیاست سے حل کرنے کی کوشش کرتے تھے، میں نے دوسرے روز ہی آئی۔ جی سے مل کر اپنے علاقے کی پولیس میں چند ضروری تبدیلیوں کی درخواست کی جنہیں کمال شفقت سے اُسی وقت تسلیم کر لیا گیا اور حاکموں کی جگہ مد و گار طبیعت عملہ تعینات کر دیا گیا۔ بلال کا ساتھ اب بھی مجھے حاصل تھا۔ میں نے مشی، بالے اور راجہ کے والدین سے پہلے روز ہی ان تینوں کو اپنی ٹیم میں شامل کرنے کی اجازت طلب کر لی تھی۔ بالے کے ابا مسکرا کر بولے تھے ”ہم منع بھی کریں گے تو یہ نالائق ہماری بات تھوڑی مانیں گے..... لیکن اس بارہم سب اپنے دل کی گہرائیوں سے انہیں اجازت دیتے ہیں کہ وہ تمہارے ساتھ مل کر اس علاقے کی تقدیر بدلتے ہیں۔ اب ہم بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں اپنے بچوں پر فخر ہے.....“

اور پھر تین چار دن بعد جب یہ ساری خبریں ریڈ یو، ٹی وی اور اخبار والوں کو پڑھنے لگیں اور ان کے روپرٹر اور کیسرہ میرے ساتھ گھونٹے لگا تو واقعی اگلے چوہیں گھنٹوں میں سب بدلنے لگا۔ سرکاری بس ٹھیک اپنے وقت پڑ آئے گلی۔ میوپل کا عملہ صح سویرے اپنی ڈیوٹی پر پہنچنے لگا۔ علاقے کی دیواروں پر قلعی اور سڑکوں پر نئی زیرا کراسنگ جنمگانے لگی۔ اسکول وقت پر لگنے اور فتر کا عملہ وقت پر چھٹی کرنے لگا، بل درست ہونے

لگے اور قطار میں گھٹنے لگیں۔ بھلی اب بھی جاتی تھی مگر مقررہ وقت پر، پانی اب بھی کم آتا تھا، مگر روز آنے لگا تھا۔ گواہ اب بھی ملاوٹ کرتا تھا مگر اب اس نے پانی میں دودھ کے بجائے دودھ میں پانی ملانا شروع کر دیا تھا۔ غرض ہر بگڑی چیز نے درست ہونے کے لیے ایک انگڑائی ضروری تھی۔ ابا کے بقول یہ ساری تبدیلی صرف اس وجہ سے ہو پائی تھی کیونکہ میں نے اپنے علاقے سے ناطئ نہیں توڑا تھا۔ ورنہ یہی سارے ملکے اپنا سارا زور صرف میرے سرکاری گھر کو سدھارنے میں لگا دیتے۔ میرے نوجوان کارکن اور ساتھی اب بھی ہر قدم پر میرے ساتھ تھے اور ہم ہر دوسرے تیسرا دن ریگل یا صدر کے علاقے میں اپنی میٹنگز منعقد کر کے آگے کالائجہ عمل طے کرتے رہتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کو اس کی استعداد اور خصوصیت کے مطابق کام بانٹ دیا گیا تھا اور میں نے ان کے معاوضے کا منصوبہ بھی حکام بالا کو پیش کر دیا تھا کہ لاکھوں کروڑوں کے فنڈ نمائندوں میں بے کار بانٹ دینے کے بجائے اگر اسی رقم کو ہر علاقے کے بے روزگار نوجوانوں کے ہنر کو اجاگر کرنے میں خرچ کیا جائے تو ہم چند سالوں میں ہی اس ملک کی تقدیر پر بدل سکتے ہیں۔ ان نوجوانوں نے میرے حلتے کی ہر گلی، ہر سڑک کا انتظام سنبھال لیا تھا اور یہ اُنمی کی کوششوں کا شر تھا کہ شہر کے سب سے بڑے اخبار نے دوسرے ہفتے ہی ہمارے علاقے کے بارے میں اپنے اخبار میں شہری جہائی۔

”نوجوان انقلاب.....“

اس تمام عرصے میں مجھے ایک بات کا شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ ہم اگر تبدیلی چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے گھر اور گلی سے ابتداء کرنی ہو گی۔ گھر، گلی، محلہ، سڑک، یونین کونسل، شہر، ضلع، صوبہ اور پھر ملک۔ یہ ترتیب رہے گی تبھی ہم اپنی منزل تک پہنچ سکیں گے ورنہ سدا بھکتے رہیں گے۔ خود کو تبدیل کیے بناء نظام کو بدلتے کی باتیں صرف ایک دھوکہ اور سراب ہوتی ہیں اور ہم شاکر سدا سے ہی سرابوں کے پیچھے بھاگتے آئے ہیں۔

لیکن ہم سب نے مل کر اس سراب کو خواب اور پھر اس خواب کو ایک حقیقت میں بدلتے کا فیصلہ کر لیا تھا، دن، ہفتوں میں اور پھر چار ہفتے ایک مہینے میں بدل گئے، میں روز زمرد حوالی کی طرف جانے کا سوچتا اور روز کسی نہ کسی کام میں پھنس کر رہ جاتا۔ آخر ٹھیک ایک مہینے بعد نواب صاحب کی گاڑی خود مجھے لینے آپنی، اسماعیل نے بتایا کہ نواب صاحب نے رنگاموئی اور مجھے دعوت پر بُلایا ہے اور سختی سے تاکید کی ہے کہ اگر اس بار میں نے غیر حاضری کی تو وہ باقاعدہ ناراض ہو جائیں گے۔ اب میرے پاس کوئی بہانہ نہیں پچا تھا، اور پھر ہم سب اُسی شام دو گاڑیوں میں زمرد حوالی کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہو رہے تھے۔ رنگاموئی راستے میں ہی بتاچکا تھا کہ اس نے خانم کی درخواست پرناہید کو کچھ دن کے لیے زمرد حوالی بھجو دیا ہے۔



## کتاب گھر کی پیشکش

## کتاب گھر کی پیشکش

## باب 34

## کتاب گھر کی پیشکش

اور پھر جو یہی میں داخل ہوتے ہی میری پہلی نظر ناہید ہی پر پڑی جو باہر والاں میں ہی موجود تھی، لیکن وہ مجھ سے بہت ناراض تھی اور اس نے باقاعدہ اعلان کر دیا کہ اب وہ مجھ سے تبھی بات کرے گی جب میں یہ وعدہ کر لوں کہ کم از کم دو دن زمرد جو یہی سے باہر قدم بھی نہیں رکھوں گا، رنگا اور موی نے بھی میری معاونت سے انکار کر دیا اور مجبوراً مجھے ہاں کرنی ہی پڑی۔ خانم نے مردانے اور زنانے کے انتظامات خوب سنبھال رکھے تھے اور فضہ ان کی مدد میں جب تھی ہوئی تھی۔ ایک آدھ بار مردانے میں آتے جاتے اور ملازموں کو ہدایات دیتے تھے میں پھر چاہے وہ صاحب اور ان کے گھروالے یہاں جو یہی میں دل لگا پائے تھے یا نہیں.....؟ نئی جگہ کے اپنے مسائل اور نت نئے وسو سے ہوتے ہیں، پھر چاہے وہ زمرد جو یہی جیسا محل ہی کیوں نہ ہو، نئے مکینوں کو اپنی پرانی کیا کی یاد بھی ضرور آتی ہوگی لیکن میں چاہ کر بھی نواب صاحب یافضہ سے گھنایا شیخ صاحب کے گھروالوں کی خیریت نہ پوچھ سکا، شائد میرے ہی دل کا کوئی چور تھا جو مجھے یہ سوال کرنے سے روکتا رہا۔ دل کے کھٹکے یوں تو سدا بے آواز ہوتے ہیں، لیکن ہر آہٹ پر یہ دل کے اندر بڑا شور مچاتے ہیں۔ ہاں مگر باہر والاں کو یہ شور بھی سنائی نہیں دیتا۔

میرے اندر کا شور بھی بس خود مجھی کو سنائی دے رہا تھا، اور جب انسان کے اپنے اندر اتنا شور ہو تو اسے باہر کی باتیں ذرا کم ہی سنائی دیتی ہیں۔ مجھے بھی اس رات کھانے کی میز پر سب کے درمیان ہوتی گفتگو کا کچھ پتہ نہیں چلا، اور ان سب کا ساتھ دینے کے لیے میں بس ہوں ہاں کرتا رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ فضہ میری اس کیفیت کو بجانپ چکی ہے اور کئی بار جب میں نے نظر انھائی تو میں نے اسے اپنی جانب ہی دیکھتے ہوئے پایا۔ کھانے کے بعد ایرانی قبوے کی فرمائش کی گئی اور پھر بھی باہر والاں میں چہل قدمی کرنے کے لیے ادھر ادھر ٹویں میں بٹ گئے۔ میں چپ چاپ بہتی نہر کے کنارے آ کر بیٹھ گیا۔ فضہ نے اپنی گرانی میں سنگ مرمر منگوا کر نہر کے کنارے بہت ہی مزید سنگ مرمر کی شفاف سلیں بیٹھوں کی صورت میں بچھوادیں تھیں اور نظر کو دور تک بہت بھلا منظر محسوس ہوتا تھا۔ ان سلوں کی ساخت بھی راج ہنسوں کے تیرتے ہوئے جوڑوں کی طرز پر بنائی گئی تھی اور دور سے بہت سے راج ہنس نہر کے پانی پر پیرا کی کرتے، بہتے نظر آتے تھے، لیکن کچھ ہنس ایسے بھی تو ہوتے ہیں جن کی کوئی راج ہنسنی نہیں ہوتی۔ میں اس ماحول میں وہی ایک اکیلا اور جدا راج ہنس تھا ”یہاں تنہا کیوں بیٹھے ہیں آپ.....؟.....“ میں چونکہ کل پلٹا فضہ جانے کب سے میرے عقب میں کھڑی تھی ”بہت لمبی محفل کے بعد ذرا دیر کی تھائی اچھی لگتی ہے.....“ فضہ نے غور سے میری جانب دیکھا ”واقعی..... لیکن کیا صرف اتنی ہی بات ہے.....؟ کہیں آپ خود سے بھی تو نہیں چھپ رہے.....“ میں نے مسکرا کر اس بے اعتبار کی جانب دیکھا ”گویا آپ نے چہرے پر ہنا بھی سیکھ لیا ہے فضہ جی.....“ وہ بھی مسکرا دی ”نہیں..... چہرہ شناسی کا دعویٰ تو بھی نہیں رہا مجھے..... بس یونہی ایک خیال سا آ گیا تھا..... ویسے آپ کی نگاہ کی داد نہ دینا بھی بہت زیادتی ہوگی۔ وہ واقعی چاہے جانے کے قابل ہے..... ہزاروں میں بھی گھری ہو تو پل بھر میں ساری توجہ اپنی جانب مبذول کروا لینے والی..... میری بہت لمبی ملاقاتی میں ہوئی ہیں اس کے ساتھ اس ایک ڈیڑھ ماہ کے دوران.....“ میرا دل زور سے دھڑکا۔ یہ کم بخت دل ہمیشہ پرائے

صحیح شیخ صاحب سے بھی حویلی کے پیر و فی احاطے میں ملاقات ہو گئی، اور میں کچھ دیر کے لیے ان کے ساتھ عقبی احاطے میں موجود ان کی رہائش گاہ تک چلا آیا۔ شیخانی جی کا دل تو نئی جگہ میں خوب لگ گیا تھا۔ ستارہ سلام کر کے مسکراتے ہوئے بولی ”لگتا ہے آپ نے ہمیں بالکل ہی بھلا دیا ہے..... بس آپ کے قصے سننے کو ملتے ہیں..... اخباروں میں بڑا چرچا ہے آج کل آپ کے اس نوجوان انقلاب کا.....“ میں اُسے جواب دینے ہی لگا تھا کہ اچانک گہنا کرے میں داخل ہوئی اور اُس نے مجھے سلام کر کے دھیرے سے کہا ”بہت دن لگادیے آپ نے یہاں آنے میں.....“ مجھ سے کچھ کہانیں گیا۔ یہ وہ گہنا تو نہیں تھی جسے میں ہمیشہ سے جانتا تھا۔ یہ تو زردی مائل چہرہ اور آنکھوں میں ادا کی کے گھرے سیاہ ڈورے لیے، خاموش اور کھوئی کھوئی سے کوئی اور لڑکی تھی۔ میں جس گہنا کو جانتا تھا اس کے چہرے کا گلال تو سرمنی شام کو بھی گلابی کر دیتا تھا، جس کی آنکھوں کا کاجل بھری دھوپ میں بھی اندر ہیرا کر سکتا تھا اور جس کی گھنی پلکوں کی چھاؤں اور دھانی آنچل کا سایہ یخرا کو بھی نخلستان کر دیتا تھا.....

لیکن یہ گھنا تو کوئی اور ہی تھی۔ جیسے خود برسوں سے کڑی تپتی دھوپ میں کھڑی ہو۔ مجھے بہت حیرت ہوئی کیونکہ اب تو تنویر بھی سی ایس پی افرین چکا تھا۔ اب کیا پریشانی لاحق تھی اُس گلفام کو..... کہ اس کا پھول سا چہرہ یوں کملा گیا تھا۔ مجھے سے زیادہ دریٹک وہاں بیٹھا نہ گیا اور میں جلد شخ صاحب سے رخصت لے کر وہاں سے چلا آیا۔

سے پہر کو خانم سے ایک لمبی نشست رہی اور وہ بہت دیر تک مجھ سے میرے مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں پوچھتی رہیں۔ ان کے انداز میں تم جس سے زیادہ خوشی کا عنصر واضح تھا اور انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جب وہ تہران یونیورسٹی کی طالبہ تھیں تو پولیٹیکل سائنس Political Sciences ان کا پسندیدہ مضمون تھا۔ شام کی چائے پر مجھے فضہ دکھائی نہیں دی۔ شام کے خلوص اڑکی اپنا وعدہ بھانے کے جتنی میں جتنی ہوئی تھی۔ اس نے آج میری گھنے سے ملاقات کروانے کا وعدہ کیا تھا کیونکہ کل ہمیں واپس لوٹ جانا تھا۔ رات کے کھانے پر مجھے فضہ کی ایک جھلک دکھائی دی مگر وہ شہمن کے ساتھ مہمانوں کی تواضع میں مصروف رہی۔ دس بجے کے بعد ہم سب اپنے اپنے کروں کی جانب لوٹ گئے۔ مجھے ایک عجیب طرح کی بے چینی نے آگھیرا تھا۔ جیسے ہمیشہ کسی انہوں نے قبل میرے حواس معطل سے ہونے لگتے تھے۔ میں نے گھبراہٹ دور کرنے کے لیے کمرے میں رکھی کتابوں میں سے ایک اٹھا لی اور یونہی ورق گردانی کرنے لگا۔ اچانک دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں چونک گیا۔ باہر شہمن کھڑا تھا، چلیں میاں..... آپ کو فضہ بی بی نہر کنارے یاد کرتی ہیں.....، شہمن کے رازدارانہ انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ بھی فضہ کے تمام رازوں میں برابر کا شریک ہے۔ میں شہمن کی سر برائی میں نہر کے قریب پہنچا تو وہ راستے ہی سے پلٹ گیا۔ آخری دنوں کے چاند کی مدھم روشنی میں مجھے سنگ مرمر کے بنیخ کے

قریب کوئی کھڑا نظر آیا۔ شائد وہ فضہ کا ہیولا تھا۔ میں نے قریب پہنچ کر دھیرے سے کھکھرا ہیو لے نے پلٹ کر دیکھا۔ لیکن..... وہ تو گہنا تھی، ویسے ہی دن کی طرح گہنا تھی ہوئی..... کچھ دیر کے لیے میں سب کچھ بھول گیا، وہ مجھے اور میں اُسے دیکھتا رہا..... ”آپ..... یہاں..... اس وقت.....؟.....“ گہنا بھی سن جعل گئی ”بھی..... ابھی چند لمحے پہلے فضہ مجھے یہاں چھوڑ گئی ہیں..... آپ نے مجھے سے ملنے کے لیے وقت نکالا..... میں شکر گزار ہوں آپ کی.....“ میں ہڑ بڑا سا گیا ”ایسا کیوں کہہ رہی ہیں آپ..... آپ سے ملاقات میرے لیے ہمیشہ ایک خوشنگوار تحریر پر رہا ہے.....“ میرا جی چاہا کہ میں اس سے کہوں کبھی میری پوری زندگی کا مقصد ہی صرف ایسی ایک ملاقات ہی تو تھا۔ اس نے اصرار کیا ”نہیں..... پہلے کی بات اور تھی لیکن میں میں جانتی ہوں کہ اب آپ کی مصروفیات بہت بڑھ گئی ہیں.....“ میں مسکرا دیا ”انسان کتنا بھی مصروف کیوں نہ ہو اسے اپنے گھر آنے کے لیے کسی بہانے کی ضرورت نہیں ہوتی، یہ حوصلہ بھی میرا گھر ہی تو ہے، نہ صرف یہ بلکہ یعقوب میشن اور ناہید کی کوئی بھی بھی..... کبھی میرے اپنے گھر ہیں۔ کبھی بھی تو میں سوچتا ہوں کہ اپنے مجھے گھر سے نکال کر اچھا ہی کیا تھا۔ نہ وہ مجھے گھر سے نکالتے نہ میرے اتنے بہت سے آشیانے بنتے.....“

گہنا اب بھی کچھ گم سہی تھی ”آپ واقعی بہت خوش قسمت ہیں..... سب کھوکھ بھی اس سے دو گنا پالیا آپ نے..... ورنہ یہاں تو ایسے بھی کچھ سیاہ نصیب ہیں جو سب پا کر اپنے ہاتھ سے کھو دیتے ہیں۔“

میں نے چونک کر گہنا کی طرف دیکھا ”آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں۔ سب تھیک تو ہے نا..... تنویر کی کوئی خیر خبر آئی اکیڈمی سے..... معافی چاہتا ہوں میں تنویر کی کامیابی کی مبارک باد دینے نہیں آسکا وقت پر.....“

گہنا نے رخنی نظر سے میری جانب دیکھا ”وہ تھیک ہیں..... ابھی کل ہی ان کا ابا کے نام خط آیا تھا۔ انہوں نے ستارہ آپی کا ہاتھ مانگا ہے ابا سے.....“ میرے اندر ایک زوردار چھنا کے کی آواز کے ساتھ بہت کچھ ٹوٹ گیا۔

”کیا.....؟..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں..... تنویر نے ستارہ کا ہاتھ مانگا ہے..... مگر.....؟..... لیکن.....“ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ میں آگے کیا کہوں، لیکن گہنا کے چہرے پر کچھ اور بے چینی تھی۔

”بھی..... تنویر بھائی تو ستارہ آپی کی پہلی شادی سے بھی قبل ان کے امیدوار تھے..... لیکن تب وہ بے روزگار تھے اور ابا نے اچھار شدہ آنے پر آپی کو بیاہ دیا تھا۔ آپی کی بیوگی کے بعد بھی تنویر بھائی کے ول میں ستارہ آپی ہی بستی ہیں۔ تنویر بھائی نے میرے کہنے پر ہی مقابلے کا امتحان دیا تھا کیونکہ میں جانتی تھی کہ حمید بھائی اس کے بعد ان کے رشتے کو ”ناا،“ نہیں کہہ پائیں گے۔ آپ کیا سمجھے تھے کہ تنویر بھائی میری خاطراتی محنت کر رہے ہیں.....؟.....“

”بھی..... حق تو یہی ہے کہ میں نے جب آپ کے مستقبل کے ہم سفر کے بارے میں خیالات سننے تو مجھے تنویر ہی اس خاکے پر پورا اترتا نظر آیا تھا، لیکن خود ستارہ نے بھی تو کبھی ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا.....“

”وہ بھی اپنی زبان سے تنویر بھائی کی چاہت کا اقرار نہیں کریں گی۔ وہ تو تب بھی نہیں بولیں تھیں جب ابا نے ان کا ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں دے دیا تھا.....“ گہنا کی باتیں سن کر میرے اندر کا شور بڑھتا جا رہا تھا، گہنا نے اپنی بات جاری رکھی ”ہاں..... البتا ایک وقت ایسا ضرور آیا تھا

جب تنویر بھائی کے ساتھ میری بے تکلفی دیکھ کر خود ستارہ آپی اس غلط فہمی کا شکار ہو گئی تھیں کہ شائد ان کی شادی کے بعد میں خود تنویر بھائی کی زندگی کا حصہ بن چکی ہوں، لیکن میری اور تنویر بھائی کی وہ گھنٹوں باتیں اور وہ چھپ چھپ کر کھسر پھسر بھی ستارہ آپی کو دوبارہ ان کی زندگی میں لانے کے لیے ہی ہوتی تھی۔ تنویر بھائی کی خواہش پر ہی یہ بات ان کے سی۔ ایس۔ ایس (CSS) کے امتحان کا نتیجہ نکلنے تک پوشیدہ رکھی گئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک بار وہ یہ معز کر لیں تبھی وہ ستارہ آپی اور ہمارے گھر والوں کے سامنے اس رشتے کی پیش کش رکھیں گے..... کیونکہ ایک بار پہلے بھی بے روزگاری کی وجہ سے حمید بھائی ان کا ستارہ آپی کے لیے آیا ہوا رشتہ سے ٹھکرا چکے تھے، اور تنویر بھائی صرف ایک جو نیز ٹیچر کی نوکری کے بل پر دوبارہ یہ پروپوزل نہیں بھیجنے چاہتے تھے کیونکہ ان کی ٹیچر کی نوکری بھی عارضی تھی..... ” گھنا کی باتیں سن کر پل بھر میں میرے سامنے اب تک تنویر سے ہوئی بھی ملاقاتیں ایک جھماکے کی صورت میں چکیں ..... اوہ ..... تو اُس کا والہانہ پن اور مقابلے کا امتحان پاس کرنے کا وہ جنون ستارہ کی خاطر تھا، لیکن میری بہت سی الجھنیں ابھی باقی تھیں۔

”لیکن آپ خود بھی تو ہمیشہ سے ایک منظم زندگی اور افران انداز کی شیدائی رہی ہیں..... میرا مطلب ہے کہ.....“

”ہاں ..... یہ درست ہے کہ مجھے سی ایس پی افر اور ان کی زندگی کا ایک منظم انداز بہت پسند ہے ..... میں لڑکا ہوتی تو خود بھی ایسا ہی کوئی کیریز چختی یا پھر فوج میں کمیشن لے لیتی ..... بچپن سے میرے خوابوں کا شہزادہ ایسا ہی کوئی افسر رہا ہے ..... اور یہ بات ہمارے گھر میں کسی سے بھی پوشیدہ نہیں ہے ..... بلکہ جب میں دسویں میں تھی اور امی نے ایک دن مجھے ذات کر یونہی کہہ دیا تھا کہ اگر میں نے گھر کا کام ٹھیک سے نہیں کیا تو وہ مجھے کسی کلر کے ساتھ بیاہ دیں گی تو میں با قاعدہ روپڑی تھی اور دو دن تک میرے آنسو باتیں بے بات ٹپک جاتے تھے، پھر خدا خدا کر کے پورے گھرنے میرے سامنے ہاتھ جوڑے تھے تب کہیں جا کر میں چپ ہوئی تھی ..... اسی لیے جب آپ سے میری ملاقات ہوئی تھی تو آپ صرف ایک اچھے انسان اور دوست لگے تھے، اور میں چاہتی تھی کہ ایک اچھا دوست اپنی زندگی کو یوں غیر منظم انداز میں گزار کر ضائع نہ کرے بلکہ خود کو کسی باقاعدہ اور سنجیدہ طرز حیات میں ڈھال کر اپنی صلاحیتیں بروئے کار لائے ..... لیکن تب کبھی میں نے آپ کے لیے اس سے سوا کچھ نہیں سوچا ..... کچھ نہیں چاہا ..... مگر جب آپ کی غیر حاضری کے وقفے طویل ہونے لگے تو نہ جانے کیوں مجھے آپ یاد آنے لگے، آپ کی شرارت آیز باتیں، آپ کا وہ زندگی کو ایک پل میں جی لینے کا نظریہ اور وقت کو اپنے قابو میں کرنے کے بجائے خود کو وقت کے دھارے پر چھوڑے رکھنا ..... یہ سب اندر ہی اندر مجھے بھانے لگا ..... لیکن اس وقت میں خود اپنے اندر ہوتی اس تبدیلی سے انجان تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ محبت کی نظم و ضبط یا ڈپلن کی پابند نہیں ہوتی، محبت اپنا ڈپلن خود قائم کرتی ہے ..... چاہے اس قیام کے لیے وہ دوسروں کے دلوں کا ہر لظم تپٹ کر دے، ہر ضبط کو کسی تیز آندھی اور طوفان کی طرح اکھاڑ پھینکنے ..... محبت ایک دھیمے طوفان کی طرح ہمارے دل کے کواڑوں پر دستک دیتی ہے لیکن ایک بار وہ دل کے درپیچوں سے اندر گھس جائے تو پھر اس تیز آندھی کے سامنے ہمارے تمام اصول، تمام قاعدے اور بندھن خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں۔ جب مجھے ستارہ آپی نے آپ کے دل میں میرے لیے پلتے جذبے کے بارے میں بتایا تو ٹھیک یہی سب کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔ میرے تمام اصول، میرے تمام معیار اپنی جگہ موجود رہتے ہوئے بھی بے معنی سے ہوتے چلے گئے۔ شروع شروع میں تو مجھے خود پر بھی بہت غصہ آتا تھا کہ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے ..... لیکن تب مجھ پر ایک اور

رازا آشکارا ہوا کہ ضروری نہیں کہ ہم عمر بھر جس معیار کو اپنے دل میں سجائے بیٹھے ہوں، صرف اس پر پورا اترتا کوئی شخص ہی ہماری محبت بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اس معیار اور ان خوابوں کی تعبیر ہمارے دل میں ہمیشہ پلنے کے باوجود کوئی بالکل مخالف سمت کا انسان بھی ہمارے دل کے سنگھاسن پر آ کر برآ جمان ہو سکتا ہے۔ یعنی ہم اپنے آئیندیل اور معیار کی ساری عمر عزت تو کر سکتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی محبت کی تعبیر کسی اور کی صورت ہمارے دل میں وارد ہو جاتی ہے۔ ٹھیک یہی حداد شمیرے ساتھ بھی ہوا۔ میرا آئیندیل آج بھی میرے اندر کسی محترم شخصیت کی طرح پلتا ہے۔ لیکن وہ میری محبت نہیں بن سکا آیا۔ میں اپنے دل کے آئیندیل کی ہمیشہ عزت کرتی رہوں گی لیکن میں محبت آپ سے۔ ”گہنا روانی میں کچھ کہتے کہتے رک گئی۔“ وہ سرجھکائے میرے سامنے کھڑی تھی اور اس کا وجود کانپ رہا تھا۔ جیسے وہ صدیوں کی مسافت طے کر کے یہاں تک پہنچی ہو۔ کچھ دیر ہم دونوں ہی خاموش رہے۔

## کتاب گھر کی پیشکش

”میں جانتی ہوں میں نے اپنے دل کے جذبوں کو سمجھنے میں بہت دیر کر دی ہے، آپ کی زندگی میں اب کچھ اور لوگ بھی ہیں جو شائد مجھ سے زیادہ محروم اور محترم ہوں گے آپ کے لیے۔ لیکن اگر میں آپ کو یہ سب کچھ نہ بتاتی تو عمر بھر یہ خلش مجھے بے چین کیے رکھتی۔“ وہ شائد فضہ کی بات کر رہی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کچھ کہوں یا بس اسی کو سنتا رہوں۔ میرے پاس کہنے کو کچھ باتی ہی کب تھا بھلا۔؟؟؟ گہنا نے اپنی بات جاری رکھی۔

”کتنی عجیب بات ہے کہ جس وقت میرا دل اپنے سارے اصول قاعدے اور معیار بھلا کر آپ کے حق میں میرے من کو استوار کر رہا تھا اور مجھے آپ کی محبت کے دلائل سے لا جواب کر رہا تھا، ٹھیک اسی وقت فضہ یہاں اس حوالی میں آپ کو وہ تمام قاعدے اور نظم و ضبط سیکھا رہی تھیں جو میرے آئیندیل کا تقاضہ تھے۔ انہوں نے آپ کو زندگی کا ڈسپلین سکھا کر کامیابی کی راہ پر گامزن کر دیا اور میرے دل نے میرے اندر کا ہر ڈسپلین اور قاعدہ توڑا۔ میں اس لا ابایلی۔ کھلنڈرے اور جھگڑا والوں کا انتظار کرتی رہی اور میرے سامنے ایک بدلا ہوا، سنجیدہ اور برد باد آیا۔ وہ آیا جس کی زندگی اب کسی اور کی محبت کی مقروظ تھی۔ فضہ نے پہلے روز ہی مجھے پر اپنے دل کی حالت کھول دی تھی، اور یہ بھی ان کی سادہ ولی اور صاف گوئی کی ایک مثال ہے۔ مجھے انہیں اپنے اندر کی بات بتانے کا وقت ہی نہیں دیا قدرت نے۔ شائد میں انہیں پہلے بتا دیتی تو وہ اتنی اعلیٰ ظرف ہیں کہ بھی مجھے اپنی محبت کا ذکر نہ کرتیں۔ لیکن مقدر نے انہیں یہ موقع پہلے دے کر اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا تھا، اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے سے زیادہ فضہ ہی آپ کی حق دار ہیں آیا۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ آپ نے انہیں میرے بارے میں سب بتا کر ہے اور اب بھی ان کی محبت کو سنبھالنے کی بھی نہیں بخشی۔ لیکن وہ تواب بھی بھی سمجھتی ہیں کہ میرا آئیندیل اور میری محبت کوئی اور ہے۔ آپ نہیں۔ اور اب میں یہ بات انہیں بتا کر ان کا حق بھی غصب نہیں کروں گی۔ شائد مجھے اس وقت آپ پر بھی اپنے دل کے یہ بھید ظاہر نہیں کرنے چاہیے تھے۔ لیکن میں مجبور تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ آپ تمام عمر اس خلش کے ساتھ گزار دیں کہ میں نے آپ کو کبھی ٹھکرا یا تھا۔“ میں گم سم کھڑا گہنا کی تمام بات سنتا رہا اور مجھے تو یہ بھی نہیں بولا گیا کہ ایک خلش ختم کر کے اس سے بڑی خلش دے جانا کہاں کا انصاف ہے۔؟؟؟ میں بس آپ سے اتنا ہی کہنا چاہتی۔“ گہنا کی بات ابھی ادھوری تھی کہ اچانک قدموں کی چاپ اور فضہ کے دھیرے سے کھنکارنے کی آواز سنائی دی۔ ”معافی چاہتی ہوں لیکن آپ دونوں

کی بات میں محل ہوتا ہی پڑا..... دراصل گھنا کی امی جان تین چار مرتبہ ان کا پوچھ چکی ہیں..... اور اب تو باقاعدہ شہمن کے ہاتھ پیغام بھی آچکا ہے ..... دیر بھی کافی ہو چکی ہے ..... لہذا یہ ملاقات آپ دونوں کو اب یہیں برخاست کرنی پڑے گی ..... ”باتی آئندہ“ کا بورڈ لگا کر ..... ”فضہ کی شفتگی نے ہمیں بھی مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ گھنا نے نظر اٹھا کر میری جانب دیکھا اور وہ دھیرے سے خدا حافظ کہہ کر پلٹ گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ اس کا آخری الوداع ہو۔ ایک لمحے میں میرا اول جیسے آخری بار دھڑک کر ساکت ہو گیا۔ نظر کیا تھی ..... ایک تیز دھار برچھی تھی جو گھنا کی آنکھ سے نکلی اور عین میرے دل میں پوسٹ ہو کر گزر گئی تھی۔

وہ دونوں کب کی واپس جا چکی تھیں اور میں اب تک وہیں اپنی جگہ جامد کھڑا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا ہر سفر آج یہاں آ کر ختم ہو گیا ہو۔ ایک بار پھر وہی زمانے بھر کا ڈاکو کہ جس کا نام دل جلوں نے عشق رکھ چھوڑا ہے۔ اس سیاہ رات کی تھانی میں میرے دل کا سارا جیلن و قرار لوٹ کر چلتا بنا تھا، اور میں پھر سے تھی دامن اور لالا پکا سا محبت کی پگڈنڈی پر کھڑا اس تاریکی میں اپنے مقدروں کو رو رہا تھا۔ ساری رات ٹھنڈی میں یوں باہر کھڑے رہنے نے صح تک اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا اور سورج نکلنے سے پہلے میں شدید تیز بخار میں پھٹک رہا تھا۔



## شکنجہ

**فکنجہ** ناول پاکستان میں ہونے والی تحریک کاری کے پیش منظر میں لکھا گیا ہے ہمارے ہاں گذشتہ کچھ سال سے ”ٹریک ڈپلومی“ کا غافلہ کچھ زیادہ ہی زور شور سے مچایا جا رہا ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ محبتوں کے جوزنگ آلو دروازے حکومتیں نہیں کھول سکیں وہ شاید عوام بلکہ عوام بھی نہیں دانشور خواتین و حضرات اپنی صاعی سے کھولنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

لیکن ..... اس ٹریک ڈپلومی کی آڑ میں کیا گھنا و ناکھیل رچایا جا رہا ہے بھارتی اٹیلی جنس ایجنسیاں ”بھولے بادشاہوں“ کو کس طرح اپنے جال میں پھانستی ہیں اور ان سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ یہی اس ناول کا موضوع ہے۔

ایک اور بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ پاکستان اپنے ہاں ہونے والے ہر واقعہ کی ذمہ داری ”را“ پڑاں دیتا ہے۔ یہ بات کس حد تک ہے؟ کس حد تک جھوٹ؟ شاید ان سوالات کے جواب بھی آپ کو اس ناول کے مطالعے سے مل جائیں۔ محبتوں کی آڑ میں منافقتوں کا وحنه کون چلا رہا ہے؟ دشمن کی سازش کیسے انجام پاتی ہے اور اس سازش کا شکار ہم انجانے میں کیسے بن جاتے ہیں میں نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ناول کتاب گھر کے **ایکشن ایڈو نیچر جاسوسی** سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

## باب 35

## کتاب گھر کی پیشکش

قدرت کی یہ کیسی ستم ظریفی تھی کہ بھی مجھے ایک محبت بھی میر نہیں تھی، اور میں زمانے بھر سے بے زار ہو کر یعقوب میشن کے جوگ میں پڑنے کے بعد خود کو بھی بھلا بیٹھا تھا اور آج جب مجھ سے محبت کی دعوے دار وہ دو گل رخ ناز نہیں تھیں کہ جو بذاتِ خود اپنے اندر محبت کی اک تمجیل اور عمر بھر کا جوگ لیے جانے کے قابل تھیں.....تب بھی میں اُسی قدر تھا تھا، شام کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ محبت بھی مکمل نہیں ہو پاتی۔ یہ ایک سدا کا ادھورا اور نامکمل جذبہ ہے جس کی تمجیل دنیاوی ملن کے بس کی بات نہیں۔

میری طبیعت کے پیش نظر زگا اور موکی کو اپنی واپسی بھی ایک آدھدن کے لیے موخر کرنی پڑی۔ صبح سے فضہ بیسوں مرتبہ شمن اور حولی کی دیگر خادماؤں کے ہاتھ پیغام بھیج کر میری طبیعت کے بارے میں پوچھ چکی تھی۔ گہنانے رات ٹھیک ہی کہا تھا کہ میری اس نئی زندگی کی بنیاد ڈالنے والی فضہ ہی تھی۔ میں آج اگر اس معاشرے میں محترم تھا تو یہ سکھ بھی مجھے فضہ کے ساتھ سے ہی ملی تھی۔ وہ میری ایسی محسن تھی جس نے میرے اندر کے آیاں کو یہ حوصلہ اور اعتماد بخشنا تھا کہ جس سے مجھے زندگی کی راہیں چلنے اور منزلیں سر کرنے کا ہمراہ تھا۔ تو میں اب منزل پر پہنچ جانے کے بعد اپنے رہبر کو، اپنے حضر کو کیسے بھول سکتا تھا؟

اور فضہ تو پہلے ہی مجھے تمام عمر انتظار کرنے کا عندیدے پے چکی تھی کہ میں جب بھی اپنی منزل پر پہنچ کر اسے پکاروں گا..... وہ میرے ہم قدم ہو گی۔ گہنا بھی یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ میں اپنی محسن کو اپنے انتظار کی سولی پر لٹکا کر خود نئی منزلیں سر کرنے کبھی نہیں نکلوں گا۔ اسی لیے اس نے خود مجھ سے دست بردار ہو کر یہ قربانی دینے کی مٹھان لی تھی۔ زندگی کے دورا ہوں سے بڑا معمد اس جہاں میں کوئی اور نہیں ہو سکتا، یہ ممٹے بنانے والے بھلا کیا معمد جوڑتے ہوں گے۔ کوئی جا کر انہیں سمجھائے۔

آخر سہ پہر تک فضہ سے صبر نہیں ہوا اور وہ خود میری طبیعت کا پوچھنے میرے کمرے میں چلی آئی ”یہ آپ کو اچانک کیا ہوا.....؟.....ابھی

کل رات تک تو آپ بھلے چلے چلے تھے.....“

”شام رات کو دیر تک باہر رہنے سے سردی لگ گئی ہے..... آپ پریشان نہ ہوں..... مجھ پر بدلتے موسم دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ جلد ٹھیک ہو جاؤں گا.....“ فضہ نے غور سے میری جانب دیکھا ”پھر کوئی موسم بدل گیا ہے کیا.....؟“ میں چونک گیا، لیکن اس کے چہرے پر وہی سدا کی ملاحظت بکھری ہوئی تھی..... میں نے دھیرے سے جواب دیا ”کچھ لوگوں کے مقدر کا موسم سدا ٹھہر ارتتا ہے اور کچھ مجھ جیسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کا نصیب ہر پل کروٹ بدلتا رہتا ہے..... آپ سے تو کچھ چھپا نہیں..... سب آپ کے سامنے ہی ہے.....“ فضہ کے چہرے پر بشاشت آگئی ”ہا..... آپ کا تمام سفر میرے سامنے ہے..... اور مجھے فخر ہے کہ میں بھی آپ کے اس سفر کے ایک چھوٹے سے پڑاؤ کی ہم سفر رہی ہوں.....“

”آپ ہم سفر نہیں..... میری رہبر ہیں..... اور سدار ہیں گی.....“ فضہ نے مان سے پوچھا.....

”آیاں..... آپ کو یاد ہے ناں..... آپ نے مجھ سے کچھ وعدہ کیا تھا۔ کچھ انعام دینے کا.....“

”جی مجھے یاد ہے..... اور آپ نے کہا تھا کہ وقت آنے پر آپ اپنا انعام خود مانگ لیں گی..... میں ابھی تک اس وقت کا انتظار کر رہا ہوں.....“

”تو بس پھر سمجھ لیں کہ وہ وقت آنے والا ہے آیاں..... اس بار آپ کو زمرد حوالی سے رخصت ہونے سے پہلے مجھے میرا انعام دے کر ہی جانا ہوگا.....“

میں نے فضہ کے چہرے پر ایک عجیب سا اطمینان دیکھا، جیسے اُسے وہ انعام مانگ کر ساری کائنات مل جائے گی..... میں نے دھیرے سے جواب دیا ”آپ مجھے کچھ وعدہ خلاف نہیں پائیں گی.....“ فضہ کھل گئی ”تو بس پھر طرفہ..... آپ اب تیار ہیں گا..... زیادہ وقت باقی نہیں رہا..... لیکن اُس سے پہلے مجھے کچھ اپنوں سے بات کرنی ہے.....“ فضہ مجھے ایک نئی پیلسی میں ڈال کر خود وہاں سے چل پڑی۔ شام کو وہ حتی طور پر مجھ کو مجھ سے مانگنے سے پہلے اپنے بزرگوں کو اعتماد میں لینا چاہتی تھی۔ خانم تو پہلے ہی اس کی دل آشنا تھیں۔

مغرب تک میری حالت کچھ سنبھل گئی۔ میں تازہ ہوا میں چہل قدمی کی نیت سے بڑے والان کی جانب نکل آیا، اور وہاں نواب صاحب، پاشا موی اور رنگا کو کرسیاں ڈالے بیٹھا دیکھ کر ان کی جانب چلا آیا۔ نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ رنگا اور موی کی آنکھیں کچھ نہ ہیں، اور وہ گم سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجھے دیکھ کر نواب صاحب نے جلدی سے کہا ”یہ یہیں..... اپنے آیاں میاں بھی آگئے..... ان کی رائے بھی لینا ضروری ہے.....“ میرا دل زور سے دھڑکا۔ نہ جانے میری آمد سے قبل وہاں کیا گفتگو چل رہی تھی۔ میں نے سوالیہ نظر وہ سے رنگا کی جانب دیکھا لیکن وہ رقت آمیز کیفیت میں بتلا تھا۔ آخر موی نے ہی یہ جان لیوا خاموشی توڑی ”شہزادے..... نواب صاحب نے ہم سے رشتہ جوڑنے کی بات کی ہے.....“

”کیا.....؟..... کیا مطلب.....؟“ موی کی آواز جذبات سے لبریز تھی ”وہ ہماری لاڈی کو اپنے چھوٹے بیٹے وقار کی دہن بناتا چاہتے ہیں..... اس حوالی کی بہو بناتا چاہتے ہیں.....“ اور پھر یہ سن کر میری اپنی حالت بھی سارنگا سے کچھ مختلف نہیں رہی..... اگلے ہی لمحے میں انھر کر اپنی آنکھیں چھپاتے اس مجبور باب کو اپنے سینے سے لگا چکا تھا جسے عمر بھر بس اسی خدشے اور فکر نے مارے رکھا کہ اُس کی بیٹی کو نہ جانے کوئی عزت دار گھر قبول کرے گا بھی یا وہ ساری عمر کسی اچھے رشتے کی آس میں اپنے گھر کی چوکھت پار نہیں کر پائے گی..... لیکن آج قدرت نے کتنا بڑا انعام اس بابل کی جھوپی میں ڈال دیا تھا۔ رنگا کو اب تک یقین نہیں آ رہا تھا لہذا میں نے ہی ناہید کے بھائی کی حیثیت سے نواب صاحب کو جواب دیا ”ہمارے لیے اس سے زیادہ خوش قسمتی کی بات کیا ہو گی نواب صاحب..... کہ ہماری ناہید آپ کی بہو بن کر اس حوالی میں اترے..... لیکن کیا آپ نے وقار سے اس کی مرضی معلوم کر لی ہے..... کہیں اُس کو کوئی.....“ نواب صاحب نے جلدی سے میری بات کاٹ دی ”نہیں نہیں..... حق تو یہ ہے کہ یہ خود وقار کی بھی مرضی ہے..... اس نے سب سے پہلے خانم سے اپنی پسند کا تذکرہ کیا تھا اور بھی خانم تو پہلے دن سے ہی ناہید کی گرویدہ ہیں..... بس اب آپ لوگ ہاں کر دیں تو ہم ملکنی کی رسم کی تیاری شروع کریں.....“ رنگا کی آواز بھی تک بھرائی ہوئی تھی ”ناہید اب آپ کی بیٹیا ہے نواب صاحب..... جو مناسب سمجھیں طے کر دیں.....“ موی اور رنگا نے فرد افراد اٹھ کر نواب صاحب کو گلے لگایا۔ پاشا صاحب بھی بہت خوش نظر آ رہے تھے، رنگا نے

میرے ہاتھ تھام لیے ”دیکھ لے ساجن..... یہ سب تیرے دم سے ہے..... اب تو ہی اپنی بہنا کو رخصت بھی کرے گا..... میں اور لاڈلی کا یہ چچا موئی تو بس ڈولی سجا سیں گے اُس کی..... رنگا تیرے آنے سے پہلے اتنا خوش قسمت کب تھا بھلا..... ؟.....“

اور پھر چند لمحوں میں ہی ناہید کے رشتے کی بات ساری حوالی میں پھیل گئی۔ میں نے اسے بلوا کر خصوصی طور پر اس کی مرضی معلوم کی لیکن اس کا جواب پڑا سادا تھا ”جو آپ کی اور بابا کی پسند..... وہی میرا مقدر ہو گا آیاں بھائی.....“

نواب صاحب نے دوروز بعد ہی ناہید اور وقار کی مہنگی اور اگلے روز ملنگی کی تقریب کا اعلان کر دیا۔ چاروں اطراف ایک ہل چلی جم گئی۔

رنگا اور موئی نے تمام یعقوب مینشن سمیت ہمارے قریباً پورے محلے کو بھی تقریب میں مدعو کر رکھا تھا۔ نواب صاحب کی طرف سے خصوصی دعوت نامہ امی، اباؤ، ریحان اور چھوٹی کے نام خود پاشا اور رنگا جا کر دے آئے تھے، محلے سے مشی بالا اور راجہ ایک دن پہلے ہی حوالی پہنچ گئے اور محلے کی شادیوں کی طرح وہ یہاں بھی خدائی خدمت گاروں کی طرح حوالی کی سجادوں اور دیگر انتظامات میں جث گئے۔

راجہ نے مجھے گم سم بیٹھا دیکھ کر چھیڑا.....

”کیوں انو..... کہے تو تیرے حصے کی لڑیاں بھی سجادوں..... نا ہے وہ تیرے شیخ صاحب کے گھروالے بھی اب یہیں رہتے ہیں.....“

بالے اور مشی نے بھی شرارت سے ایک دوسرے کو آنکھ ماری، اب میں انہیں کیا بتاتا کہ ان کے انو کے مقدار میں کس کی لڑیاں لکھی ہوئی تھیں، تقریب کی شام ساری زمر دھولی واقعی کسی انمول ٹکنیکی طرح جگہ کارہی تھی، اب اور امی کو رنگا نے خاص درخواست کر کے ناہید کی طرف سے اس کے بزرگ مقرر کر رکھا تھا۔ میں بہت دیر تک اس شور اور ہنگامے کو بیٹھا دیکھتا اور یہ سوچتا رہا کہ جب میں اپنے گھر سے نکلا تھا تب میرا خاندان صرف چار افراد پر مبنی تھا لیکن آج میرا گھرانہ کتنا پھیل چکا تھا۔ ملنگی کی تقریب میں میں نے ستارہ اور شیخانی جی کو بھی چھوٹی کے ساتھ مختلف کاموں میں مصروف دیکھا لیکن گہنا مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ میرا جی چاہا کہ پاس سے گزرتے شیخ صاحب سے اس کا پوچھوں لیکن میں چپ ہی رہا۔

شام کو گہنا بھی اس وقت میری طرح خود اپنے اندر لگے تمام آئینوں سے فرار چاہتی ہو گئی تھی وہ اس ہنگامے کا حصہ نہیں بن پائی تھی۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک فضہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا ”آپ یہاں تھا کیوں بیٹھے ہیں آیاں.....“ میں نے منجلنے کی کوشش کی ”کچھ نہیں بس شام کو کچھ تھکن ہو گئی ہے.....“ فضہ نے میری آنکھوں میں جھائکا ”آپ ابھی سے تھک گئے..... ابھی تو بڑا مباسفرا باقی ہے.....“ میں نے مسکرا کر فضہ کو دیکھا ”پھر تو مجھے تحریک دینے کے لیے میرے ہم سفر کو معمول سے کچھ زیادہ محنت کرنا ہو گی..... مجھے اپنے ساتھ ہم قدم رکھنے کے لیے ”فضہ کی آواز لرزی گئی ”اوہ اگر ہم سفر گہنا جیسی آپ کے دل کی حرم ہو تو..... پھر..... کیا پھر بھی آپ کے قدم نہیں اٹھ پائیں گے.....“

میں چونک کر کھڑا ہو گیا۔ ”گہنا.....؟؟ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں.....؟“ فضہ کی آنکھیں نہ ہونے لگی تھیں۔ ”ہاں آیاں..... گہنا..... وہی آپ کی اصل ہم سفر ہے..... میں تو بس ایک عارضی سرائے تھی جسے آپ کی کچھ دن کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ آپ کی آخری منزل کی ساتھی گہنا ہی ہے.....“

”کیا آپ سے گہنا نے کچھ کہا ہے.....؟.....“

”نہیں آیاں..... وہ آپ کی پسند ہے..... وہ جیتے جی کبھی مجھ سے اپنا غم نہیں بانٹے گی..... اس رات جب میں گھنا کو بلانے کے لیے آئی تھی تو میں نے آپ دونوں کی باتیں سن لی تھیں..... مجھے اس فیصلے پر چنپنے میں بڑی دشوار را ہوں سے گزرنا پڑا ہے آیاں..... میں آج آپ کو اپنی محبت سے آزاد کرتی ہوں..... محبت دو طرفہ نہ بھی ہوتا وہ دوسرے کو کسی نہ کسی ڈور میں باندھ رکھتی ہے..... میں آج یہ ڈور خود تو ڈری ہوں.....“

<http://kitaabghar.com>

”لیکن آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں..... میں نے گھنا سے کوئی اقرار نہیں باندھا،“

”جانتی ہوں میں..... اور یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ دونوں ہی اتنے اعلیٰ ظرف ہیں کہ ساری عمر اس ان بندھے پیان کو میری خاطر یونہی بے نام ہی رہنے دیں گے لیکن میں ایسا نہیں چاہتی۔ میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا آیاں۔ محبت میں کوئی احسان نہیں ہوتا، نہ ہی محبت میں کوئی ”وان“ ہوتا ہے۔ میں اور آپ اس دان اور احسان کے بوجھ کے بناء تمام عمر ایک دوسرے کے اچھہ دوست اور اچھی یاد بین کر بھی تو رہ سکتے ہیں، اور آپ کا ساتھ چاہے کسی بھی صورت میں ہو..... میرے لیے اعزاز ہوگا، محترم ہوگا.....“

میں اب بھی الجھا ہوا تھا کیونکہ فضہ کی بہتی آنکھیں اس کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ ”میں نے آغا جان کو منالیا ہے کہ وہ مجھے دوبارہ تہران یونیورسٹی میں واغلہ لینے کی اجازت دے دیں۔ دو دن کے بعد میں مومو کے ساتھ ایران چلی جاؤں گی آیاں..... لیکن جانے سے پہلے آپ کو حسب وعدہ میر انعام مجھے دینا ہوگا۔ یولین..... دیں گے نا.....؟“

خود میری آواز بھی ڈوٹی جارہی تھی ”آپ میری جان بھی انعام میں مانگ سکتی ہیں فضہ..... آپ کہہ کر تو دیکھیں.....“ فضہ نے اپنی ستارہ پلکوں کے موتی اپنی ہتھیلوں کے چاند میں جذب کرنے کی ناکام کوشش کی، ”آپ کی جان پر اختیار چاہیے مجھے.....“ میں نے ہتھیار ڈال دیے۔

”مجھے منظور ہے.....“ فضہ نے اپنی تمام ہمت مجتمع کی ”میں جانتی تھی آپ میرا مان ضرور کھیں گے..... میں چاہتی ہوں کہ آپ ابھی حوالی کے چھت سے جڑے بڑے چوبارے پر چلے جائیں..... گھنا وہاں آپ کا انتظار کر رہی ہے..... میں اسے بتا کر آئی ہوں کہ آپ وہاں اس سے ملنے کے لیے ضرور آئیں گے.....“

”لیکن آپ..... فضہ..... آپ یہ سب کیوں.....“ فضہ نے میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی ”آپ خود پر میرا اختیار مان چکے ہیں آیاں..... اور میں نے کہانا کہ محبت میں کوئی دان، کوئی احسان نہیں ہوتا..... میں جانتی ہوں کہ آپ اور گھنا ایک دوسرے کے بناء دھورے رہیں گے..... اور میں نہیں چاہتی کہ میرے دو عزیز ترین اور سب سے پیارے دوست یوں عمر بھرا دھوری زندگی جیں.....“ - میری چکچاہٹ ابھی باقی تھی ..... ”لیکن گھنا.....“ -

”میں اس سے بات کر چکی ہوں..... وہ تو آپ سے بھی کہیں زیادہ ضدی ہے لیکن میں نے اپنی دوستی کا واسطہ دے کر اسے بھی منالیا ہے..... وہ آپ کے بناء کبھی خوش نہیں رہ سکتی آیاں..... جائیں دیرینہ کریں..... اپنی گھنا کے بھرم میں اب کوئی دراز نہ آنے دیجئے گا..... میری دعا میں

سدا آپ دونوں کے ساتھ رہیں گی.....” فضہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے چھٹ کی جانب جاتی ہوئی راہ پر دھکیل دیا۔ میرا مجی چاہا کہ میں اس کے ہاتھ تھام کر اس سے پوچھوں کہ اتنی چھوٹی عمر میں اس نے اتنا بڑا تیاگ کہاں سے سیکھ لیا ہے؟، لیکن پھر مجھے اپنے سوال پر خود بُشی آگئی، بھلا محبت سے بڑا استاد اس جہاں میں اور کوئی کیا ہوگا؟ محبت از خود دنیا کا سب سے بڑا جوگ اور سب سے عظیم تیاگ ہے۔ عشق ہی انسان کو جوگی بنتا ہے۔

<http://kitaabghar.com>

میں وھڑکتے دل اور لرزتے قدموں کے ساتھ چوبارے پر پہنچا تو نیچے حولی کے دالان میں ہوتی آتش بازی کی پھل جھڑیاں دور فضا کی بلندی میں پھوٹنا شروع ہو چکی تھیں۔ گہنا کسی گہری سوچ میں گم چوبارے کی منڈیر کے پاس کھڑی تھی اور آسمان میں اپنی گلابی روشنی کے ستارے چھوڑتی آتش بازی کی خیا سے اس کا چہرہ بھی دمک رہا تھا۔ سفید آنجل کے نور تلے وہ گہنا کا گلابی چہرہ خود آسمان میں پھونٹنے کی شرارے کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ میں کچھ دیر مہوت سا کھڑا اُسے دیکھتا رہا.....

میرے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے اپنی جھکی پلکیں اٹھائیں.....” آپ آگئے آیاں..... بہت انتظار کروایا آپ نے مجھے.....” میں نے دھیرے سے جواب دیا ”بڑی لمبی مسافت طے کر کے یہاں تک پہنچا ہوں..... کسی کے ظرف کی سیڑھیاں طے کر کے کسی بلندی پر پہنچنا بہت مشکل ہوتا ہے.....”

” جانتی ہوں..... میں خود بھی یہاں آنے سے پہلے ایسی ہی کسی کیفیت سے دوچار تھی..... لیکن مجھے نہ جانے کیوں یہ یقین تھا کہ وہ آپ کو بھی منا کر یہاں بیچج دے گی..... تقدیر نے ہم تینوں کے ساتھ کیسا کھیل کھیلا ہے آیاں..... ہم تینوں کے دل میں وہ یہ جذبے کیوں جگا گئی؟..... اور اب مقدر خود دو ریٹھ کر ہمارا تماشہ دیکھ رہا ہوگا۔ یہ کیسا انصاف ہے؟۔“

” محبت کا خود اپنا ایک نظام عدل ہوتا ہے گہنا..... اور بد صحتی سے اس کا انصاف بہت کم خوش نصیبوں کو راس آتا ہے..... محبت کی تکون میں ایک کونا سدا ہی سزاوار ٹھہرتا ہے..... اور ہماری محبت کی تکون میں یہ سزا فضہ نے ہم دونوں کی خاطر خود اپنے لیے تجویز کی ہے..... حالانکہ اسے خود کے لیے جزاء چلنے کا اختیار بھی حاصل تھا، لیکن یہ اس کا ظرف ہے کہ اس نے ہم دونوں کو سزاوار نہیں ٹھہرایا..... اور ہمارے نصیب کی تکون سے اپنا زاویہ علیحدہ کر کے ہمیں ملا دیا.....“

گہنا نے نظر بھر کے مجھے دیکھا ”آپ اس ملن سے خوش تو ہیں نا آیاں.....؟“ - ”میری ہر خوشی اب آپ سے وابستہ ہے گہنا جی..... میرے دل کی حالت جانتے کے لیے اب آپ کو ہمیشہ خود اپنے اندر جھانکنا پڑے گا.....“ گہنا نے شرارت سے میری جانب دیکھا ”لیکن میرا دل تو کچھ اور کھدرا ہے.....“ میں چونک سا گیا ”کیا کہتا ہے آپ کا دل.....؟.....“

گہنا کے ہونتوں پر اس کی مخصوص مسکراہٹ ابھری ”جو دل کی باتیں جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں..... وہ سوال نہیں پوچھا کرتے..... لیں خود جھاٹک کر پڑھ لیا کرتے ہیں.....“ میں بھی مسکرا دیا ”ہاں..... شاہد دلوں کی تحریر پڑھنے کا فن بخولتا جا رہا ہوں..... بہت سے وعدے ہیں جو نبھانے ہیں..... اپنوں نے بہت سی امیدیں وابستہ کر لی ہیں اپنے اس نگتے اٹو سے.....“

”لیکن میں جانتی ہوں کہ آپ ان سب کی امیدوں پر ضرور پورا اتریں گے..... میں اس امتحان میں ہر قدم آپ کے ساتھ ہوں.....“

”تو پھر وعدہ کریں کہ جب تک میں اپنی منزل پر نہیں پہنچ جاتا..... آپ میرا انتظار کریں گی..... ابھی بہت سی آنکھوں کے آنسو چنتا باقی ہیں..... یہ تو سفر کا آغاز ہے..... مجھے اپنے علاقے کے لوگوں کے خواب تعمیر کرنا ہیں..... بولیں..... دیں گی میرا ساتھ.....؟“

”میں زندگی کی آخری سانس تک آپ کا انتظار کروں گی آیاں..... اور آخری دم تک آپ کا ساتھ دوں گی۔“

میں نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ” وعدہ.....“

گھننا نے پلکیں اٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکا اور پھر اپنا نازک ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا ” وعدہ.....“

ہم دونوں مسکرا دیے۔ آسان پر ایک ساتھ بہت سی مکھل جھٹریاں چھوٹیں اور فلک بھی گھننا کے پُر فور چہرے کی طرح گلنار ہو گیا۔



## 〈 ختم شد 〉

**کتاب گھر کی پیشکش**

## کرشن چندر کے بہترین افسانے

**کرشن چندر کے بہترین افسانے** مشہور افسانہ نگار کرشن چندر کے افسانوں پر مبنی ہے، اس کتاب میں ان کے افسانے، برے پھنسنے، زندہ نواز، نیوٹرل زون، نیپر پیچر، پرنس فیروز، تائی ایسری، جامن کا پیڑ، بھیا جی، ساجھے کا مردہ، ملکہ کی آمد، داتن والے، جولی کیساں، شنو، خوشی، بینگ بینگ فنگ، آؤ مر جائیں، نیکسی ڈرائیور، کچر ابaba، تہائی کا پھول، سپاہی۔ کرشن چندر نے ہمہی فلم اٹھ سڑی کے لئے بھی کام کیا جہاں انہیں فلم نگری کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اپنے انہیں مشاہدات کو بنیاد بنا کر انہوں نے اپنا مشہور ناول ”چاند کا گھاؤ“ لکھا جو کہ ہمہی فلم اٹھ سڑی کی ہی کہانی ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ کشمیر میں بھی گزارا اسلئے ان کے کچھ ناولوں کا پس منظر کشمیر کے زندگی پر مشتمل ہے۔

**کرشن چندر کے بہترین افسانے** کتاب گھر کے افسانے سیشن میں پڑھی جا سکتی ہے۔